اِسلامک بُک پبلشرز

ص ب: ۲۰۲۱۰، الکویت

اِسلام کا عام فہم تعارُف

(تعریف عام بدین اِلاسلام)

تصنیف

شیخ علی طنطاوی

ترجمہ

سیّد شبّیر احمد
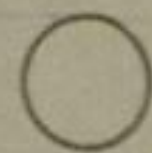
اسلامک بُک پبلشرز

ص ب: ۲۰۲۱۰، صفات

کویت

مصنف .... شیخ علی طنطاوی

مترجم .... سید شبیر احمد

ناشر .... اسلامک بک پبلشرز، کویت

طابع .... کرامت شیخ

مطبع .... تعمیر پرنٹنگ پریس، ۱۹- فیروز پور روڈ، لاہور

ایڈیشن .... دوم

تعداد .... گیارہ سو

قیمت .... ۲۷ روپے

کتابت .... حافظ محمد امین

جون ۱۹۸۰

سٹاکسٹ:

اسلامک پبلیکیشنز ۱۳- ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

فہرست
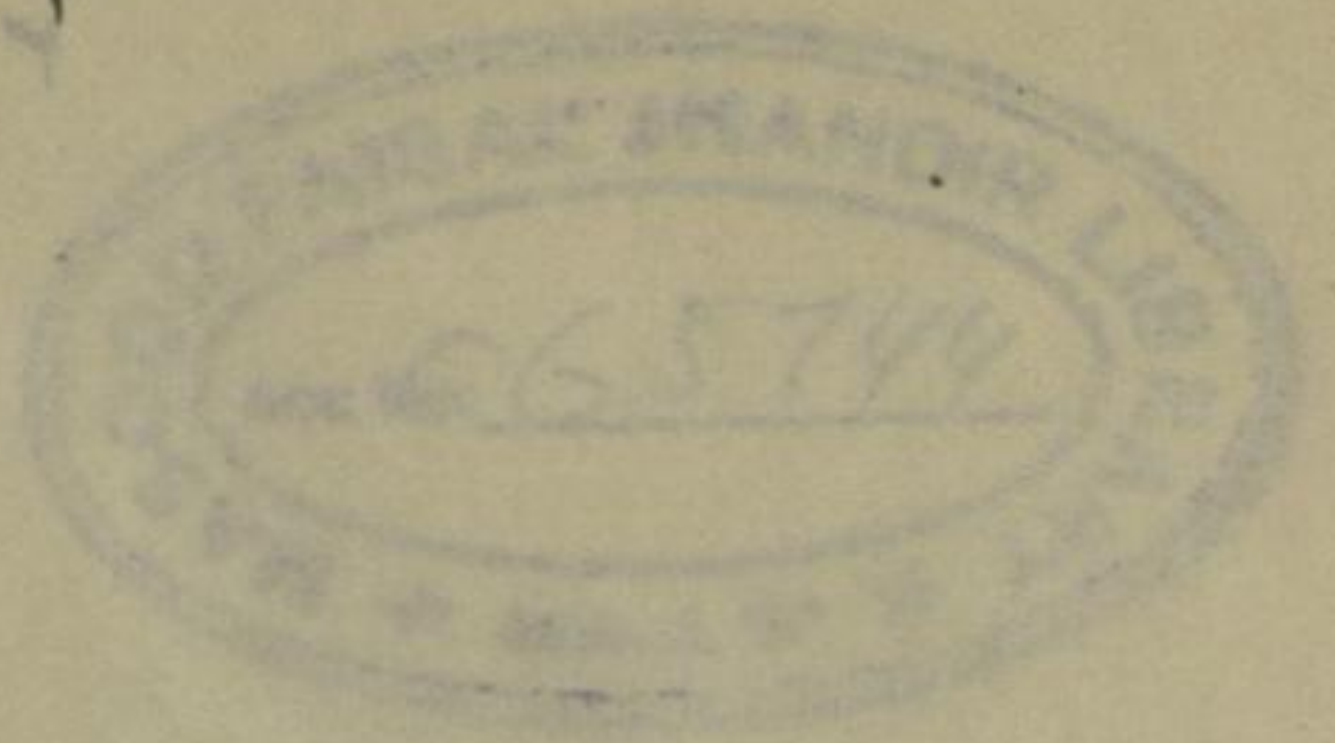
عرضِ ناشر

شیخ علی طنطاوی کی مشہور تصنیف 'تعریف عام بدینِ الاسلام' کا یہ اُردو ترجمہ اس جذبے اور یقین کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کا مُطالعہ دورِ حاضر کے نوجوانوں کے لیے جو اسلامی تعلیمات سے نہ صرف بے بہرہ ہیں بلکہ مختلف عوامل کے زیرِ اثر کسی حد تک اسلام سے بے نیاز اور بے زار بھی ہوتے جا رہے ہیں، فکر و شعور کی نئی راہیں کھول دے گا۔ علاوہ ازیں مغرب کی لادینی معاشرت، سوشلزم اور کمیونزم کے زہریلے اوہام و شکوک نے اِس وقت نسلِ انسانی کو بے یقینی کے جس کرب میں مُبتلا کر دیا ہے یہ کتاب اِس سے مقابلہ اور دفاع کی صلاحیت پیدا کرے گی۔

ادارہ ایک مدت سے دُنیائے اسلام کے عالی مقام مفکرین کی کتب اور ان کے تراجم شائع کر رہا ہے۔ شیخ علی طنطاوی کی تصانیف میں سے یہ پہلی کتاب ہے جس کا تعارُف اُردو دان حلقے سے کرایا جا رہا ہے۔ امید ہے یہ کتاب قارئین کرام پسند فرمائیں گے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کے باقی دونوں حصّے بھی اُردو زبان میں منتقل کر دیے جائیں۔ کتاب کے ترجمہ، طباعت و اشاعت میں جن حضرات نے خلوص و شوق سے محنت کی ہے ہم ان سب کے ممنون و مشکور ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور خلوصِ دل سے دست بدُعا ہیں کہ وہ مُصنّف، مترجم اور سب مُعاونین کو ان کی سعیٔ مشکور کا دُنیا و آخرت میں اجرِ جزیل اور ثوابِ جمیل عطا فرمائے۔ قارئینِ کرام سے درخواست ہے کہ وہ بھی دُعاؤں میں ہمارے ہمنوا ہوں۔

کرامت شیخ
مینجنگ ڈائریکٹر اسلامک بُک پبلشرز

گزارشاتِ مُترجم

"اِسلام کا عام فہم تعارُف" شیخ علی طنطاوی کی مشہُور تصنیف "تعریفِ عام بدین الاسلام"۔ کا اردو ترجمہ ہے۔ جناب علی طنطاوی دُنیائے اِسلام، خصُوصاً مشرقِ وسطیٰ کی بہت معروف و مقبول شخصیت ہیں۔ میری شدید خواہش تھی کہ ترجمہ کے ساتھ شیخ موصوف کا مکمل تعارف بھی قارئین کے سامنے پیش کیا جائے، لیکن کوشش کے باوجود موصُوف کے حالاتِ زندگی بروقت نہ پہنچ سکے۔ اشاعتِ کتاب میں تاخیر سے بچنے کی خاطر یہ طے کیا گیا کہ مصنّف کا تعارف آیندہ ایڈیشن یا کسی دُوسری تصنیف کے ترجمہ میں شامل کر دیا جائے گا۔ اس وقت کتاب کے مُتعلق چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

"تعریفِ عام بدین الاسلام" کوئی عام یا رسمی انداز کی تصنیف نہیں ہے۔ یہ ایک بُلند پایہ عالم، کُہنہ مشق ادیب اور ایک محقق دانشور کی تمناؤں و خوابوں کی تعبیر اور دعاؤں کا نتیجہ ہے اور بلاشبہ ایک تخلیقی کارنامہ ہے۔

مُصنّف نے اپنے طویل تعلیمی اور صحافتی تجربے میں نیز تبلیغی جدّوجہد کے دوران اِنتہائی شدّت کے ساتھ یہ بات محسُوس کی کہ موجودہ دور میں مسلم نوجوانوں کی بے راہ روی اور غیر مسلموں کی اسلام سے بے اعتنائی کا باعث محض یہ نہیں ہے کہ یہ سب اس دینِ رحمت کی خوبیوں سے بے خبر ہیں اور نہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہماری موجودہ زبوں حالی کی وجہ سے اسلام کی اصل تصویر ہی مسخ ہو گئی ہے۔ بلکہ ان کے علاوہ ایک اور بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس دینِ فطرت کی سادگی اور حُسن کو ضخیم ضخیم کتابوں کے انبار میں دبا دیا گیا ہے کہ وہاں سے اس کو نکالنا جُوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مزید برآں ہم نے جدید علوم اور سائنس سے بے نیاز رہتے ہوئے اس کے رُخِ روشن کو منقولات اور قدیم فلسفہ و کلام کے دبیز پردوں میں اس طرح چھپا دیا ہے کہ ایک عام آدمی کے لیے اس کی اصل شکل و صُورت دیکھنا مُشکل ہو گیا ہے۔

فاضل مُصنّف نے اس کا حل یہ تلاش کیا کہ ایک ایسی کتاب ہونی چاہیے جس میں موجُودہ دَور کے تقاضوں کو ملحُوظ رکھتے ہوئے آسان اور سادہ زبان میں مکمل اِسلام پیش کیا جائے تاکہ ایک عام آدمی صرف ایک ہی کتاب پڑھ کر کم از کم وقت میں اِسلام کے بُنیادی امور اور ضروریاتِ دین سے واقف ہو سکے اور اِسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔

ابتدا میں شیخ موصوف نے اس مقصد کے لیے علمائے وقت کو اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اخبارات و رسائل میں مقالات لکھ کر تحریک پیدا کی لیکن کسی طرف سے مثبت جواب نہیں ملا۔

بالآخر خود ہی کمر ہمت باندھی، اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کی اور پورے ذوق وشوق کے ساتھ کتاب کی تصنیف میں مشغول ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے یہ کتاب مرتب ہو گئی۔

کتاب حقیقتاً کیسی ہے؟ اس کی افادیت کتنی ہے؟ اور کیا واقعی یہ کوئی تخلیقی تصنیف ہے؟ ان سوالات کا جواب تو کتاب پڑھنے ہی سے ملے گا۔ تبصرے کسی نوع کے ہوں، مطالعۂ کتاب کا بدل نہیں ہو سکتے۔ بنابریں میں طویل عبارت آرائی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کی اہم خصوصیات کے ضمن میں صرف چند باتیں عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

مصنف نے دین اسلام کے بارے میں عام اندازِ گفتگو سے ہٹ کر موجودہ دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر مسئلے کو عقل و درایت اور شعور و حکمت کے توسط سے پیش کیا ہے اور جدید سائنسی انکشافات کے ذریعے دینِ فطرت کو برحق ثابت کیا ہے۔

خاص طور پر مصنفِ موصوف نے عقاید کے جو آٹھ قواعد وضع فرمائے ہیں، وہ ایک اچھوتی چیز ہے۔ ان میں انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بالکل نئے انداز میں جدید ذہن کو یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ کا عقیدہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اخروی زندگی پر ایمان لائے بغیر نہ تو انسان، انسان بن سکتا ہے اور نہ اس کائناتِ ارضی کا نظام توازن برقرار رہ سکتا ہے ـــــ اور یہی وہ بنیادی شے ہے جو اگر انسان کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو جائے تو صراطِ مستقیم پر چلنا اور زندگی کی تاریک راہوں میں اپنی منزل کو پالینا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

دوسری خصوصیت اس تصنیف کی یہ ہے کہ ہر بات قرآن و حدیث کے حوالے اور دلیل و ثبوت سے اس انداز میں ثابت کی گئی ہے کہ توہم اور جہالت کی تاریکیاں جو اکثر سُنی سنائی باتوں کے زیر اثر اور عدم غور و فکر کے باعث ذہن کے دُور دراز گوشوں میں جاگزیں ہو جاتی ہیں، قرآن و حدیث کے دلائل و براہین کی روشنی سے یکسر چھٹ جاتی ہیں اور انسان اپنے شعور و بصیرت سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ویسے تو پوری کتاب ہی اپنا ایک خاص انداز رکھتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے لیکن خاص طور پر ایمان بالرسل کا وہ باب، جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہے اور ایمان بالکتب کا وہ حصّہ جو قرآنِ مجید سے متعلق ہے، یقیناً اہلِ ذوق و نظر سے خراجِ تحسین وصول کرے گا۔

فاضل مصنف کے مطابق کتاب کے تین حصّے ہیں : زیرِ نظر پہلا حصّہ "ایمان و عقاید" کے بیان پر مشتمل ہے، دوسرے حصّے میں "اسلام" یعنی عبادات و دیگر امور کے بارے میں ضروری مسائل بتائے گئے ہیں اور تیسرے حصے میں "احسان" یعنی مشہور حدیثِ جبرائیلؑ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ الخ کی روشنی میں مسلمان کی پوری زندگی کی تعبیر و تفسیر پیش کی گئی ہے۔ باقی دونوں حصے ابھی میری نظر سے نہیں گزرے اس لیے ان پر تبصرہ ممکن نہیں۔ البتہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر یہ دونوں حصّے بھی اسی طرز و انداز کے ہوئے تو یہ مقصد کہ "صرف ایک ہی کتاب کے مطالعہ سے ایک عام آدمی کو اسلام کے بارے میں مکمل بنیادی اور ضروری معلومات حاصل ہو جائیں" یقیناً پورا ہو جائے گا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی بے محل نہ ہوگا کہ میں نے کتاب اور فاضل مصنّف کا مفہوم و مقصد اردو زبان میں منتقل کرنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے، لیکن اپنی بے بضاعتی اور ناپختہ کاری سے واقف ہونے کی بنا پر مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر آپ کو کتاب میں کوئی حسن و خوبی اور ندرت نظر آئے تو اسے فاضل مُصنّف سے منسوب کیجیے، لیکن اگر کہیں کوئی غلطی، خامی یا سقم نظر آئے تو اسے اس ہیچمداں کی طرف منسوب کیجیے اور ازراہِ کرم مقاماتِ سہو و خطا کی نشاندہی کے عِلاوہ اپنے مُفید مشوروں سے بھی نواز کر اس فقیر کو ممنون فرمائیے تاکہ آئندہ اشاعت میں ان سے استفادہ کیا جاسکے۔

آخر میں میں اپنے ان مُعاونین کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں جن کے پُرخلوص تعاون اور خصوصی توجہ سے میں اس قابل ہو سکا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی دلی تمنا کو عملی شکل دے سکوں۔

سب سے پہلے میں اپنے شفیق مکرّم جناب سیّد احمد الحسنی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہی کتاب مطالعہ کے لیے مجھے عطا فرمائی اور انھی کی حوصلہ افزائی اور جُرأت آموزی سے میں اس کا ترجمہ کرنے پر قادر ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر قدم پر سیّد محترم کی رہنمائی میرے لیے مشعلِ راہ رہی۔

اس کے بعد میں اپنے صدیقِ قدیم جناب خان عزیز الرحمٰن خاں کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مسودہ اور اصل کتاب کی تطبیق اور ترجمہ کی تصحیح و تنقیح میں میرے ساتھ اپنا قیمتی وقت اور مخلصانہ تعاون پیش کر کے میرے اعتمادِ خلوص و صداقت میں اِضافہ کیا۔

اِن دو دوستوں کے عِلاوہ مخلصین کی صفِ اوّل میں بہت بُلند مقام مکرمی جناب کرامت شیخ کا ہے جنھوں نے صرف یہ معلوم ہونے پر کہ میں شیخ علی طنطاوی کی کتاب کا اردو ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، کتاب کی اشاعت کا فوری فیصلہ کر کے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اِطمینان سے اس پر کام کر سکوں۔

ان محترمین کے لیے اعترافِ امتنان اور اظہارِ تشکر کے بعد میں اپنے عزیز بیٹے فلائٹ لیفٹینٹ سیّد محمّد عارف، اپنی بیٹی سیّدہ عطیہ اور برادرزادی سیّدہ صفیہ خالد ظہیر کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ ان سب نے مسودہ کی تصحیف و تسوید اور تطبیق و اصلاح میں میرے ساتھ شب و روز کام کر کے میری مدد کی۔

علاوہ ازیں مکرمی جناب حافظ محمّد امین خوش نویس (نوائے وقت) اور جناب عبدالحفیظ احمد بھی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ اوّل الذکر نے کتاب کی کتابت میں مثالی خلوص و محبّت کا ثبوت دیا ـــــ اور اگر جنابِ حفیظ احمد کی مدد مجھے میسّر نہ آتی تو طباعت کا اہتمام اور اشاعت کے مراحل سے عہدہ برآ ہونا مُشکل ہوتا!

اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو حسبِ خلوصِ نیّت اور بقدر حُسنِ عمل اجر و جزا عطا فرمائے کہ

هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ اور وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ قارئین سے بھی درخواست ہے کہ مصنف، مترجم اور تمام معاونین کے لیے بارگاہِ ربّ العزّت میں دُنیا و آخرت کے اجر و جزا کے لیے دُعا فرمائیں۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار

سیّد شبّیر احمد

۳۸۔ گلفشاں کالونی، ملتان روڈ ـــــ لاہور

جون ۱۹۷۹ء

یہ کتاب علماء اور فقہاء کے لیے نہیں
بلکہ اُن مسلمانوں کے لیے ہے جنھوں نے
اسلامی علوم کا مُطالعہ نہیں کیا۔ نیز اُن
لوگوں کے لیے ہے جو اسلام کو سمجھنا
چاہتے ہوں۔

تالیفِ کتاب کی کہانی

جن تمنّاؤں کے پُورا ہونے کی توفیق میں نے اللہ تعالےٰ
سے طلب کی تھی ان میں ایک ایسی کتاب لکھ سکنے کی دُعا بھی
شامل تھی جو مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی سُرخ رُو رکھے اور اگر کوئی
مسلمان نوجوان جس نے علُوم دینیہ کا مُطالعہ نہیں کیا یا کوئی غیر مُسلم جو
اسلام کو سمجھنا چاہتا ہو اسے پڑھے تو اس کتاب کے بعد اسے کسی
اور کتاب کی ضرورت نہ رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نعریف اللہ کی جس پر بھروسہ ہے اور جس سے مدد کی اُمید ہے

مجھے لکھتے ہُوئے چالیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں. میں نے مصر کے مجلّہ "الزہراء" میں ۱۹۲۸ء میں اس وقت لکھا جب یہ پہلا ادبی پرچہ تھا اور "الرسالہ" میں اس کے اجراء سے بند ہونے تک لکھتا رہا. پھر "المسلمون" میں مدّتوں لکھا. ان کے علاوہ اور بہت سے جرائد و رسائل میں (مجھے ندامت ہے کہ اس وقت مجھے ان کے نام بھی یاد نہیں) لکھتا رہا ہوں.

میں نے ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ اخبار و رسائل میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۴۹ء تک روزانہ لکھتا رہا۔ نیز دوسری جنگِ عظیم سے پہلے جب سے "یافہ" میں شرق الاردن کا ریڈیو سٹیشن قائم ہُوا ہے۔ آج تک اس سٹیشن سے عربی نشریات میں حصّہ لے رہا ہُوں.

میری تیس کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دس سے زیادہ اشاعت کے لیے تیار ہیں. لیکن میری کیفیت یہ ہے کہ میں بخوشی اس بات کے لیے تیار ہوں کہ میرا یہ تمام علمی اور ادبی سرمایہ تلف ہو جائے اور اس کے بدلے اللہ تعالےٰ مجھے صرف دو کتابیں مکمّل کرنے کی توفیق عطا فرما دے جنھیں میں اپنے بعد پڑھنے والوں کے لیے چھوڑ جاؤں.

ایک ایسی کتاب جس میں حکومتوں کی تبدیلیوں یا انقلاباتِ زمانہ سے متعلق اپنے بہترین مشاہدات پیش کر سکوں اور جن ملکوں میں گیا ہوں یا جن شخصیتوں سے

ملا ہوں اُن کے بارے میں اپنے بہترین تاثرات بیان کر دُوں تاکہ یہ میری یادداشتوں کا مجموعہ اور زندگی کا روزنامچہ بن جائے۔

دُوسری اس سے بھی بہتر ایک ایسی کتاب جو مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی سُرخ رُو رکھے اور اگر ایک مسلمان نوجوان جس نے علوم دینیہ کا مطالعہ نہیں کیا یا ایک غیر مُسلم جو اسلام کو سمجھنا چاہتا ہو اسے پڑھ لے تو وہ اس کے لیے کافی ہو اور اسے کسی دُوسری کتاب کی ضرورت نہ رہے۔ یہ کتاب "تعریف عام بدین الاسلام" (اسلام کا عام فہم تعارف) ہے۔

مجھے اِس کتاب کی ضرورت کا احساس اس وقت ہُوا جب میں ۱۹۳۶ء میں عراق میں پڑھایا کرتا تھا۔ ان دنوں جب میں اسلام کے فضائل بیان کرتا تو طلباء اس میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ یہ طلباء اکثر مجھ سے کسی ایسی کتاب کے متعلق پُوچھتے جس سے وہ اِسلام کو بخُوبی سمجھ سکیں۔ مَیں سوچتا اور تلاش کرتا لیکن کوئی ایسی جامع کتاب جو ان کا مقصد پُورا کر سکے نظر نہ آتی۔ البتہ فقہ کے فروع و اصول پر حدیث کی اصطلاحات اور روایات پر توحید اور تفسیر کے موضوع پر بہت سی کتابیں موجود تھیں جن کو پڑھ کر ختم کرنے سے پہلے انسانی عمر ختم ہو جائے۔ پھر ان کا اندازِ نگارش ایسا تھا کہ ایک طالب علم اوّل تو انھیں پڑھ ہی نہ سکے اور اگر پڑھنے پر قادر ہو جائے تو سمجھ نہ سکے۔ یا اگر سمجھ بھی لے تو اس کے مختلف شعبے اور فروعات اصلِ موضوع کا احاطہ کرنے میں حائل ہو جائیں۔

اس زمانے میں میری توجّہ علومِ دین کے مقابلہ میں ادب کی طرف زیادہ تھی۔ اس لیے میں خود ایسی کتاب نہ لکھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ۱۹۳۹ء میں الرسالہ میں چند مقالات لکھے جس میں علماء کو اس مقصد کے لیے کتاب لکھنے کی دعوت دی۔ مَیں نے انھیں یاد دلایا کہ قرنِ اوّل میں ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر

ہو کر ایک آدھ دن آپ کے پاس قیام کرتا تھا اور اسی قلیل مدّت میں وہ اسلام اور اس کے بنیادی اُمور کو سمجھ لیا کرتا تھا اور اپنے قبیلے میں اسلام کا داعی اور مبلّغ بن کر واپس جاتا تھا۔ اگر اس زمانے میں ایسا ممکن تھا تو آج ہم ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو صرف ایک کتاب کے ذریعے اسلام کی حقیقت کیوں نہیں سمجھا سکتے۔

وقت گزرتا رہا اور اس اثناء میں مَیں نے اسلام کے بارے میں متعدد مُفید اور بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالیں لیکن یہ کتاب نہ لکھی جا سکی۔ یہاں تک کہ گزشتہ سال برادرِ محترم جناب "شیخ مصطفےٰ عطار" نے میری کتاب "فصول اسلامیہ" میں میرے وہ مقالات پڑھے جو میں نے "الرسالہ" میں لکھے تھے۔ اور انھوں نے عالی جناب "شیخ حسن بن عبداللہ" آل الشیخ وزیرِ تعلیم کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ مجھے اس موسمِ گرما میں مملکتِ سعودیہ میں روک لیا جائے تاکہ یہ کتاب لکھ سکوں۔ آنجناب نے یہ تجویز منظور فرما کر نائب الوزارۃ جنابِ محترم پروفیسر "عبدالوہاب عبدالواسع" کو بھیج دی جن کی حوصلہ افزائی سے میں اس کتاب کی ترتیب و تالیف پر آمادہ ہو گیا۔ اور مکہ مکرمہ میں رُک کر کام شروع کر دیا۔ میں نے پُورا موسمِ گرما اور اس سے اگلا تعلیمی سال اس کام میں صرف کیا۔ لیکن پُورا عرصہ مَیں کچھ سُستی اور کاہلی کا شکار رہا۔ اس اثناء میں میرے پاس تین بڑے بڑے فائل تیار ہو گئے۔ جن میں مختلف موضوعات پر تفصیلات تھیں، کہانیاں تھیں اور مذاکرات تھے لیکن یہ سب کچھ منتشر حالت میں تھا۔ اور اچھی خاصی محنت اور ترتیب و تہذیب کا محتاج تھا۔ پھر نیا موسمِ گرما شروع ہو گیا اور مجھے عمّان جانا پڑا۔ اور احتیاط کے خیال سے مَیں ان فائیلوں کو اپنے ہاتھوں میں ہی لیے رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت میں عمّان ایئرپورٹ سے اپنی بیٹی کے گھر جانے کے لیے کار میں سوار ہُوا یہ فائیلیں میرے پاس موجود تھیں۔

وہاں پہنچ کر سفر کی تھکان، خوش آمدید کے ہنگاموں اور دوست احباب اور اعزہ

سے ملنے ملانے میں کچھ اس طرح مصروف رہا کہ ان کاغذات کا خیال دو ہفتے سے پہلے نہ آسکا۔ اور اب جو انھیں تلاش کرتا ہوں تو وہ غائب۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ہر ٹیکسی ڈرائیور سے دریافت کیا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی لیکن کچھ نہ ملا۔ کچھ دن تو میں کھویا کھویا سا رہا۔ نہ کھانے میں مزہ آتا اور نہ پوری طرح نیند۔ کچھ عرصہ کے بعد جب ذرا طبیعت سنبھلی اور مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اب از سرِ نو لکھوں گا۔

میرا قیام عمّان میں ایک ویران علاقے میں تھا۔ میرا کُتب خانہ دمشق میں اور کاغذات مکہ مکرّمہ میں رہ گئے تھے۔ اس وقت میرے پاس قرآن مجید کے سوا اور کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ مَیں نے سوچا کہ ممکن ہے اسی میں کوئی بہتری ہو۔ میں یہ کتاب علماء اور فقہاء کے لیے تو نہیں لکھ رہا بلکہ اس کا مقصد نوجوانوں کو اسلام سے متعارف کرانا ہے۔ اس لیے اس میں حوالہ جات جتنے کم ہوں اور جس قدر ندرتِ فکر ہو نوجوان ذہن کے لیے مُفید ہو گی۔

میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق و اعانت طلب کی۔ اپنے ذہن کو مُرتکز کیا اور صرف قرآن مجید کو پیشِ نظر رکھ کر اس حصے کو جو عقائد کے بیان پر مشتمل ہے۔ بحمد اللہ صرف دس دن میں مکمل کر لیا۔

جب برادرم "اسحاق فرحان" ناظمِ محکمہ نصاب عمّان کو میری اس کتاب کی اطلاع ملی تو انھوں نے عالی جناب پروفیسر "بشیر صباغ" وزیرِ تعلیم و تربیت کو مشورہ دیا کہ وہ اس کتاب کو طبع کروا کر اُستادوں اور اُستانیوں پر اس کا پڑھنا لازمی قرار دے دیں۔

انسانوں کا شکریہ ادا کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کے مترادف ہے۔ ویسے بھی ہر حق دار کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ چنانچہ میں ان تمام محسنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نیز اپنے پُرانے دوست پروفیسر "محمد سلیم رشدان" کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی ترتیب و تکمیل میں میرا ہاتھ بٹا کر مجھے نوازا۔ بارگاہِ ایزدی میں

دست بدُعا ہوں کہ وہ ان سب حضرات کو ان کے حُسنِ عمل کی بہترین جزا عطا فرمائے اور مجھے اس کتاب کے باقی حصّے مکمل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ تاکہ تین حصّوں میں مکمل ہو کر یہ کتاب اسلام کی عام فہم توضیح وتشریح اور تعارف کا مقصد پُورا کر سکے۔ اور علمِ نافع بن کر میرا توشۂ آخرت ثابت ہو۔ اور میرے بعد میرے لیے خیر جاری اور عملِ باقی کی حیثیت اختیار کر لے۔

میں اس کتاب کے ہر پڑھنے والے سے درخواست کرتا ہوں کہ اس میں اگر کوئی غلطی یا خامی محسوس کریں تو مجھے اس سے مطلع کر کے ممنون فرمائیں تاکہ اس غلطی یا کمی کو دُور کیا جا سکے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن

مکہ مکرّمہ ۱۳۸۸ھ ۱۹۶۸ء

علی طنطاوی

یہ چند خیالات ہیں
جو میں اصل کتاب سے پہلے پیش
کر رہا ہوں اور ان کے ذریعہ میں
نے پڑھنے والے کے لیے ایک ایسی
فضا مہیا کر دی ہے جو اس کتاب
کے سمجھنے میں مدد دے گی اور اس
کتاب کے مطالب پر غور و فکر کی
دعوت ۔

مُطالعۂ کتاب سے پہلے

اسلام مسلمان سے یہ تقاضا نہیں کرتا کہ وہ یکبارگی دُنیا چھوڑ دے اور نہ یہ کہ مسجد میں جا بیٹھے اور پھر وہاں سے نہ نکلے ۔ نہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کسی غار میں جا کر پناہ گزین ہو جائے اور پُوری زندگی وہیں گزار دے ...... ہرگز نہیں ۔

بلکہ مسلمانوں سے اسلام کا مُطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنی بہترین تہذیب و تمدّن کے ذریعہ مُہذّب اقوامِ عالم پر سبقت لے جائیں ۔ مال و دولت کے اعتبار سے دُنیا میں سب سے زیادہ دولت مند اور علم و حکمت کے لحاظ سے تمام علُوم میں سب سے بڑے عالم ہوں ۔

آپ کون سا راستہ اختیار کرینگے؟

آپ تنہا سفر کر رہے ہیں چلتے چلتے آپ کے سامنے ایک دوراہا آجاتا ہے۔ ایک راستہ سخت دشوار گزار عموداً پہاڑ کی بلندی کی طرف جا رہا ہے اور دُوسرا نشیبی۔ آسانی سے طے ہو جانے والا پہلا جو دشوار گزار ہے اس میں ہر طرف پتھر اور کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر گڑھے ہیں جن کی وجہ سے اُوپر چڑھنا بھی مشکل ہے اور راہ طے کرنا بھی دُشوار۔ لیکن اس پر حکومت کی طرف سے ایک کتبہ نصب ہے جس پر لکھا ہُوا ہے کہ یہ راستہ اگرچہ دُشوار گزار ہے۔ اور اس پر چلنا تکلیف دہ ہے لیکن یہی درُست راستہ ہے جو بڑے شہر کو جاتا اور منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔

دُوسرا راستہ ایک ہموار گزر گاہ ہے جس پر پھلدار درخت اور شگوفے سایہ فگن ہیں۔ دونوں جانب ہر قسم کی تفریحات جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش ہیں۔ جن کی وجہ سے دل کھنچا چلا جا رہا ہے۔ لیکن راستے کے سرے پر ایک انتباہ آویزاں ہے۔ کہ یہ راستہ انتہائی خطرناک اور مُہلک ہے اور اس کے آخر میں ایک ایسا نشیب ہے جس میں یقینی موت آپ کی منتظر ہے۔ ایسی صُورت میں آپ کون سا راستہ انتخاب کریں گے۔

بے شک انسانی طبیعت دُشوار کے مقابلے میں آسان راہ کی طرف مائل ہوتی ہے اور مشقّت و تکلیف کی بجائے سہولت اور آرام کو پسند کرتی ہے نفسِ انسانی

قید و بند کے مقابلے میں آزادی کا دلدادہ ہے اور یہی وہ انسانی فطرت ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس لیے اگر انسان کو اس کی خواہشاتِ نفس کے مطابق آزاد چھوڑ دیا جائے اور وہ ان کے پیچھے لگ جائے تو ظاہر ہے' دوسرا راستہ اختیار کرے گا۔ لیکن ایسے تمام مواقع پر عقل آڑے آجاتی ہے۔ اور یہ موازنہ کرتی ہے کہ وقتی اور فوری لذت و راحت جس کا انجام طویل رنج و غم اور تکلیف ہو اچھی ہے یا وہ عارضی اور وقتی تکلیف و مشقت جس کے بعد نہ ختم ہونے والی راحت اور لذت ہو بہتر ہے۔ اور بالآخر پہلا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

یہی مثال جنت یا دوزخ کی طرف جانے والے راستوں کی ہے۔ دوزخ کے راستے میں ہر وہ چیز موجود ہے جو لذیذ اور مرغوب ہے۔ انسانی طبیعت ان کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اور خواہشات نفسانی انسان کو ان کی طرف دھکیلتی ہیں۔ اس راہ میں حسن و جمال اور اس کی فتنہ آفرینیاں ہیں۔ شہوانی خواہشات کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور فوری لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس راستے میں ہر طریقے سے مال حاصل کرنے کا جواز ہے۔ اور مال و دولت ایسی چیز ہے جو ہر شخص کو مرغوب و مطلوب ہے۔ اس میں ہر قسم کی آزادی اور آوارگی کی سہولت ہے اور کون ہے جو آزادی کو پسند نہیں کرتا۔ اور پابندیوں سے بیزار نہیں۔

اس کے برعکس جنت کے راستے میں ہر طرح کی مشقت اور دقّت ہے' پابندیاں اور رکاوٹیں ہیں۔ نفس سے جنگ کرنا اور خواہشات سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اس وقتی مشقت کا صلہ جو اس راہ میں برداشت کرنا پڑتی ہے۔ آخرت میں دائمی لذت اور ابدی راحت کی صورت میں ملتا ہے اور جہنم کے راستے کی عارضی لذتوں کا ثمرہ دوزخ کا نہ ختم ہونے والا عذاب ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ اس طالب علم کی سی ہے جو امتحان کے دنوں میں رات کے

وقت جبکہ گھر کے باقی تمام افراد ٹی وی کے سامنے بیٹھے دلچسپ پروگراموں سے
لُطف اندوز ہو رہے ہوں وہ سب سے الگ تھلگ اپنی کتابوں اور کاپیوں
میں غرق ہو اور محنت کی مشقّت برداشت کر رہا ہو تاکہ اس کا نتیجہ کامیابی کی راحت
کی صُورت میں برآمد ہو یا جس طرح ایک مریض چند دن اچھے اور مزیدار کھانوں
سے پرہیز کی زحمت برداشت کرتا ہے۔ اور انجام میں اسے صحت کی نعمت حاصل
ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے دو راستے رکھے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہر
انسان کو جاہل ہو یا عالم، بچّہ ہو یا بڑا ایک ایسا ملکہ عطا فرمایا ہے جس کے ذریعہ وہ خیرو
شر اور اچھے بُرے میں فرق و امتیاز کرتا ہے۔ ہر انسان کا ضمیر نیک کام کر کے راحت محسوس
کرتا ہے اور بدی کے ارتکاب سے آزردہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ملکہ تو حیوانات تک میں
موجود ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی بلّی کو آپ اپنی خوشی سے گوشت کا
ٹکڑا دیتے ہیں تو وہ بڑے اطمینان سے آپ کے سامنے ہی کھانے لگتی ہے
لیکن اگر یہی ٹکڑا اس نے چھین کر یا چُرا کر لیا ہوگا تو اسے لے کر کہیں دُور چلی
جائے گی اور بڑی تیزی سے کھانے کی کوشش کرے گی اور آپ کی طرف دیکھتی
بھی جائے گی کہ آپ کا ردِّ عمل کیا ہے کہیں آپ اس تک پہنچ کر یہ ٹکڑا اس سے
چھین نہ لیں۔ کیا اس کے صاف معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ جانتی ہے پہلا گوشت کا ٹکڑا
جو آپ نے خود دیا تھا اس پر اس کا حق ہے اور دُوسرا جو وہ جھپٹ کر لے گئی ہے
ناجائز ہے۔ کیا یہ ایک بلّی کے حق و باطل اور حلال و حرام میں فرق محسوس کرنے
کی واضح دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح کُتّا جب کوئی اچھا کام کرتا ہے۔ اپنے مالک
کے قریب آکر اس کا جسم چھُوتا اور پیر چاٹتا ہے۔ گویا اس سے اپنے کام کا صلہ
مانگ رہا ہے۔ اور جب کوئی غلطی کر گزرتا ہے تو مالک کے قریب بھی نہیں آتا دُور

کھڑا دُم ہلاتا رہتا ہے۔ گویا غلطی پر معذرت خواہ ہے یا سزا کا منتظر۔ ارشادِ باری تعالیٰ وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنَ۔ البلد (۱۰) "کیا نیکی اور بدی کے دونوں نمایاں راستے ہم نے انسان کو نہیں دکھا دیے"۔ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جنّت کے راستے پر اپنے داعی اور نقیب کھڑے کر رکھے ہیں جو اس طرف بلاتے ہیں اور اس راہ میں راہ نمائی کرتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام ہیں۔ اسی طرح دوزخ کے راستے کے داعی اور نقیب شیاطین ہیں جو جہنّم کی طرف بلاتے ہیں اور اس کی ترغیب دیتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کو انبیا علیہم السّلام کا وارث بنایا ہے۔ یہ لوگ انبیا سے وراثت میں مال و دولت نہیں لیتے بلکہ ان کی میراث علم اور دعوت الی الحق ہے۔ عُلماء میں سے جو افراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اس دعوت کا حق ادا کرتے ہیں وہ واقعی اس شرفِ وراثت کے مستحق ہیں۔

یہ دعوت درحقیقت ایک مشکل کام ہے۔ انسان کا نفس طبعاً آزادی پسند ہے اور دین اس کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔ انسان ہر قسم کے لطف و عیش کا دلدادہ ہے۔ لیکن مذہب کی پابندیاں اس کو ایک حد سے آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص فسق و گناہ کی دعوت دیتا ہے تو یہ دعوت طبعِ انسانی کے موافق ہوتی ہے۔ اور انسان اس کی طرف بہتا ہُوا اور لپکتا ہُوا چلا جاتا ہے۔ جیسے پانی ڈھلوان کی طرف بہتا ہے۔ اگر آپ بلندی پر پانی کے کسی ذخیرے میں سوراخ کر دیں تو آپ کے دیکھتے دیکھتے پانی اس میں سے بہہ کر نشیب میں جمع ہو جائے گا لیکن اگر اسی پانی کو دوبارہ واپس بلندی پر پہنچانا چاہیں گے تو ظاہر ہے یہ کام آسانی سے نہ ہوگا۔ اس کے لیے آپ کو پمپ استعمال کرنا پڑے گا۔ اور کافی دِقّت اور خرچ سے یہ کام انجام پائے گا۔ پہاڑ کی چوٹی پر اٹکا ہُوا پتھر نیچے کی طرف لڑھکانے

اور گرانے کے لیے کسی زور یا مشقّت کی ضرورت نہیں۔ ذرا چھیڑ دیجیے آپ سے آپ نیچے کی طرف لڑھکتا چلا جائے گا لیکن اگر اسی پتھر کو واپس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچانا چاہیں گے تو مشقّت برداشت کرنا پڑے گی۔ یہی مثال انسان پر صادق آتی ہے۔

آپ سے جب ایک بدکردار دوست یہ کہتا ہے کہ آج فلاں جگہ ایک حسینہ کا عُریاں رقص ہو رہا ہے تو آپ کی طبیعت فوراً اس طرف مائل ہو گی۔ خواہشاتِ نفسانی ادھر جانے پر اُکسائیں گی اور ہزاروں شیطان آپ کو جانے پر مجبور کریں گے اور آپ اس طرح کھنچے چلے جائیں گے کہ آپ کو پتہ بھی نہ چلے گا اور آپ رقص گاہ کے دروازے پر پہنچ چکے ہوں گے۔ اب اگر کوئی ناصح یہ چاہے کہ آپ وہاں سے واپس لوٹ جائیں تو آپ کے لیے اس کی نصیحت ماننا، اپنے نفس کا مقابلہ کرنا اور دل کی خواہش کو رد کرنا خاصا مشکل کام ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ بُرائی کی طرف دعوت دینے والوں کو کسی قسم کی زحمت نہیں اُٹھانا پڑتی۔ اور نہ محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس بھلائی اور خیر کی طرف بُلانے والوں اور نصیحت کرنے والوں کو مشقّت اور تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ بدی کی طرف بُلانے والوں کے پاس ہر وہ سامان موجود ہے جس کی طرف نفسِ انسانی راغب ہوتا ہے۔ ننگی عورتیں ہیں، بُری خواہشات کی تسکین ہے، کام و دہن، ہوش و گوش، قلب و نظر اور جسم و نفس کی ہر لذّت اور ہر طرح کی لُطف اندوزی کا انتظام و اہتمام موجود ہے اور خیر کی دعوت دینے والے کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ آپ کو ایک جوان لڑکی ایسی حالت میں نظر آتی ہے کہ اس کے مراکزِ حُسن جاذبِ نگاہ ہیں۔ ناصح آپ سے کہے گا اپنی آنکھیں بند کر لو۔ اور اُدھر نہ دیکھو۔ اسی طرح ایک تاجر صاف دیکھ رہا ہے کہ سُودی کاروبار میں بغیر کسی زحمت اور محنت کے اِسے نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا جی اس نفع کی خاطر للچائے گا لیکن داعی الی الخیر کہے گا کہ یہ ناجائز ہے اس کا لالچ نہ کرو۔ اور متوقع

نفع چھوڑ دو۔ یعنی جو مال فوراً حاصل ہو رہا ہے۔ اسے ہاتھ نہ لگاؤ اور نقصان اُٹھاؤ۔ ایک مُلازم اپنے ساتھی کو رشوت لیتے اور ایک منٹ میں چھ ماہ کی تنخواہ کے برابر مال حاصل کرتے دیکھتا ہے۔ پھر عالمِ تصوّر میں اسے نظر آتا ہے کہ وہ ساتھی خوش حال ہو گیا ہے۔ اور اپنی مدّت سے رُکی ہوئی ضرورتیں بڑی آسانی سے پُوری کر رہا ہے۔ اسی حالت میں حضرت ناصح آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ایسا نہ کرنا اور یہ فوائد جو اس نے حاصل کیے ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جانا۔

ناصح کہتا ہے کہ ان یقینی اور فوراً حاصل ہو سکنے والی لذّتوں کی طرف نہ دیکھو تاکہ تمھیں مستقبل کی غیر مرئی لذّتیں حاصل ہوں۔ یہ جو کچھ سامنے نظر آرہا ہے اسے نہ نظر آنے والے اور نہ محسوس ہونے والے فوائد کی خاطر ہاتھ نہ لگاؤ۔ اپنے نفس اور دل کا کہا نہ مانو بلکہ ان کی مخالفت کرو۔ ظاہر ہے یہ سب طبعِ انسانی پر گراں گزرے گا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دین اور اس کے احکام گراں اور گراں بار ہیں۔ خود قرآن مجید میں اس کو قولِ ثقیل کہا گیا ہے: " سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا " المزمل۔ ۵) "ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ فضیلت اور بلند مرتبہ تک پہنچانے والا ہر عمل نفسِ انسانی پر گراں گزرتا ہے۔ طالب علم کا ٹیلی ویژن چھوڑ کر کتابیں پڑھنے پر توجہ دینا ناپسندیدہ کام ہے۔ ایک عالم کا عیش و تفریح کی محفل چھوڑ کر پڑھنے پڑھانے کے کام میں جُٹ جانا طبیعت کے لیے ناگوار ہے۔ صبح کے وقت میٹھی نیند میں مخمور شخص کا آرام وہ بستر چھوڑ کر نماز کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا طبعِ انسانی پر بوجھ بنتا ہے۔ اسی طرح اپنے گھر بار اور اہل و عیال کو چھوڑ کر جہاد کے لیے جانا تکلیف دِہ کام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کو گناہ کی طرف مائل لوگ نیک لوگوں سے زیادہ نظر آئیں گے۔ غفلت کے ماتے اور گمراہی میں بھٹکے ہوئے افراد کی تعداد ان لوگوں

سے زیادہ ہے جو اللہ کو یاد کرتے اور سیدھے راستے پر چلتے ہیں۔ اور یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ بے سوچے سمجھے اور بغیر کسی دلیل کے اکثریّت کا اتباع کرنا اکثر انسان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کی آیۂ کریمہ: وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانعام ۱۱۶) "اور اے نبی اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔" میں یہی ہدایت دی گئی ہے۔ ویسے بھی اگر کسی چیز کا نادر الوجود اور کمیاب ہونا اسکے اعلیٰ و ارفع ہونے کی دلیل نہ ہوتی تو ہیرا کمیاب اور کوئلہ وافر مقدار میں نہ ہوتا۔ اور جینیئس اور غیر معمولی قابلیت کے افراد اور سربرآوردہ قائدین اقلیت میں نہ ہوتے۔

انبیاء علیہم السلام اور علماء میں سے نیک افراد جو انبیاء کے وارث ہیں، جنّت کے راستے کی طرف بلانے والے ہیں۔ اور شیاطین اور انسانوں میں سے بدکردار لوگ جو دنیا میں فساد پیدا کرتے ہیں اور ابلیس کے مددگار ہیں۔ یہ دوزخ کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ اور ہمارے اندر بھی ان دونوں گروہوں کے مددگار اور ساتھی موجود ہیں۔ ہماری داخلی دنیا میں ایک حصّہ انبیاء کا طرف دار ہے اور ایک حصّہ شیطان کا ہم نوا ہے۔ جو حصّہ انبیاء کا طرف دار ہے وہ عقلِ سلیم کی صورت میں موجود ہے۔ اور شیطان کا ساتھی حصّہ نفسِ امّارہ ہے جو برائی پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عقل اور نفس کیا ہیں؟ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے کوئی علیحدہ علیحدہ واضح حد مقرر کی جا سکتی ہے یا کوئی ایسی تعبیر یا تعریف کی جا سکتی ہے جس سے یہ پوری طرح سمجھ میں آجائیں۔ اس لیے کہ یہ چیز ابھی تک علمِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے اور ہماری نارسائی کے ظلمات میں پوشیدہ ہے علم ان کے حدود اربعہ کو پوری طرح روشن،

نہیں کر سکا۔ ہم میں سے ہر شخص روزانہ کہتا ہے کہ "مَیں نے اپنے آپ سے یہ کہا" یا "مجھے عقل نے یہ مشورہ دیا" تو یہ آپ اور آپ کی عقل یا آپ اور آپ کا نفس دو علیٰحدہ علیٰحدہ چیزیں ہُوئیں۔ لیکن کیا ہیں؟ ان کی تعیین و تبیین کیا ہے؟ کبھی واضح نہیں ہو سکا۔ اس لیے اس وقت میں بھی آپ کے سامنے ایک نامعلوم چیز کو کھول کر نہیں دکھا سکتا۔ البتّہ ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

جاڑے کا موسم ہے آپ نرم و گرم بستر میں میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں اچانک آذان کی آواز آتی ہے اور آپ کو نماز کے لیے اُٹھنے کی دعوت دیتی ہے۔ کیا اس موقع پر آپ اپنے اندر کسی کو یہ کہتے ہُوئے نہیں محسوس کرتے کہ "اُٹھو نماز کے لیے جاؤ"۔ اور جب آپ اُٹھنا چاہیں گے تو ایک دوسری آواز یہ کہتی ہُوئی محسوس ہو گی کہ "تھوڑی دیر اور سو لو"۔ پھر پہلی آواز کہتی سنائی دے گی "نماز نیند سے بہتر ہے"۔ اور دُوسری آواز آئے گی "نیند بڑی مزے دار ہے اور ابھی تو بہت وقت باقی ہے۔ چند منٹ اور لیٹے رہنے میں کوئی حرج نہیں"۔ اس طرح یہ دونوں آوازیں یا خیال یکے بعد دیگرے آتے رہیں گے۔ جیسے گھڑی کی ٹِک ٹِک سنائی دیتی ہے سو جا۔ اُٹھ۔ سو جا۔ اُٹھ۔ ظاہر ہے۔ ایک آواز جو اُٹھنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ عقل ہے اور دُوسری جو سونے کی طرف مائل کرتی ہے نفس ہے

---

[1] یہ کیفیت ہر وہ شخص محسوس کرتا ہے جو کسی گڑھے یا نہر کے کنارے سے کُودنا چاہتا ہو۔ اور جسے پار کر جانے کی اُمید کے ساتھ گر پڑنے کا خوف بھی لاحق ہو۔ ایسی حالت میں اس کو اپنے اندر دو متضاد آوازیں پے بہ پے سنائی دیں گی۔ ایک کہے گی کُود جا اور دُوسری رو کے گی۔ اب اگر یہ کُود جا کی آواز پر بغیر تردّد کے کُود جاتا ہے تو کامیاب ہو جائے گا اور اگر متردّد ہو گیا اور رُک جا کی آواز آ گئی اور پھر کُودا تو یقیناً گر جائے گا۔ یہ ایک عام تجربہ کی بات ہے۔ مُصنّف۔

یہ ایک ایسی مثال ہے جو ہزارہا مواقع پر اور ہزاروں صورتوں میں پیش آتی رہتی ہے جب بھی ناجائز لطف و لذّت کا کوئی موقع کسی شخص کے سامنے آتا ہے نفس اس شخص کو اس پر ٹوٹ پڑنے پر آمادہ کرتا ہے اور اگر اس میں ایمان کی رمق موجود ہو تو عقل اس کو باز رہنے کا مشورہ دیتی ہے اور جتنا ایمان مضبوط ہوتا ہے اتنی ہی عقل کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عقل ہمیشہ کامیاب ہو جاتی ہے اور یہ کہ مسلمان کبھی گناہ کے قریب نہیں جاتا۔ اسلام ایک حقیقت پسند اور فطری دین ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مخلوق تو محض اپنی عبادت اور اطاعت کے لیے پیدا فرمائی ہے اور وُہ فرشتے ہیں۔ انسان کو فرشتہ نہیں بنایا گیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک مخلوق خالص گناہ اور سرکشی کے لیے پیدا کی ہے۔ وہ شیاطین ہیں۔ اور ہم انسانوں کو اس نے شیطان بھی نہیں بنایا۔ پھر اس نے ایک مخلوق ایسی پیدا کی ہے جسے عقل نہیں دی گئی۔ صرف جبلّت عطا کی گئی ہے، نہ ان پر فرائض عائد ہوتے ہیں۔ نہ اُن سے جواب طلبی ہو گی۔ یہ حیوانات ہیں۔ ہم انسانوں کو اس نے حیوانِ مطلق بھی نہیں بنایا۔

پھر ہم کیا ہیں؟ یہ انسان کیا ہے؟

انسان ایک ایسی تخلیق ہے جو ان سب سے ممتاز و منفرد ہے۔ اس میں کسی حد تک ملائکہ کے اوصاف ہیں اور کسی حد تک شیطان کی شیطنت ہے۔ اسی طرح جانوروں کی حیوانیت اور وحشت کا بھی کچھ حصّہ اس کے مرکب میں شامل ہے۔ اگر انسان عبادت و ریاضت میں مشغول رہے اور خشوع و خضوع سے اپنے رب کے ساتھ لَو لگا لے اور اس کا دل نفسانی غلاظتوں سے اتنا پاک ہو جائے کہ اس میں حُسنِ مطلق کا جلوہ منعکس ہونے لگے اور ایمان کی مٹھاس چکھ لے تو ایسی حالت میں

اس پر ملکی صفات غالب آجاتی ہیں اور وہ فرشتوں سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے رب کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے بجا لاتے ہیں۔

اور اگر انسان کی شہوتِ نفسانی میں ہیجان آجائے اور اس پر جنسی جذبات کا غلبہ ہو جس کی وجہ سے خون کھولنے لگے، رگوں میں پارہ دوڑنے لگے، اور ذہن میں آرزوؤں اور خواہشات کا طوفان اُمنڈ آئے تو یہ ہر حرام کام کرنے پر راغب ہو جائے گا۔ ہر ناپاک چیز اُسے لطیف و نظیف نظر آئے گی۔ عجیب و غریب غیر طبعی اور غیر فطری منصوبے سوچے گا۔ اس صورت میں اس پر شیطانی کیفیت غالب آ جائے گی اور اگر اس کا غصّہ بھڑک اُٹھے، اعصاب تن جائیں، خون میں جوش آ جائے جسم کے عضلات اکڑ جائیں اور اس کی آرزو اس وقت صرف یہ رہ جائے کہ اپنے دشمن کو دبوچ کر چیر پھاڑ ڈالے، اسے دانتوں سے کاٹے اور ناخنوں سے نوچے کھسوٹے، اس کی گردن میں اپنی اُنگلیاں پیوست کر کے گلا گھونٹ دے اور اچھی طرح روندے کچلے تو ایسی حالت میں اس پر وحشت اور حیوانیت کی صفت غالب آچکی ہوگی۔ اس میں اور چیتے اور تیندوے میں کچھ زیادہ فرق نہ رہ جائے گا یا اگر بھوک اور پیاس کی شدّت سے تنگ آکر اس کی خواہش اور آرزو صرف یہ رہ جائے کہ ایک روٹی مل جائے جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکے یا پانی کا ایک گلاس مل جائے جس سے اپنی پیاس بجھالے تو ایسی صورت میں اس پر جانوروں کی کیفیت غالب ہوگی اور وہ گھوڑے بکری یا کسی بھی اور جانور کی مانند ہو جائے گا۔

یہ ہے انسان کی حقیقت، اس میں خیر کی صلاحیت بھی ہے اور شر کی استعداد بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دونوں جہتیں عطا فرمائی ہیں۔ اور اس کے ساتھ اسے عقل بھی دی ہے۔ جس کے ذریعہ یہ خیر و شر میں فرق و تمیز کرتا ہے۔ اور قوتِ ارادہ

بھی عطا فرمائی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر قادر ہے۔ اب اگر انسان اپنی عقل کا بہتر استعمال کرتا ہے اور ارادے کو درست طور پر برتتا ہے۔ اس کی نیکی اور بھلائی کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور اخلاقِ حسنہ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ تو یہ آخرت میں خوش بخت ہوگا۔ جنت میں جائے گا۔ اور اگر برعکس کیفیت ہے تو بد بخت ہوگا اور عذاب پائے گا۔ یہ بالکل درست ہے کہ انسانی طبیعت آزادی پسند واقع ہوئی ہے اور مذہب اس پر پابندیاں عاید کرتا ہے لیکن اگر یہ پابندی نہ ہوتی اور انسان کو اس کی طبعِ آزاد کے مطابق کھُل کھیلنے اور ہر بُرا کام کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو یہ ایسے ایسے کارنامے انجام دیتا کہ انسانی معاشرہ ایک بہت بڑا پاگل خانہ بن جاتا۔ اس لیے کہ آزادیٔ مطلق تو صرف دیوانوں کے لیے ہے اور اگر دیوانے کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ ہر وہ کام کر گزرے گا جو اس کا دل چاہے گا۔ بازاروں میں ننگا پھرے گا۔ یا کسی بس ڈرائیور کے کندھوں پر سوار ہو جائے گا۔ اگر اس کو آپ کا لباس پسند آگیا تو آپ سے اُتروا لے گا۔ یا اگر کسی کی لڑکی پسند آگئی تو وہ مذہب کا بنایا ہوا قانونی طریقہ اختیار کیے بغیر چھیننے کی کوشش کرے گا۔

پابندی کے بغیر آزادی صرف دیوانے کی آزادی ہے۔ جس کے پاس عقل ہے اسے عقل ایسی آزادی سے روکتی ہے۔ عقل بھی تو ایک قید ہے۔ لفظِ عقل "عقال" سے بنا ہے جس سے مُراد وہ رسّی ہے جس سے اُونٹ کو باندھا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظِ حکمت "حکمۃ الدابۃ" (چوپائے کو لگام دینا) سے مشتق ہے۔ یہ بھی بندش ہے۔ اور تہذیب کیا ہے۔ یہ بھی تو پابندی ہے۔ تہذیب آپ کو جو جی چاہے کرنے کی اجازت نہیں دیتی بلکہ دُوسروں کے حقوق کا خیال رکھنے کو ضروری قرار دیتی ہے ہے اور مروّج طور طریقوں کے مطابق چلن اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی

طرح عدل بھی پابندی ہے۔ یہ بھی آپ کی آزادی کی ایک حد مقرر کرتا ہے یعنی جہاں سے آپ کے ہمسایہ کی آزادی شروع ہوتی ہے اس پر دست درازی کی اجازت نہیں دیتا۔

پھر یہ ایک واقعہ ہے کہ گناہ کسی قسم کا ہو انسان کو پُر لطف معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ نفسِ انسانی کی طبیعت یعنی اس کی آزادی پسندی سے مطابق ہے۔ آپ دُوسرے کی غیبت سُننے اور اس میں شرکت کو دلچسپ محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ اس شخص سے جس کی بُرائی کی جا رہی ہے، بہتر اور افضل ہیں۔ چوری میں لذّت ہے۔ اس لیے کہ اس ذریعہ سے انسان کو بغیر محنت و مشقّت کے مال مل جاتا ہے۔ زنا لذیذ ہے اس لیے کہ اس میں انسان کی نفسانی خواہشات پُورا ہونے کا سامان ہے۔ امتحان میں ناجائز ذرائع کا استعمال بھلا لگتا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح محنت کے بغیر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ذمّہ داریوں سے گریز اور فرائضِ منصبی ادا نہ کرنا بھی انسان کو بہت مرغوب ہے اس لیے کہ اس طرح آرام ملتا ہے۔ کام نہیں کرنا پڑتا۔

لیکن اگر انسان غور و فکر سے کام لے تو یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہ وقتی آزادی جہنّم کی طویل قید کے مقابلے میں بہت حقیر و لیسیر ہے اور یہ ناجائز لذّتیں آخرت میں ملنے والے شدید عذاب کی قیمت پر بہت بے حقیقت ہیں۔ ذرا اس مثال پر غور کیجیے کہ اگر کسی شخص سے باقاعدہ قانونی دستاویز پر صرف ایک سال کے لیے یہ معاہدہ کیا جائے کہ ایک سال تک وہ جتنا مال چاہے گا اُسے ملتا رہے گا جس شہر کے جس عالی شان محل میں رہنا چاہے رہ سکے گا۔ جس عورت کو پسند کرے گا اس سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔ بلکہ دو، تین، چار جتنی عورتوں سے چاہے حتیٰ کہ اگر وہ روزانہ ایک کو طلاق دے کر دوسری سے بیاہ رچانا چاہے

گا تو اسے اس کی بھی اجازت ہو گی۔ اس کے علاوہ بھی وہ جو چیز مانگے گا، اُسے ملے گی۔ لیکن ایک سال کے بعد اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ کیا وہ اس معاہدے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ میں ایک سال کے اس لطف و عیش پر جس کا انجام یقینی موت ہے لعنت بھیجتا ہوں کیا وہ اس موقع پر عالم تصوّر میں خود کو سُولی پر لٹکا ہُوا نہ دیکھے گا۔ اور محسوس کرے گا کہ اس کی موت واقع ہو گئی ہے۔ اور اب اس کے لیے کچھ باقی نہیں رہا پھر یہ سُولی کی تکلیف تو صرف چند سیکنڈ کی ہے۔ اور آخرت کا عذاب تو نہ ختم ہونے والے زمانوں پر محیط ہے۔

ہم میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہو گا جس نے اپنی زندگی میں کوئی گناہ نہ کیا ہو اور اس کی لذّت نہ محسوس کی ہو۔ کم از کم یہ تو ضرور ہوا ہو گا کہ اس نے ایک آدھ بار صبح کی نماز کے لیے جانے کے مقابلے میں بستر کے لطف و راحت کو ترجیح دی ہو گی آپ بتائیں کہ وہ لذت کہاں گئی جو آج سے دس سال پہلے کسی گناہ میں ہم نے محسوس کی تھی۔ اس میں سے آج کیا باقی ہے۔ اسی طرح کوئی شخص ایسا نہ ہو گا جس نے کبھی نہ کبھی کسی فرض کی بجا آوری کے لیے خود کو مجبور نہ کیا ہو اور اس سلسلے میں تکلیف نہ اُٹھائی ہو۔ کم از کم رمضان میں روزے کی وجہ سے بھوک اور پیاس کی تکلیف تو ضرور محسوس کی ہو گی۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ آج ہمارے احساس میں دس سال پہلے کے رمضان میں برداشت کی ہوئی بھوک یا پیاس کی تکلیف کا کتنا حصّہ باقی ہے۔ ظاہر ہے کچھ بھی نہیں۔ وقت گیا بات گئی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو گناہ کیے تھے ان کی لذّت تو ختم ہو گئی لیکن ان کا عذاب باقی رہا۔ اس کے برعکس جو نیکی یا عبادت کی گئی اس کی مشقت اور تکلیف تو ختم ہو گئی لیکن ان کا ثواب باقی ہے اور مرتے وقت۔ ظاہر ہے اس وقت ہمارے پاس نہ وہ لذّتیں ہوں گی جو ہم نے زندگی میں گناہ کر کے چکھی تھیں۔ اور نہ وہ مشقّتیں ہوں

گی جو عبادت یا اطاعتِ احکام کی وجہ سے برداشت کی تھیں (دونوں کیفیتیں ختم ہو جائیں گی لیکن ان کے نتائج گناہ یا ثواب کی شکل میں باقی رہیں گے)

ہر ایمان دار شخص چاہتا ہے کہ توبہ کر کے اللہ سے لو لگا لے۔ لیکن اکثر وہ اس کام کو ٹالتا اور کل پر ڈالتا رہتا ہے۔ مَیں خود پہلے یہ سوچا کرتا تھا کہ جب حج کروں گا تو سارے گناہوں سے توبہ کر لوں گا اور اللہ کی طرف دھیان کھول گا۔ پھر میں نے دیکھا کہ مَیں نے حج بھی کر لیا ہے لیکن توبہ کا وعدہ پُورا نہ کر سکا۔ اس کے بعد مَیں دل کو یہ کہہ کر تسلّی دیتا رہا کہ جب چالیس سال کا ہو جاؤں گا تو ہر بُرائی سے توبہ کر لُوں گا۔ پھر چالیس سال کا بھی ہو گیا لیکن وہی حال رہا توبہ نہ کر سکا۔ پھر میری عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ ہو گئی لیکن حالت وہی رہی توبہ نصیب نہ ہُوئی۔ یہاں تک کہ اب بُوڑھا ہو گیا ہوں مگر توبہ کی توفیق ابھی میسّر نہیں آئی۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بدکار ہوں اور ہر حرام اور فحش کام کرتا ہوں۔ بحمداللہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نیک بن جانے کی خواہش اور آرزو تو رکھتا ہے لیکن ٹالتا رہتا ہے اور اس انداز میں سوچتا ہے کہ موت میں ابھی بہت مُہلت باقی ہے اور کافی عمر پڑی ہے پھر کبھی دیکھا جائے گا میں نے خود دو مرتبہ موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس وقت مجھے یہ شدید احساس ہُوا کہ میں اپنی زندگی میں وقت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ زندگی کے ان لمحوں پر جو اطاعت و عبادت کے بغیر گزرے سخت ندامت محسوس ہُوئی۔ واللہ میں یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ پھر جب میں موت کے مُنھ سے بچ گیا تو چند دنوں تک یہ کیفیت برقرار رہی۔ اور میں نیک اور ٹھیک رہا۔ اس کے بعد پھر زندگی کی فریب کاریوں میں کھو گیا۔ اور بھُول گیا یعنی موت کو بھُول گیا۔

ہم میں سے ہر شخص موت کو بھُول جاتا ہے۔ ہم روزانہ مرنے والوں کو اپنے سامنے

گزرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مگر یہ کبھی تصوّر نہیں آتا کہ ہم بھی مرجائیں گے۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہوتے ہیں تو اس وقت بھی دُنیا کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں۔ ہر شخص کچھ اس انداز میں سوچتا ہے کہ باقی سب تو مرجائیں گے وہ خود نہیں مرے گا حالانکہ انسان خُوب جانتا ہے کہ ایک دن دُنیا اس سے مُنھ موڑ جائے گی اور وُہ یہاں سے چلا جائے گا۔ انسان کتنی مدّت کیوں نہ زندہ رہے ایک نہ ایک دن اسے مرنا ہے۔ ساٹھ سال، ستّر سال، سَو سال کتنا عرصہ زندہ رہ سکتا ہے۔ پھر کیا یہ مدت ختم نہ ہوگی۔ کیا یہ بات ہم سب اچھی طرح نہیں جانتے کہ جو لوگ سو سال زندہ رہے وہ بھی مرگئے۔ نُوحؑ علیہ السّلام نو سو پچاس ۹۵۰ سال اپنی قوم میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آج حضرت نوح علیہ السّلام کہاں ہیں؟ کیا وہ اس دُنیا میں باقی رہ گئے؟ کیا انھیں موت سے ہمکنار نہ ہونا پڑا؟ پھر جب موت اتنی ہی اٹل ہے کہ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا تو پھر ہم موت کے بارے میں کیوں فکر نہیں کرتے اور اس کے لیے تیاری کیوں نہیں کرتے؟

اگر کسی شخص کو ایسا سفر درپیش ہو جس پر روانہ ہونے کا وقت اسے معلوم نہ ہو کیا وہ اس کے لیے ہر وقت تیار ہو کر نہ رہے گا۔ تاکہ روانگی کی اطّلاع ملتے ہی چل پڑے۔ گزشتہ موسمِ سرما میں جب مَیں عمّان میں تھا۔ میں نے خود یہ واقعہ دیکھا کہ اُردن کے جن اساتذہ نے سعودی حکومت سے مُلازمت کا مُعاہدہ کیا تھا انھیں حکومت نے مطلع کر دیا تھا کہ طیّارے جب ان کو لینے آئیں گے بلا توقّف لے کر چل پڑیں گے۔ اس لیے انھیں ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اب ہُوا یہ کہ

لہ سورہ عنکبوت آیت ۱۴ میں ارشاد ہے: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ط "ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا۔" (الناشر)

جن لوگوں نے اپنے سفر کے کاغذات مکمل کرا لیے تھے، سامان باندھ کر تیار رکھا تھا اور اپنے اہل و عیال سے مل ملا کر کیل کانٹے سے لیس تھے وہ تو جس وقت انھیں بُلایا گیا فوراً ایئر پورٹ پہنچ گئے اور جنھوں نے سُستی دکھائی اور وقت ٹالتے رہے انھیں جب بُلایا گیا تو کہنے لگے ہمیں کچھ وقت چاہیے تاکہ بازار سے سامان خرید سکیں۔ گاؤں جا کر بال بچّوں سے مل سکیں اور حکومت سے پاسپورٹ وغیرہ تیار کرا سکیں ایسے لوگوں کو کوئی مہلت نہ دی گئی اور طیارے انھیں چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن ملک الموت جب آئے گا تو وہ چھوڑ کر بھی نہ جائے گا۔ بلکہ بزور پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ آپ کتنا ہی انکار کریں ایک گھنٹہ، ایک منٹ بلکہ ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دے گا۔ وہ مہلت دے ہی نہیں سکتا یہ اس کے اختیار میں ہی نہیں ہے اور ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ وہ کب آکر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اور یہ موت کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ انسانی زندگی مختلف مراحل پر منقسم ہے۔ ایک مرحلہ تھا جب وہ ماں کے پیٹ میں بحالتِ جنین تھا۔ پھر ایک مرحلہ آیا جب اس نے محسوس کیا کہ وہ اس دُنیا میں ہے۔ پھر ایک مرحلہ آئے گا جب یہی انسان اپنی موت کے وقت سے قیامت تک کے لیے دُنیا اور آخرت کے درمیانی پڑاؤ برزخ میں رہے گا۔ اور آخری مرحلہ جو اَبدی اور غیر فانی ہے اور جہاں کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ آخرت کا مرحلہ ہے اور ہر مرحلے کی اپنے سے پہلے مرحلے کے مقابلے میں وہی حیثیت ہے جو اس کے بعد کے مرحلے کی خود اس کے مقابلے میں۔ یہ دُنیا تنگنائے شکمِ مادر کے مقابلے میں اتنی ہی وسیع ہے جتنا برزخ اس دُنیا کے مقابلے میں۔ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو وہ اُسی کو اپنی دُنیا خیال کرتا ہے اور اگر وہ سوچ سمجھ سکے اور سوال و جواب کے قابل ہو تو وہ کہے گا کہ اس کا یہاں سے نکلنا یقینی موت کے مترادف

ہے۔ اگر پیٹ میں بیک وقت دو توام بچّے ہوں اور ان میں سے ایک دُوسرے سے پہلے باہر آجائے اور دُوسرا بچہ جو اس کے ساتھ ہے اسے باہر جاتے اور خود سے جُدا ہوتے دیکھے تو یقیناً وہ سمجھے گا کہ اس کا ساتھی مرگیا اور پاتال میں کہیں دفن ہو گیا۔

بچّہ اگر مشیمہ (آنول) کو کوڑے میں پڑا دیکھے تو یہی خیال کرے گا کہ یہ اس کے بھائی کی لاش ہے اور اسے دیکھ کر اسی طرح روئے گا جس طرح کوئی ماں اپنے لختِ جگر کو قبر میں اتارتے وقت روتی ہے۔ جبکہ وہ پہلے اسے گرد وغبار سے بھی بچایا کرتی تھی۔ اس بیچاری کو یہ معلوم نہیں کہ بچے کا یہ مُردہ جسم بھی مشیمہ کی مانند ہے۔ یہ انسانی جسم دراصل ایک قمیض کی مانند ہے جو میلی، گندی اور بوسیدہ ہو جائے تو اُسے بیکار سمجھ کر اتار کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہی دراصل جسم کی موت ہے جو درحقیقت نئے جنم کے مترادف ہے۔ زندگی کے ایک مرحلے سے نکل کر ایک نئے اور آرام دہ مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ اور یہ دُنیا صرف گزرگاہ ہے۔ یہاں ہماری زندگی ایک مہاجر یا مُسافر کی سی زندگی ہے۔ جیسے کوئی شخص امریکہ جانے کے لیے اثنا۔ راہ میں کئی ممالک سے گزرتا ہے۔ یہ مُسافر جہاز میں اپنے لیے بہترین کمرے کا انتخاب ضرور کرے گا۔ اور اس کی خواہش ہو گی کہ اسے کمرہ میں ہر طرح کا آرام ملے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنا سرمایہ کمرے کے نئے فرش بنوانے اور اس کی دیواروں کی آرائش اور نقش ونگار پر خرچ کر دے کہ اس کی جمع پُونجی اسی میں صرف ہو جائے اور جب امریکہ پہنچے تو قلّاش ہو۔ وہ یقیناً یہ سوچے گا کہ اس کمرے میں میرا قیام زیادہ سے زیادہ چند ہفتے ہے۔ اس لیے اس میں قیام کے دُوران جو کچھ میسّر آئے اسی پر قناعت کرنا اور وقت گزارنا چاہیے اور اپنا سرمایہ محفوظ رکھنا چاہیے تاکہ امریکہ جا کر جو گھر لیا جائے اس کا انتظام و

انصرام بہتر کیا جا سکے۔ اس لیے کہ وہاں مجھے مستقل قیام کرنا ہے۔

دُنیا اور آخرت کی مثال کو اس واقعہ سے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے امریکہ نے اپنے ایٹمی تجربے کے لیے بحر الکاہل کے ایک جزیرے میں جس میں چند سو ماہی گیروں کی بستیاں تھیں، یہ اعلان کرایا کہ جزیرے کے باشندے یہ جزیرہ خالی کر دیں اور اس کے بدلے میں انھیں جس ملک میں وہ چاہیں گے، ایک آراستہ گھر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ جزیرہ خالی کرنے اور اپنا سامان وہاں سے اُٹھالے جانے کی اطلاع فلاں تاریخ تک دے دیں۔ اس مقصد کے لیے ایک تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ مقررہ تاریخ کے بعد طیارے آئیں گے اور لوگوں کو نکال کر لے جائیں گے۔ اہلِ جزیرہ میں سے کچھ لوگوں نے تو جزیرہ چھوڑ دینے کا اعلان کر دیا اور مقررہ تاریخ سے پہلے اپنا سب کچھ سمیٹ لیا۔ اور کچھ نے سُستی دکھائی۔ اور جانے کے خیال کو ٹالتے رہے یہاں تک کہ مقررہ تاریخ قریب آگئی اور کچھ ایسے بھی تھے جنھیں اس بات پر یقین ہی نہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ دنیا میں امریکہ نام کا کوئی ملک موجود ہی نہیں ہے اور دُنیا صرف ہمارے اس جزیرے کا نام ہے اور ہم اس کو چھوڑ کر ہرگز نہ جائیں گے اور یہ بات بھُول گئے کہ یہ جزیرہ عنقریب تباہ ہو جائے گا اور اس کا نام ونشان مٹ جائے گا۔

یہی مثال دُنیا کی ہے پہلا گروہ مومنوں کی مانند ہے جو ہمیشہ آخرت کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ توبہ اور عبادت کے ذریعہ اپنے رب سے ملنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ دُوسری مثال ان مومنوں کی ہے جو کوتاہیاں اور گناہ کرتے رہتے ہیں اور تیسرا گروہ ان مادہ پرست کافروں کی مانند ہے جو سمجھتے ہیں کہ زندگی بس یہ دنیوی زندگی ہے اس کے بعد کچھ نہیں۔ اور موت نہ ختم ہونے والی نیند ہے جس کے بعد

سب کچھ فنا ہو جائے گا اور تمام مصیبتوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ اسلام مسلمان سے دُنیا ترک کر دینے کا تقاضا کرتا ہے اور نہ یہ کہ وہ مسجد میں جا رہے اور پھر وہاں سے نہ نکلے۔ نہ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان کسی غار میں جا بیٹھے اور پُوری زندگی وہیں گزار دے۔ قطعاً نہیں۔ بلکہ اسلام کا مُطالبہ تو مسلمانوں سے یہ ہے کہ ان کی تہذیبی قدریں اتنی اعلیٰ وارفع ہوں کہ وہ دُنیا کی سب مُہذّب اقوام سے آگے بڑھ جائیں اور مال و دولت کے اعتبار سے سب مالداروں پر سبقت لے جائیں اور علم کے تمام شعبوں میں اتنی ترقی کریں کہ دُنیا کے تمام عالموں کو پیچھے چھوڑ جائیں۔ اس کے علاوہ اسلام مسلمان کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے جسم کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ غذا اور ورزش کے ذریعہ اسے بہتر بنائے۔ نیز اپنے اہل و عیال کا حق ادا کرے، ان کا ہر طرح خیال رکھے۔ ان سے اچھا برتاؤ کرے۔ بیٹے کا حق اس طرح ادا کرے کہ اسے اعلیٰ تعلیم و تربیت دے۔ اس کے ساتھ شفقت سے پیش آئے اور معاشرے کا حق اس طرح ادا کرے کہ اس میں جس اصلاح کی ضرورت ہو اُسے اپنے حُسنِ عمل سے پُورا کرے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کا حق ادا کرے۔ اسے یکتا معبُود مانے اور اس کی عبادت و اطاعت کرے۔

مُسلمان مال جمع کرے لیکن جائز طریقے سے۔ حلال اور پاک چیزوں سے لُطف اندوز ہو۔ اور دُنیا میں بہترین دُنیا داروں کی سی زندگی گزارے۔ بشرطیکہ توحید میں فرق نہ آئے اور اس کا ایمان شرک جلی یا خفی کی آمیزش سے پاک رہے پکا مسلمان بن کر حرام چیزوں سے بچے اور اپنے دینی فرائض و واجبات ادا کرے۔ مال و دولت اس کے پاس ہو لیکن دل و دماغ پر مسلّط نہ ہو جائے اور نہ اس پر بھروسہ کرے بلکہ مسلمان کا اعتماد اور بھروسہ اپنے رب پر ہوتا ہے اور اسی کی رضا مسلمان کی رضا اور غایت مقصود ہوتی ہے ؛؛

دینِ اسلام

○

ایمان باللہ ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔
اگر کوئی مسلمان ننانوے عقیدوں پر ایمان رکھتا ہے اور ایک عقیدے کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر ہے۔
اللہ تعالیٰ اس کیفیت سے سب کو اپنی امان میں رکھے۔

○

اسلام کیا ہے؟

ایک مرتبہ میں نے اپنے شاگردوں سے پوچھا اگر آپ کے پاس ایک اجنبی آکر کہے کہ میرے پاس صرف ایک گھنٹے کی مہلت ہے۔ اور اسی فرصت میں اسلام کو سمجھنا چاہتا ہوں، آپ اس کو ایک گھنٹہ میں اسلام کس طرح سمجھائیں گے۔ وہ سب کہنے لگے یہ تو ناممکن ہے۔ اسلام سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے توحید کو سمجھے، تجوید سیکھے، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول کا مطالعہ کرے۔ پھر مختلف مسائل و مشکلات پر غور و فکر کرے، گویا کم از کم پچاس سال لگائے تب اسلام کو سمجھ سکے گا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ بڑی عجیب بات کہہ رہے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایک بدوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک آدھ دن قیام کے بعد جب واپس جاتا تھا تو اپنے قبیلے کے لیے معلّم و رہنما اور اسلام کا مبلغ و داعی بن کر واپس جاتا تھا۔ اور اس بات کا اس سے بھی زیادہ وزنی اور قطعی ثبوت مشہور حدیثِ جبرئیل کے وہ کلمات طیبات ہیں جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین فقروں میں پورے دین کا لبِ لباب بیان فرما دیا ہے اور "اسلام"، "ایمان" اور "احسان" کی پوری وضاحت فرما دی ہے۔ اگر یہ سب کچھ ممکن ہے تو آج ایک شخص کو ایک گھنٹے میں اسلام کیوں نہیں سمجھایا جا سکتا۔

○

اسلام کیا ہے، مسلمان کیسے بنا جاتا ہے؟

دُنیا کے ہر سچے اور جھوٹے مذہب اور ہر مفید اور غیر مفید جماعت اور ہر اچھی یا بُری تنظیم کے لیے کچھ بنیادی اصول اور چند فکری اور اعتقادی بنیادیں ضروری ہوتی ہیں جن سے اس کے مقاصد متعین اور سمت مقرر ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اس مذہب یا جماعت کے اراکین اور ماننے والوں کے لیے دستورِ اساسی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو شخص ان جماعتوں، مذاہب یا انجمنوں میں سے کسی کا رُکن بننا چاہتا ہے وہ پہلے ان بنیادی باتوں کو دیکھتا ہے۔ اگر یہ اسے پسند آجائیں، ان کے درست ہونے کا یقین ہو جائے اور اس کا ذہن و فکر ان باتوں کو قبول کر لے اور اس کے شکوک و شبہات دُور ہو جائیں تو وہ اس جماعت کا ممبر بن کر اس کے اراکین و متبعین میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ دستور کے مطابق تمام فرائض پُورے کرے اور مقررہ چندہ ادا کرے۔ نیز اپنے طرز و روش سے بنیادی اصولوں پر اپنے ایمان و خلوص کا ثبوت پیش کرے اور اس کے بنیادی اصولوں کو ہر وقت یاد رکھے۔ ان کے خلاف کوئی کام نہ کرے بلکہ اپنے انداز و اطوار اور طرز و عمل سے اس جماعت کے مقاصد کا اعلیٰ نمونہ بن کر رہے۔ اور اپنی عملی زندگی سے دوسروں کو اس جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دے۔ گویا کسی جماعت کا رُکن بننے کے معنی یہ ہیں کہ رُکن کو اس جماعت کے نظام سے پُوری واقفیت ہو۔ اس کے اصولوں پر

یقین رکھے، اس کے احکام کی اطاعت کرے اور اپنی زندگی ان کے مطابق بسر کرے یہ ایک عام قاعدہ ہے جس کا اطلاق اسلام پر بھی ہوتا ہے۔ جو شخص اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ سب سے پہلے اسلام کی عقلی بنیادوں کو قبول کرے اور ان کی پوری طرح تصدیق کرے تاکہ وہ اس کا عقیدہ بن جائیں۔

ان بنیادی عقاید کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مادی عالم ہی سب کچھ نہیں ہے اور محض یہ دُنیوی زندگی ہی کُل زندگی نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان تو اس دُنیا میں پیدا ہونے سے پہلے بھی موجود تھا اور مرنے کے بعد بھی موجود رہے گا۔ نیز یہ کہ انسان نے خود کو خود پیدا نہیں کیا۔ بلکہ انسان تو اس وقت سے موجود ہے جب اس کو اپنے وجود کا پتہ بھی نہ تھا۔ اور نہ انسان کے خالق یہ جمادات (زمین، آسمان، پہاڑ، چاند، سورج سمندر وغیرہ) ہیں جو انسان کو اپنے آگے پیچھے یا اُوپر نیچے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ انسان ذی عقل ہے۔ اور یہ جمادات عقل سے عاری ہیں۔ بلکہ انسان کو اور اس کائنات کو (جس میں اربوں دُنیائیں موجود ہیں) وہ الٰہِ واحد جو یکتا ہے اور زندگی اور موت کا مالک ہے۔ عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اور اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ اگر چاہے تو سب کچھ فنا بھی کر سکتا ہے۔ اسے کائنات کی کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ ہمیشہ سے ہے، اس کی کوئی ابتدا نہیں، ہمیشہ رہے گا، جس کی کوئی انتہا نہیں۔ ایسا قادرِ مطلق ہے جس کی قدرت لامحدود ہے اور اس کے علم سے کوئی بات اور کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ عادل ہے۔ لیکن اس کے عدلِ مطلق کو انسانی عدل کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ تمام فطری اور طبیعی قوانین و نوامیس جن پر اس کائنات کا نظام قائم ہے اسی کے جاری اور نافذ کردہ ہیں۔

اس کائنات میں ہر چیز اس نے ایک اندازے کے مطابق پیدا فرمائی ہے اور ازل ہی سے ان کی قسمیں متعین اور مقرر فرما دی تھیں۔ علاوہ ازیں جاندار اور بے جان

ہر قسم کی موجودات کے بارے میں ہر طرح کی چھوٹی بڑی تفصیلات مثلاً حرکت و سکون باقی رہنے یا فنا ہو جانے، یا کچھ کرنے اور نہ کرنے کی جو بھی کیفیت یا حالت ان پر طاری ہو گی اس نے ازل میں ہی طے کر دی تھیں۔ اسی نے انسان کو عقل عطا فرمائی جس کے ذریعہ سے وہ بہت سے ایسے معاملات جو اس کے اختیار میں دیے گئے ہیں حل اور طے کرتا ہے۔ اسی عقل کے ذریعہ وہ اپنے ارادے کی سمت متعیّن کرتا ہے اور اسی کی عطا کردہ قوتِ ارادی کے ذریعہ اپنی پسند اور اپنے انتخاب کو حقیقت کا رنگ دیتا ہے۔ اور واقعہ کی صورت میں بروئے کار لاتا ہے۔ اسی نے یہاں کی وقتی اور عارضی زندگی کے بعد آخرت کی ابدی اور دائمی زندگی بنائی ہے۔ جس میں نیک کام کرنے والوں کو ان کے حسنِ عمل کی جزا ملے گی اور بدکاروں کو ان کے بُرے کاموں کی سزا ملے گی۔

اور یہ معبود ایک ہے، یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں جسے اس کے ساتھ پوجا جائے، اور نہ کوئی ایسی ہستی ہے جس کو ذریعہ بنا کر اس کا قرب حاصل کیا جائے یا اس کی اجازت کے بغیر وہ کسی کی سفارش کر سکے۔ ان سب باتوں کا مطلب یہ ہوا کہ عبادت کے جتنے انداز یا طریقے ہیں سب صرف اسی کے لیے مخصوص ہیں کسی دوسرے کے حضور ان کو ادا کرنا یا بجا لانا جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو بھی مخلوق پیدا کی ہے اس میں کچھ مادی ہے جو ہمیں نظر آتی ہے یا ہمارے حواس اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ اور کچھ ایسی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی یا ہمارے حواس کی رسائی سے باہر ہے۔ اس کو مخلوقاتِ غیبیہ کہا جاتا ہے۔ پھر موجودات و مخلوقات میں کچھ بے جان ہیں اور کچھ جان دار جو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ ہیں۔ اسی جاندار مخلوق میں کچھ ایسی ہے جو محض خیر کے لیے پیدا کی گئی ہے جیسے ملائکہ۔ اور کچھ ایسی ہے جو محض شر کے لیے پیدا کی گئی ہے جیسے شیاطین۔ اور کچھ ایسی ہے جس میں دونوں پہلو ہیں ان میں اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی۔ یہ جن ہیں۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ انسانوں میں

سے بعض افراد کو منتخب فرمالیتا ہے جن پر اللہ کی طرف سے فرشتے شریعت اور احکام لے کر آتے ہیں۔ یہ منتخب افراد انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو شریعت بھیجی گئی ہے وہ ان کتابوں اور صحیفوں میں موجود ہے جو آسمان سے نازل کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ہر بعد میں آنے والی کتاب اپنے سے پہلی کتاب میں ترمیم و تنسیخ کرتی ہے ان میں سے سب سے آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ ان میں یا تو تحریف کی گئی یا وہ ضائع ہوگئیں یا بھلا دی گئیں۔ صرف قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو ہر لحاظ سے محفوظ اور ہر قسم کی تحریف سے مصئون ہے۔ اور تمام انبیا و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام میں آخری رسول جناب محمدؐ ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو عرب تھے اور قبیلہ قریش میں سے تھے۔ آپ پر رسالت و نبوت ختم کر دی گئی۔ آپ کے دین کے بعد اب کوئی دین اللہ تعالےٰ کی طرف سے نہیں آئے گا اور نہ کوئی نبی یا رسول آئے گا۔

تو گویا قرآن مجید اسلام کا دستورِ اساسی ہے۔ جو شخص اس کو اللہ تعالےٰ کی کتاب تسلیم کر لیتا ہے اور اس پر پوری طرح ایمان لے آتا ہے اسے مومن کہا جائے گا۔ لیکن محض دل میں ایمان لے آنے کو صرف اللہ تعالےٰ ہی جان سکتا ہے۔ بندے کسی کا دل چیر کر نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے مسلمان بننے کے لیے ضروری ہے کہ زبان سے بھی کلمہ شہادت ادا کر کے اپنے مسلمان اور مومن ہونے کا اعلان کرے۔ کلمہ شہادت یہ ہے: اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

جب کسی شخص نے مذکورہ بالا کلمۂ شہادت کا زبان سے اقرار کر لیا تو وہ مسلمان ہو گیا گویا اب وہ دولتِ اسلامیہ کا حقیقی شہری قرار پا گیا اور اسے وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جو ایک مسلمان کو حاصل ہیں۔ اور اس نے ان تمام فرائض کی ادائیگی قبول کر لی جن کا ادا کرنا از روئے اسلام ایک مسلمان پر واجب ہے۔

یہ فرائض یعنی عبادات بہت مختصر اور آسان ہیں۔ نہ تو ان کے ادا کرنے میں کچھ زیادہ مشقت ہے اور نہ ان کی وجہ سے معمولاتِ زندگی میں کوئی حرج واقع ہوتا ہے۔

۱۔ ان میں سے پہلا عمل یہ ہے کہ صبح کے وقت وضو کرے یعنی اپنے ہاتھ پاؤں اور منھ دھوئے اور سر کا مسح کرے اور اگر ناپاک (جنبی) ہو تو غسل کرے یعنی پورا جسم پانی سے پاک کرے اور اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کرے جس میں یکسو ہو کر اپنے رب سے لَو لگائے اور باتیں کرے۔ اُس سے اس کا فضل طلب کرے اور اس کے عذاب سے پناہ مانگے۔

پھر دوپہر کو اسی طرح چار رکعتیں ادا کرے۔ پھر دن میں مزید چار رکعت اور سورج غروب ہونے کے بعد پھر تین رکعت، اس کے بعد رات کے ابتدائی حصے میں پھر چار رکعت نماز ادا کرے۔

فرض[1] نمازیں صرف یہی ہیں جن کی ادائیگی میں پورے دن میں آدھ گھنٹہ بھی صرف نہیں ہوتا۔ مزید برآں ان کی ادائیگی کے لیے نہ کسی خاص جگہ کی پابندی ہے اور نہ کسی خاص مذہبی آدمی کے ساتھ ادا کرنے کی شرط۔ نماز اور اسلام کی باقی سب عبادتیں بندے اور رب کے مابین ایسا براہِ راست رابطہ ہے جس کے لیے کسی واسطے یا وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا ضروری عمل یہ ہے کہ سال کے ایک خاص مہینے میں مسلمان اپنا ناشتہ معمول سے ذرا پہلے کر لیتا ہے۔ یعنی صبح کی بجائے رات کے آخری حصے میں اور صبح

---

[1] واجب، سنت اور نفل نمازیں ان کے علاوہ ہیں۔ (مترجم)

کا کھانا سورج غروب ہونے کے بعد کھاتا ہے۔ اور دن بھر کھانے پینے اور جماع سے باز رہتا ہے۔ یہ مہینہ انسان کے تزکیۂ نفس کا ذریعہ بھی ہے اور اس میں معدے کو بھی آرام ملتا ہے۔ اخلاق سنورتے ہیں۔ اور جسم تندرست ہوتا ہے۔ پھر یہ مہینہ خیر کے لیے جمع ہونے اور نیک کام اجتماعی طور پر سرانجام دینے کا مظہر اور اسلامی زندگی میں مساوات کی علامت ہے۔

۳۔ تیسرا فریضہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس سال بھر کھانے پینے اور بال بچوں کے اخراجات پورا کرنے کے بعد مال کی ایک مقررہ مقدار بچ رہے جو اس کی ضرورت سے فاضل ہو تو گویا وہ غنی ہے اور اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ سال گزرنے کے بعد اس بچی ہوئی رقم میں سے ڈھائی فی صد فقیروں اور مسکینوں کا حصہ رضا کارانہ طور پر ادا کرے اور اس کو بوجھ نہ سمجھے۔ یہ رقم غریبوں اور مسکینوں کے لیے معقول مدد اور اجتماعی کفالت کا ایک مستحکم ذریعہ بن جاتی ہے اور فقر و احتیاج کا (جو دنیا کا بدترین مرض ہے) علاج ہے۔

۴۔ اسلام نے معاشرے کے لیے بار بار منعقد ہونے والے اجتماعات کا انتظام بھی کیا ہے مثلاً ایک محلّہ وارانہ اجتماع ہے جو دن میں پانچ مرتبہ منعقد ہوتا ہے۔ جیسے اسکول کے پیریڈ ہوتے ہیں۔ یہ نماز باجماعت ہے۔ اس اجتماع میں ہر رُکن اپنے رب سے اس کے حضور میں کھڑے ہو کر صرف اسی کی عبادت کرنے کا عہد کرتا ہے۔ اس کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔ مثلاً طاقت ور لوگ کمزوروں کی مدد کرتے ہیں علما جاہلوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ اور باحیثیت لوگ غریبوں کی حاجت روائی کرتے ہیں۔ یہ صرف پندرہ منٹ کے لیے منعقد ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی وجہ سے کسی کارکن یا تاجر کے کام میں کوئی حرج یا خلل واقع نہیں ہوتا۔

ایک اجتماع پوری بستی یا قصبے کا اجتماع ہے جو ہفتہ میں ایک بار منعقد ہوتا ہے۔ یہ جمعہ کی نماز کا اجتماع ہے اس میں بھی ایک گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ ایک اجتماع ہے جو پورے شہر کے باشندوں کو باہم ملنے جلنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور

سال میں دوبار منعقد ہوتا ہے۔ یہ نمازِ عید کے اجتماع ہیں۔ ان میں بھی ایک گھنٹے سے کم وقت صرف ہوتا ہے۔ پھر ایک اجتماع جس کو تمام علاقوں کا سب سے بڑا اجتماعِ عام کہا جا سکتا ہے۔ سال میں صرف ایک مرتبہ ایک مخصوص مقام پر منعقد ہوتا ہے۔ یہ دراصل ذہن و فکر کو ایک خاص ماحول میں تربیت دینے اور مخصوص جہت میں ترقی دینے کا بہترین پروگرام ہے جس میں جسمانی محنت و مشقت کا تجربہ بھی شامل ہے۔ ہر مسلمان پر زندگی میں صرف ایک بار بشرطِ استطاعت اس اجتماع میں شریک ہونا فرض کیا گیا ہے، یہ حج کا اجتماع ہے۔

یہ ہیں کُل وہ بُنیادی عبادات جن کا ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے

عبادات کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ بعض مخصوص کام نہ کیے جائیں۔ یہ وہ کام ہیں جن کے بُرا ہونے اور ان کے روکنے پر دُنیا کے تمام صاحب عقل لوگ متفق ہیں مثلاً کسی جواز کے بغیر انسانی قتل، دوسروں کے حقوق پر دست درازی، ہر قسم کا ظلم، ہر نشہ جو عقل سلب کر لیتا ہے، زنا جو خاندانوں کی عزت و شرافت کا دیوالہ نکال دیتا ہے اور نسب میں آمیزش کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح سُود، جھُوٹ، دھوکہ بازی اور کھوٹ ملانا، عہد شکنی، فوجی خدمت سے فرار، یہ سب ناجائز اور ممنوع کام ہیں۔ اور ان سے بھی بڑھ کر والدین کی نافرمانی، جھُوٹی قسم اور جھوٹی گواہی وغیرہ ایسے جرائم ہیں جن سے اسلام سختی سے منع کرتا ہے اور ان کے علاوہ تمام بُرے کام جن کے بُرے اور ناروا ہونے پر عقولِ انسانی متفق ہیں۔

اب اگر کوئی مسلمان چند فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا ہے یا کچھ ناجائز افعال کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔ پھر نادم ہو کر توبہ کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا۔ اور اگر توبہ نہیں کرتا اور اپنی غلط روش پر قائم ہے۔ تب بھی اسے مسلمان شمار کیا جائے گا۔ لیکن وہ گناہ گار ہوگا اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہوگا۔ مگر یہ عذاب ایک مدت تک کے لیے ہوگا

کافر کا سا ابدی عذاب نہ ہوگا۔

اس کے برعکس اگر کوئی مسلمان بنیادی اُمور یعنی عقاید کا انکار کرے یا ان میں شک کرے یا کسی ایسے فرض سے انکار کرے جس کے فرض ہونے پر پوری اُمتِ مُسلمہ کا اتفاق ہے یا کسی ایسے حرام کام کی حُرمت سے منکر ہو جسے سب مسلمان حرام مانتے ہیں یا قرآن مجید کا انکار کرے خواہ یہ انکار ایک کلمہ کا ہی کیوں نہ ہو۔ تو وہ دین سے خارج ہو جائے گا اور مُرتد قرار پائے گا۔ اور مُرتد ہونا اسلامی نقطہ نگاہ سے سب سے بڑا جرم ہے۔

یہ اسی طرح کا جُرم ہے جیسا کہ موجودہ قوانین کی رُو سے خیانتِ عظمیٰ (قومی یا ملکی رازوں کی چوری وغیرہ) مُرتد اگر توبہ نہ کرے اور اپنے جرم پر ڈٹا رہے تو اس کی سزا موت ہے۔

کوئی مسلمان اگر عملی اعتبار سے کوتاہی کرتا ہے، بعض فرائض ادا نہیں کرتا یا چند ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے جن سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن فرائض کے واجب العمل ہونے اور حرام کاموں کی حرمت کا اعتراف کرتا ہے تو وہ مسلمان رہے گا۔ اگرچہ گناہ گار ہوگا۔ لیکن ایمان تقسیم نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک مسلمان ننانوے (۹۹) عقیدوں پر ایمان رکھتا ہے اور ایک کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص بظاہر مُسلمان ہو لیکن درحقیقت بے ایمان ہو، جیسے کوئی شخص کسی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے اجتماعات میں شرکت کرتا ہے لیکن درحقیقت اس نے اس کے اصولوں کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہوتا اور ان کے صحیح ہونے کا دل سے قائل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس جماعت میں جاسوسی کی غرض سے یا اس کے کاموں کو بگاڑنے کے لیے شامل ہوتا ہے۔ اس مسلمان کو منافق[1] کہا جائے گا جو زبان سے

---

[1] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ نفاق دراصل یہ ہے کہ کوئی شخص خود کو مسلمان ظاہر کرے لیکن بہ باطن کافر ہو۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کہ آیت المنافق ثلاثۃ" الخ "منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ اگر وعدہ کرے تو پُورا نہ کرے، گفتگو کرے تو

(باقی اگلے صفحہ پر)

توکلمہ طیبہ پڑھتا ہے، نماز روزے کا پابند ہے، لیکن دل سے مومن نہیں۔ اس کی نجات نہ ہوگی۔ اگرچہ بظاہر اور دُنیوی اعتبار سے ہم اسے مسلمان ہی کہیں گے۔ اس لیے کہ انسان توکسی کی ظاہری حالت ہی دیکھ سکتا ہے۔ دلوں کے بھید صرف اللہ تعالٰے جانتا ہے۔

اگر ایک شخص اسلام کی فکری اور نظری بُنیادوں پر پُوری طرح ایمان لے آتا ہے یعنی وجودِ باری تعالٰے کی مکمل تصدیق کرتا ہے اور اس بات پر ایمان لے آتا ہے کہ اللہ تعالٰے کی ذات ہر قسم کے شریک اور درمیانی واسطے سے پاک ہے۔ فرشتوں، تمام رسولوں، آسمانی کتابوں اور اُخروی زندگی اور تقدیر پر ایمان لے آتا ہے، زبان سے کلمہ شہادت ادا کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، ماہِ رمضان کے روزے رکھتا ہے، اگر اس کے مال پر زکوٰۃ واجب ہو تو زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور بشرط مقدرت زندگی میں ایک مرتبہ حج کر لیتا ہے، جن حرام کاموں کی حرمت متفق علیہ ہے، ان سے باز رہتا ہے، تو وہ مومن مسلمان ہے۔

لیکن ان ظواہر پر عمل کر لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مومن کامل بھی ہو جائے ایمان کے حقیقی فوائد اور اس کا صحیح ذائقہ اسے اس وقت حاصل ہوگا۔ جب اپنی پُوری زندگی میں ایک حقیقی مومن کا کردار اور طرزِ عمل اختیار کرے گا جناب محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقِ عمل کو صرف ایک جملے میں بیان فرما دیا ہے۔ اور یہ جملہ اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اتنا جامع اور وسیع المعنی ہے کہ انسانی قوتِ بیان اور طلاقتِ لسانی کی حد اس پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس ایک

بقیہ حاشیہ:-
جھوٹ بولے اور اگر اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے" جس نفاق کا ذکر ہے یہ اجتماعی نفاق ہے یعنی کردار کا نفاق۔ ایسے شخص کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ دراصل کفر، عقیدے کا نفاق ہے اور یہی اصلی نفاق ہے (مصنف)

جملے میں دُنیا اور آخرت کی ہر قسم کی خیر جمع کردی گئی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مُسلمان اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں، کیفیتوں اور حالات میں اُٹھتے بیٹھتے، خلوت وجلوت میں، سنجیدگی میں اور مزاح کی کیفیت میں ہر وقت یہ دھیان رکھے اور یہ بات یاد رکھے کہ اللہ تعالےٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور جب اُسے یہ یاد ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ تو اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکے گا۔ نیز جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ اس کا رب اس کے ساتھ ہے، تو اُسے کوئی خوف ہوگا نہ مایوسی۔ وہ کسی دُوسرے کا محتاج نہ ہوگا۔ صرف اللہ تعالیٰ سے مانگے گا اور اسی سے دُعا کرے گا۔ اس کے باوجود اگر اس سے کبھی گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔ اور انسان ہونے کے ناطے ایسا ہونا لازم ہے تو اپنے گناہ سے باز آجائے گا اور توبہ کرلے گا۔ اور اللہ تعالےٰ اس کی توبہ قبول فرمالے گا۔ یہ سب مفہوم و مضمون جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ایک فقرے میں ہے، جو آپ نے احسان کی وضاحت میں فرمایا ہے:

تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔

"اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو اس لیے کہ اگر تم اسے نہ دیکھ سکو گے تو وہ تو تم کو ضرور دیکھ رہا ہے۔"

مجمل طور پر دینِ اسلام یہ ہے جو اَب تک بیان ہُوا۔ تفصیل آگے آئے گی۔ اس کتاب کا زیرِ نظر حصّہ جو اس وقت پیش کیا جارہا ہے عقیدے اور ایمان کے بیان پر مشتمل ہے۔ اگلے دو حصوں میں "اسلام" اور "احسان" کی تشریح اور وضاحت پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

چند اصطلاحات کی وضاحت

○

بدیہیّات :- وہ واضح اور کھُلی ہوُئی حقیقتیں جنھیں عقل قبول کرتی ہے اور سب لوگ بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں۔
جب یہی حقیقتیں تحت الشعور میں جاگزیں ہو کر خُوب راسخ ہو جائیں اور ذہن وشعُور پر پُوری طرح اثر انداز ہو کر انسان کے فکر و عمل کی قوتوں کو اپنی مضبُوط گرفت میں لے لیں تو یہی حقیقتیں عقیدہ بن جاتی ہیں۔ اور کسی بات کو عقیدہ بنا لینا اس پر ایمان لانا کہلاتا ہے۔

○

چند اصطلاحوں کی وضاحت

اس فصل میں عقیدہ کی تعریف پیش کی جائے گی. لیکن اس سے پہلے میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ چند اصطلاحوں کی وضاحت کر دُوں جو اکثر عُلماء کی نوک زبان رہتی ہیں. اور کُتبِ عقاید میں بار بار ان کا ذکر آتا ہے. یہ اصطلاحیں "شک" "ظن" اور "علم" ہیں اور ان کی وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ عقیدے کا مفہوم سمجھنا ان اصطلاحوں کو سمجھے بغیر مشکل ہے.

مشہور فلسفی "ڈی کارٹ" نے اپنے مخصوص طریقہ استدلال میں "تشکیک" سے ابتدا کی ہے. اور امام غزالی نے اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں اس سے بہت پہلے یہی انداز اختیار کیا تھا. ان دونوں نے شک کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا ہے. تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ "شک" کیا چیز ہے.

اس مثال پر غور کیجیے، آپ مکہ میں بیٹھے ہیں آپ سے کوئی شخص دریافت کرتا ہے. کیا اس وقت طائف میں بارش ہو رہی ہے؟ جواب میں آپ نہ "ہاں" کہہ سکتے ہیں اور نہ پُورے وثوق سے انکار کر سکتے ہیں. اس لیے کہ دونوں باتوں کا امکان موجود ہے. یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت طائف میں بارش ہو رہی ہو اور یہ بھی کہ مطلع صاف ہو، بارش نہ ہو. گویا پچاس فی صد بارش ہونے کا اور اتنا ہی نہ ہونے کا امکان ہے تو جس صُورت میں مثبت اور منفی دونوں پہلو برابر ہوں اور کسی ایک

کو ترجیح دینے کے لیے کوئی دلیل موجود نہ ہو تو یہ کیفیت "شک" ہے۔

دُوسری صورت۔ اگر آپ جواب دینے سے پہلے مکہ کی مشرقی سمت یعنی طائف کی جانب دیکھتے ہیں اور آپ کو دُور افق پر چند بادل نظر آتے ہیں۔ جس سے آپ کو طائف میں بارش ہونے کا خفیف سا گمان ہوتا ہے۔ کسی چیز کے موجود ہونے کا یہ خفیف سا گمان "ظن" کہلاتا ہے۔ اس صُورت میں آپ جواب میں کہیں گے "میرا خیال ہے اس وقت طائف میں بارش ہو رہی ہے"۔ گویا ساٹھ فی صد مثبت اور چالیس فی صد منفی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اور اگر آپ دیکھتے ہیں کہ گھنے بادل اُمڈے ہُوئے ہیں۔ ان کے حجم اور سیاہی میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے، بجلی چمک رہی ہے، جس کی بنا پر آپ طائف میں بارش ہونے کے بارے میں زیادہ پُر وثوق ہو جاتے ہیں۔ یعنی تقریباً ستّر فی صد، تو یہ "ظنِ غالب" کی کیفیت ہے۔ آپ ایسی صورت میں جواباً کہیں گے کہ "میرا غالب گمان ہے کہ طائف میں بارش ہو رہی ہے"۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ طائف جا کر خود اپنی آنکھوں سے بارش ہوتے دیکھ لیتے ہیں بلکہ بارش کے قطرے اپنے چہرے پر بھی محسوس کر لیتے ہیں تو گویا آپ کو بارش ہونے کا یقین حاصل ہو گیا۔ اسی یقین کی حالت یا کیفیت کو علماء "علم" کا نام دیتے ہیں۔

لفظ علم کے ایک معنی اور بھی ہیں۔ ایک "علم" یہ تھا جس کا بیان ہوا جو "جہل" کے بالمقابل بولا جاتا ہے اور ایک "علم" وہ ہے جو فن اور فلسفہ کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کیمسٹری، فزکس وغیرہ علم ہیں۔ اور مصوری اور شاعری کو فن کہا جائے گا۔

اس انداز میں جب لفظ علم استعمال ہو گا تو اس کا مقصد اشیاء کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہو گا۔ گویا پہلے عقل کے ذریعہ تجربہ اور مشاہدہ کیا جائے پھر موازنہ

اور محاکمہ کے وسیلے سے اشیاء، موجودات کی حقیقت تک پہنچا جائے اس کے برعکس فن کی منزل حسن وجمال ہے اس کا ذریعہ شعور اور وسیلۂ کامیابی ذوقِ سلیم۔

ہمارے پیشِ نظر اس وقت اُس علم سے بحث کرنا ہے جو شک وظن کے مقابلے میں بمعنی یقین استعمال ہوتا ہے۔ یہ علم[1] دو قسم کا ہے ۱۔ "علم بدیہی۔ ۲ علم نظری"۔

علمِ بدیہی: جو علم مشاہدے اور حواس کے ذریعے بلا دلیل حاصل ہو۔ مثلاً آپ کے سامنے ایک پہاڑ ہے۔ اس کے موجود ہونے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ وہ ہے، موجود ہے۔ جو بھی ذی عقل وشعور شخص اسے دیکھے گا اسے اس کے موجود ہونے کا علم حاصل ہو جائے گا۔ اس کا موجود ہونا ہی اس کے وجود کی دلیل ہے۔ یہ علم "علم ضروری" یا بدیہی کہلاتا ہے۔

علمِ نظری: لیکن یہ کلیہ۔ کہ "کسی قائم الزاویہ مثلث میں وتر کا مربع باقی دونوں ضلعوں کے مربعوں کے مجموعے کے مساوی ہوتا ہے"۔ ایک ایسی بات ہے جس کے ثبوت کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ جس عالم یا طالب علم کو اس کے دُرست ہونے کا ثبوت مل جائے گا۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہو جائے گا اور تسلیم کر لے گا۔ لیکن ایک اَن پڑھ، جاہل نہیں جان سکے گا اور جب تک اسے دلیل دے کر سمجھایا نہ جائے تسلیم نہیں کرے گا۔ خواہ وہ مثلث اس کے سامنے رکھ دیا جائے جس کے ہر ضلع پر مربع بنا ہُوا ہو۔ ایسا علم، "علم نظری" کہلاتا ہے۔ یعنی وہ علم جو عقلی دلیل کے بغیر حاصل نہیں

---

[1] اس جگہ علم سے مراد مخصوص معنی میں علم ہے۔ جیسے علم النحو، یا علم کیمیا وغیرہ۔ ہمارے علماء نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں لیکن اس کی واضح ترین تعریف جو عام فہم بھی ہے۔ وہ تعریف ہے۔ جو "سارتون" نے کی ہے کہ علم "حقیقی اور منظم معارف کے مجموعے کا نام ہے"۔ لفظ معارف کے استعمال سے شعور وخیال کے محسوسات خارج ہو گئے اور حقیقی کی قید سے فرضی اور نظری مسائل خارج ہو گئے۔ (مصنف)

ہوسکتا۔

ان نظری معلومات میں سے جو فکر و نظر اور دلیل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت عام اور مشہور ہو جاتی ہیں اور انھیں ہر عالم و جاہل اور چھوٹا بڑا سب جانتے اور مانتے ہیں اور بدیہیات کے قریب پہنچ جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کلیہ کہ "کل جز سے بڑا ہوتا ہے"۔ یا "جس روٹی میں سے ٹکڑا توڑ لیا جائے وہ سالم روٹی سے چھوٹی ہوتی ہے"۔ یہ باتیں اصل میں تو علم نظری کے دائرے میں آتی ہیں۔ اور ان کو ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہونی چاہیے لیکن آپ دیکھیں گے کہ کوئی شخص انھیں تسلیم کرنے کے لیے دلیل طلب نہیں کرتا اور نہ ان کی صداقت میں شک کرتا ہے۔ کسی بچے سے آپ مٹھی بھر گولیاں لے لیں اور اسے کم بھری مٹھی دینا چاہیں تو وہ ہرگز نہ لے گا بلکہ اگر اسے دلیل کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی جائے کہ جو کچھ اسے دیا جا رہا ہے۔ وہ اس سے زیادہ ہے جو لیا گیا تھا تب بھی تسلیم نہ کرے گا۔ اس لیے کہ جز کا کل سے چھوٹا ہونا ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

اسی طرح کسی چیز کا وہی ہونا جو وہ واقعتاً ہے (مقولۃ الھویۃ) ایک واضح حقیقت ہے۔ مثلاً آپ کے پاس قلم ہو اور کوئی شخص کہے کہ "ثابت کیجیے یہ قلم ہے جائے کا گھونٹ نہیں ہے"۔ ظاہر ہے اس کے لیے دلیل طلب کرنا یا دینا ایک بیکار بات ہوگی۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قلم قلم ہی ہے کچھ اور نہیں۔

بدیہیات یعنی وہ واضح حقیقتیں جنہیں سب تسلیم کرتے ہیں۔ اور جن کے لیے دلیل طلب نہیں کی جاتی۔ جب ایسی ہی کوئی حقیقت تحت الشعور میں داخل ہو کر مرکز ہو جائے اور ذہن و شعور کو اتنا متاثر کر دے کہ عقل انسان کے فکر و عمل کو اسی سمت میں موڑ دے تو یہ ہی حقیقت عقیدہ بن جاتی ہے اور اس پر اعتقاد رکھنا ایمان کہلاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان تو صحیح اور غلط دونوں قسم کی باتوں کو اپنا عقیدہ بنا لیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مذاہبِ باطلہ کے پیروکار اور غلط نظریات کو ماننے والے اپنے نظریات اور معتقدات پر پوری طرح ایمان رکھتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے اپنا جان و مال خرچ کرتے ہیں۔ کیا ہم انھیں مومن کہہ سکتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ انھیں محض مومن نہیں مومن بالباطل کہا جائے گا جس طرح قرآن مجید کی اس آیت میں ان پر لفظِ مومن کا اطلاق کیا گیا ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتَابِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ النساء (۵۱) "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں:" یا لفظِ ایمان کا استعمال ان کے لیے کوئی دوسری مناسب صفت لگا کر کیا جائے گا جیسے قرآن مجید کی اس آیت میں کیا گیا ہے: وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ۔ یوسف: (۱۰۶) "ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔"

جب لفظِ ایمان یا اس کے مشتقات کسی صفت کے بغیر استعمال کیے جائیں تو جو معنی اس سے مخصوص ہیں اور کتاب و سنت بلکہ اہلِ علم کی اصطلاح میں بھی وہی معنی اس سے مُراد لیے جاتے ہیں۔ وہ درجِ ذیل ہیں:-

۱- یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہی رب ہے جو یگانہ و یکتا ہے۔

۲- مالک و مختار ہے ہر چیز میں اسی کا عمل دخل ہے۔

۳- ایسا معبود ہے کہ ہر قسم کی عبادت خالصتاً صرف اسی کے لیے ہے اور عبادت کی کسی شکل و ہیئت میں کسی کو اس کے ساتھ شریک کرنا جائز نہیں۔

۴- یہ یقین رکھنا کہ تمام امورِ غیبیہ جن کا علم بذریعہ وحی نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کو دیا گیا ہے مثلاً ملائکہ، انبیاء و رسل علیہم الصّلوٰۃ والسلام، یوم آخرت اور تقدیر کا خیر و شر سب برحق ہیں۔

ان سب باتوں پر مکمّل ایمان رکھنے والا ہی مومن کہلائے گا۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کوئی ایک بات کم کر دیتا ہے۔ یا کوئی عقیدہ تسلیم نہیں کرتا یا اسے اس کے ماننے میں تردّد ہے۔ یا کسی ایک بات میں شک کرتا ہے تو اس میں ایمان کی صفت نہیں ہے اور اس کا شمار مؤمنین میں نہ ہوگا۔

○

قواعد العقائد

○

۱۔ یقین جس طرح مشاہدے اور حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح سچی خبر بھی یقین کا ذریعہ ہے۔

۲۔ اگر بعض حقیقتوں کا ادراک ہم اپنے حواس کے ذریعہ نہیں کر سکتے تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان کے وجود سے ہی انکار کر دیں۔

۳۔ نفس انسانی کے اندر ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود پر انتہائی راسخ ایمان فطری طور پر مُرتکز اور جاگزین ہے۔

۴۔ اس مادی دُنیا کے پسِ پردہ ایک رُوحانی دُنیا موجود ہے جسے ہم نہیں جان سکتے۔

۵۔ اُخروی زندگی پر ایمان ذاتِ باری تعالیٰ کے موجود ہونے پر ایمان کا منطقی نتیجہ ہے۔

○

عقاید کے اصول[1] و قواعد

پہلا قاعدہ: جن اشیاء کا ادراک انسان اپنے حواس کے ذریعہ کرتا ہے ان کے موجود ہونے کے بارے میں اسے شک نہیں ہوتا۔

یہ ایک ایسا واضح کلیہ ہے جسے ہر عقل تسلیم کرتی ہے۔ اس کے باوجود سب مشاہدات حقیقت کے مطابق نہیں ہوتے۔ مثلاً دوپہر کو صحرا میں سفر کرتے وقت انسان اپنی

---

[1] آپ کی اجازت سے میں ان قواعد کے سلسلے میں کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتا ہوں جو ویسے اس کتاب کا موضوع نہیں لیکن اس سے ان احوال و واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ان قواعد کی دریافت اور ان کی ترتیب و تدوین کا باعث بنے۔

مَیں دُوسری جنگِ عظیم سے پہلے بغداد میں ادب عربی کا استاد تھا۔ ایک دفعہ سال کے دُوسرے تعلیمی سیشن میں میرے ذمّے یہ فرض سونپا گیا کہ میں ادب کے ساتھ ساتھ طلباء کو دینیات بھی پڑھاؤں۔ دینی نصاب چند قرآنی سُورتوں اور ان کی تفسیر و تشریح پر مشتمل تھا۔ میں اس کے لیے تیار ہو گیا لیکن جب دینیات کی کلاس میں گیا تو وہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ جبکہ میرا ادب کا پیریڈ پُرسکون اور خاموش ہُوا کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طلباء دینی تعلیم کو فضول مشغلہ اور وقت کا ضیاع خیال کرتے ہیں۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا ایمان پختہ نہیں ہے، چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ قرآن مجید سنبھال کر رکھ دو۔ اور میری بات سُنو! اسی وقت بے ساختہ مجھے ایمان کے بارے میں ایک نئے انداز کی تقریر الہا ہُوئی جس میں مَیں نے ان اصولوں میں سے چند اُصول اسی وقت پیش کیے تھے۔ اس کے بعد اس کا خلاصہ ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء

(باقی اگلے صفحہ پر)

آنکھوں سے اپنے سامنے پانی کا حوض دیکھتا ہے لیکن جب قریب پہنچتا ہے تو مٹّی کے سوا کچھ نہیں ملتا اس لیے کہ اس نے جو کچھ دیکھا سراب تھا۔ اسی طرح پانی کے بھرے ہوئے گلاس میں اگر پنسل سیدھی کھڑی کر دی جائے تو دیکھنے والے کو وہ ٹوٹی ہوئی نظر آئے گی حالانکہ وہ سالم ہے۔ ایک شخص رت جگے کی محفل میں رات کو دیر تک جن بھوتوں کی کہانیاں سنتا ہے۔ اگر یہ شخص وہمی مزاج اور کمزور دل ہو تو جب وہاں سے گھر جانے کے لیے کسی سنسان اور تاریک راستے سے گزرے گا اسے ضرور اپنے سامنے کوئی نہ کوئی جن یا بھوت نظر آئے گا جسے وہ بخوبی دیکھے گا اور محسوس کرے گا جب کہ درحقیقت وہاں کوئی جن بھوت نہ ہوگا۔ بعینہٖ مداری اور شعبدہ باز لوگ طرح طرح کے عجیب و غریب کرتب دکھاتے ہیں جنھیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں حالانکہ فی الواقع ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

بقیہ حاشیہ:
میں مجلّہ "الرسالہ" میں شائع ہوا جو میری کتاب "فصول اسلامیہ" میں موجود ہے۔

پھر جب شام اور مصر کے اتحاد کے دور میں شام کے مدارس کے لیے تدوین نصاب کا کام میرے سپرد ہوا (جو صرف میں نے تنہا مرتب کیا تھا اور جس طرح میں نے مرتب کیا تھا بعینہٖ رائج کر دیا گیا تھا) تو یہ قواعد میں نے اس نصاب میں شامل کر دیے اور تفصیلات کے لیے اپنی تحریروں کا حوالہ دے دیا تاکہ وہاں سے لے لیا جائے لیکن بعض اساتذہ نے (جنھوں نے عقاید پر نصابی کتب لکھی تھیں) ان قواعد کو اپنے نام سے اپنی مرتب کردہ کتابوں میں شامل کر لیا لیکن وہ میرا مقصد نہ سمجھ سکے۔ ابتدا میں تو کچھ ٹھیک رہے لیکن آخر میں آ کر سب کیا دھرا برباد کر دیا پھر کچھ مدت کے بعد جب مجھے فکرِ معاش سے فراغت میسر آئی اور میں محکمہ نقض (اپیل کورٹ) میں مشیر مقرر ہوا اور ریاض چلا گیا۔ وہاں سے بعد میں مکہ مکرمہ جا کر ٹریننگ کالج میں پڑھانا شروع کیا تو دوبارہ ان قواعد کی طرف توجہ دی اور ان میں اضافے کیے۔ یہاں تک کہ یہ آٹھ قواعد مرتب ہو گئے جنھیں میں اب اس کتاب میں پیش کر رہا ہوں۔ (مصنف)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسانی حواس بھی غلطی کر سکتے ہیں یا دھوکہ کھا جاتے ہیں یا حواس اور صاحبِ حواس یعنی انسان اپنے مشاہدات کے بارے میں وہم میں مبتلا ہو سکتا ہے. لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے حواس کے سلسلے میں مشکوک ہو جائیں اور ان پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں. ظاہر ہے ایسا نہیں ہو سکتا. اس لیے کہ جو کچھ ہم دیکھتے، سُنتے یا محسوس کرتے ہیں. اس کے متعلق اگر شک میں مبتلا ہو جائیں تو ہمارے لیے تمام حقائق خلط ملط ہو جائیں. اور ہمارے تمام خیالات درہم برہم ہو جائیں اور ہم میں اور دیوانے میں کچھ فرق نہ رہے.

اس لیے یہاں ہمیں ایک اور شرط کا اضافہ کرنا پڑے گا. وہ یہ کہ جس چیز کو ہم محسوس کرتے ہیں اس کے موجود اور درست ہونے کا علم یعنی یقین حاصل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عقل اپنے سابق تجربہ کی بنیاد پر یہ فیصلہ نہ کر دے کہ یہ مشاہدہ وہم ہے یا حواس کا دھوکہ اور مغالطہ ہے. اس لیے کہ عقل صرف ایک مرتبہ دھوکہ کھا سکتی ہے یعنی وہ سراب کو صرف پہلی مرتبہ دیکھ کر پانی خیال کر سکتی ہے لیکن اگر دوبارہ یہی کیفیت پیش آئے گی تو وہ فوراً جان لے گی کہ یہ سراب ہے، فریبِ نظر ہے. اسی طرح پانی کے گلاس میں پڑی ہوئی پنسل کے بارے میں جب اسے معلوم ہو جائے گا کہ اگرچہ دیکھنے میں وہ شکستہ نظر آتی ہے لیکن درحقیقت سالم ہے تو دوبارہ اسے مغالطہ نہیں ہو گا. وہ اسے ٹوٹا ہوا دیکھنے کے باوجود سالم سمجھے گی. دُوسرے، وُہ اُمور جن میں حواس مغالطہ کھاتے ہیں وہ بہت تھوڑے ہیں، گِنے چُنے اور سب کے جانے پہچانے ہیں اس لیے ان کی وجہ سے قاعدہ کلّیہ (کہ جو کچھ ہم حواس کے ذریعہ سے محسوس کرتے ہیں اس کے فی الواقع موجود ہونے کے بارے میں شک نہیں ہوتا) نہیں ٹوٹتا. اور اس کلیہ کے دُرست ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا. فرعون کے جادوگروں کا مظاہرہ یا آج کل سرکس میں شعبدہ باز یا بازی گر

جو کچھ دکھاتے ہیں وہ سب اسی ضمن میں آجاتا ہے۔

دُوسرا قاعدہ: اس دُنیا میں کچھ ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جنھیں نہ ہم نے دیکھا ہے اور نہ محسوس کیا ہے لیکن ان کے موجود ہونے کا ہم اسی طرح یقین رکھتے ہیں جس طرح اُن چیزوں کے وجود کا جو ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً ہمیں ہندوستان اور برازیل کے موجود ہونے کا یقین ہے حالانکہ ہم نہ وہاں گئے نہ ہم نے انھیں دیکھا۔ سکندرِ اعظم نے ایران فتح کیا تھا یا ولید بن عبدالملک نے جامع اموی تعمیر کرائی تھی، دونوں ایسی باتیں ہیں جن کا ہمیں یقین ہے جبکہ نہ ہم سکندر کے ہمراہ ان جنگوں میں شریک ہوئے تھے اور نہ ہم نے جامع اموی کو تعمیر ہوتے دیکھا۔

دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ اگر بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جن باتوں کے وجود پر ہم یقین رکھتے ہیں ان میں اَن دیکھی چیزوں کی تعداد یا مقدار دیکھی ہوئی چیزوں سے کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً دُنیا کے بے شمار ملک اور شہر یا مختلف تاریخی حوادث و واقعات جو گزشتہ زمانے میں ہو چکے ہیں۔ یا اس وقت ہو رہے ہیں۔ آخر ان باتوں اور چیزوں پر کیسے یقین کر لیا جاتا ہے جبکہ ان کا ادراک ہم نے اپنے حواس کے ذریعہ نہیں کیا؟ یقیناً ہم ان سب باتوں کا اس لیے یقین کر لیتے ہیں کہ انھیں بیان کرنے والے اتنے لوگ ہیں اور انھوں نے یہ باتیں اتنے کثیر لوگوں سے سُن کر بیان کی ہیں کہ عقل عادتاً اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ ان سب لوگوں نے یہ باتیں خود گھڑی ہیں یا یہ سب کے سب غلط بیانی پر متفق ہو گئے ہیں۔ گویا دُوسرا قاعدہ کلیہ یہ ہُوا کہ یقین جس طرح حواس اور مُشاہدے سے حاصل ہوتا ہے اسی طرح اس شخص کی اطلاع سے بھی حاصل ہوتا ہے جس کے سچا ہونے کا ہمیں یقین ہو۔

تیسرا قاعدہ: انسانی حواس کی رسائی کہاں تک ہے؟ کیا ہم اپنے حواس کے ذرائع سے ہر موجود چیز کا ادراک کر سکتے ہیں؟

نفسِ انسانی، حواس اور اس کائنات کے باہم رابطے کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کو ایک قلعہ کے برج میں قید کر کے ہر طرف کے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان بند کر دیے جائیں۔ صرف برج کی مختلف سمتوں میں ایک ایک درز باقی رہنے دی جائے۔ ایک درز مشرق کی طرف ہو جس میں سے وہ صرف اس نہر کو دیکھ سکے جو اس طرف بہہ رہی ہے۔ مغربی جانب والی درز سے صرف اس طرف کا پہاڑ دیکھا جا سکتا ہو۔ شمالی درز میں سے اس طرف بنا ہُوا محل نظر آ سکتا ہو اور جنوبی درز میں سے صرف وہ کھیل کا میدان دیکھ سکتا ہو جو اس جانب واقع ہے۔ اس مثال کی تطبیق اس طرح ہو گی۔

نفسِ انسانی ایک قیدی ہے، یہ جسم قلعہ ہے جس میں اُسے قید کر دیا گیا ہے اور درزیں ہمارے حواس ہیں جن کے ذریعے ہم موجودات کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ دیکھنے کی حس سے صرف رنگوں کی دُنیا میں جھانکا جا سکتا ہے۔ سُننے کی حس سے صرف آوازوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح چکھنے، سُونگھنے اور چھُونے کی حسوں کا اپنا اپنا مخصوص اور محدود دائرۂ محسُوسات ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

۱: کیا ہم نے اپنے حواس سے اس وسیع و عریض کائنات کی تمام ان چیزوں کو محسوس کر لیا ہے۔ جن کا ادراک ان حواس سے ہو سکتا ہے؟ قیدی جب نہر کی سمت والی درز میں سے نہر پر نظر ڈالتا ہے تو وہ پُوری نہر نہیں دیکھ سکتا۔ صرف اتنا حصّہ ہی جو اس کے سامنے ہے اُسے نظر آئے گا۔ بعینہٖ انسانی نگاہ جب عالمِ الوان (رنگوں کی دُنیا) پر پڑتی ہے تو اس کی تمام جزئیات کا احاطہ نہیں کر سکتی صرف چند اجزاء کو دیکھ سکتی ہے۔

تین میل کے فاصلہ پر ایک چیونٹی چل رہی ہے لیکن میں اسے نہیں دیکھ سکتا۔

صاف پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں لاکھوں جراثیم موجود ہیں لیکن ہمیں نظر نہیں آتے۔ ذرّے (ایٹم) کے مرکز کی فضا میں جو کھارب (الیکٹرون) فضائے آسمانی میں سیّاروں کی گردش کی مانند گردش کر رہے ہیں کسی کو نظر نہیں آتے۔ پھر چیونٹی کی آواز بھی ہوتی ہے لیکن کوئی شخص اسے نہیں سُن سکتا۔ اس لیے کہ انسانی کان صرف پانچ ہزار سے بیس ہزار لہروں تک کے ارتعاشات (فریکوینسی) کو محسوس کرتے ہیں۔ پانچ ہزار سے کم لہروں کی سرسراہٹ ناقابلِ سماعت ہے اور بیس ہزار لہروں سے زیادہ کا جھٹکا کانوں کے پردے پھاڑ دیتا ہے۔ ہم شکر کی بُو محسوس نہیں کر سکتے جبکہ چیونٹی اور مکھّی اسے دُور ہی سے سُونگھ کر اس کی طرف لپکتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے حواس اپنے اپنے دائرہ اثر میں آنے والی تمام چیزوں کو محسوس نہیں کر سکتے صرف چند ہی ان کی گرفت میں آتی ہیں۔

نمبر۲ : پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ اس وسیع و عریض کائنات میں محسوسات کے جو دائرے ہم نے فرض کر رکھے ہیں یا جنھیں ہم جانتے ہیں ان کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ مثلاً رنگوں کی دُنیا اور آوازوں کی دُنیا کو تو ہم اپنے محدود حواس کے ذریعہ محسوس کر لیتے ہیں لیکن ان دونوں یعنی رنگ اور آواز کی دُنیاؤں کے درمیان اگر کوئی اور دُنیا بھی موجود ہو تو اُسے ہم کس طرح محسوس کریں گے۔ ہمارے پاس وہ حس ہی موجود نہیں جس کے ذریعہ اس کا ادراک کیا جاسکے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ (مثال مذکورہ بالا میں) قیدی قلعہ کی درزوں میں سے جس نہر اور پہاڑ کو دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں کے مابین کوئی عظیم الشان باغ بھی ہو جسے وہ نہ دیکھ سکتا ہو کیوں کہ اس جانب کوئی درز نہیں ہے۔ اس صُورت میں کیا اُسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس باغ کے وجود سے ہی انکار کر دے کیونکہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتا؟ ایک پیدائشی نابینا سُن کر یہ تو جان سکتا ہے کہ سمندر نیلا ہوتا ہے یا کھیت سبز ہوتے ہیں لیکن وہ نیلے اور سبز

رنگ کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ کہ وہ واقعی کیسے ہوتے ہیں۔ ایک بہرا کتاب ہیں پڑھ کر یہ تو معلوم کر سکتا ہے کہ نغمہ میں زیر و بم، گھات اور سُر تال ہوتے ہیں۔ لیکن نغمہ کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ تو کیا کسی نابینا شخص کو سبز رنگ کے وجود سے اور بہرے کو نغمہ کے وجود سے انکار کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اسے محسوس نہیں کر سکتے۔

آپ کا یہ کمرہ جو آپ کو گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ اس کی فضا میں وہ تمام آوازیں اور نغمے موجود ہیں جو مختلف مراکز سے اس وقت نشر ہو رہے ہیں لیکن آپ محسوس نہیں کر سکتے اس لیے کہ وہ نہ رنگ ہیں کہ آپ انھیں دیکھ لیں اور نہ ایسی آوازیں جنھیں آپ سُن لیں۔ بلکہ وہ کچھ مختلف قسم کی لہریں اور ارتعاشات ہیں، ان میں آواز ضرور موجود ہے لیکن آپ کے کان اسے سُن نہیں سکتے۔ البتہ اگر آپ ریڈیو ریسیور لگا دیں تو یہ آوازیں آپ سُن لیں گے۔

فضا اور موسم کے خفیف تغیرات آپ محسوس نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ آپ کے پاس اس کے ادراک کی حس ہی موجود نہیں لیکن اگر آپ کے پاس "بیرومیٹر" ہو تو آپ انھیں محسوس کر لیں گے۔ فضا میں ہلنے سے ارتعاش کا ادراک آپ کو نہیں ہوتا لیکن راڈار اسے محسوس کر لیتا ہے۔

گویا اس کائنات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے حواس کی پہنچ سے باہر ہیں نہ تو وہ رنگ ہیں کہ دیکھے جا سکیں، نہ آوازیں ہیں جنھیں سُنا جا سکے، نہ ٹھوس اجسام ہیں کہ چھُو کر معلوم کر لیا جائے اور نہ بُو ہیں کہ سُونگھ کر پہچان لیا جائے نہ کھانے کی چیزیں ہیں کہ قوتِ ذائقہ ان کا ادراک کر سکے۔ تو کیا ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم ان کے وجود ہی سے انکار کر دیں کیونکہ ہمارے محدود حواس ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔

نمبر۳ : پھر اپنے حواس کی جو تعداد ہم نے مقرر کر رکھی ہے کیا یہ مکمل ہے؟ پہلے

زمانے کے علماء صرف پانچ حواس سے واقف تھے اور اس تعداد میں اضافے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے لیکن آج کل یہ انکشاف ہُوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ اور حواس بھی انسان کو عطا فرمائے ہیں۔ گویا پہلے زمانے میں جو تعداد مقرر کی گئی تھی درُست نہ تھی حواس کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے اور جس چیز میں کمی بیشی کا امکان ہو وہ نامکمل ہوتی ہے۔ ہم آنکھیں بند کر کے چھُوئے یا دیکھے بغیر اپنی مُٹھی بند کرتے یا کھولتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ مٹھی بند ہے یا کھلی ہے۔ یہ کس حس کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے نئی دریافت کے مُطابق اس حس کا نام حسِ عضلی (پٹھوں کی حس) ہے۔ اسی طرح ہم تھکن، کمزوری، متلی، فرحت اور تکدّر کو کس حس کے ذریعہ محسوس کرتے ہیں۔ یہ محسوسات حواسِ خمسہ (جو پہلے علماء نے مقرر کیے تھے) میں سے تو کسی حس کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔ ان کی دریافت کے لیے ایک اور حس ہے جسے حسِ داخلی کہا جا سکتا ہے۔ ہم چلتے ہیں تو ڈگمگائے بغیر سیدھے چلتے رہتے ہیں۔ لیکن بچّہ جب چلنا شروع کرتا ہے تو ڈگمگاتا اور لڑکھڑاتا ہے۔ اسی طرح سائیکل سوار یا سرکس کے بازی گر جو عجیب عجیب کرتب دکھاتے ہیں کس حس کے ذریعہ اپنا توازن قائم رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ حواسِ خمسہ کے علاوہ مزید ایک حس ہے (آٹھویں حس) جسے حسِ توازن کہا جاتا ہے۔

میں نے کہیں پڑھا ہے کہ سائنس دانوں نے اس حس کا مقام دریافت کر لیا ہے۔ کان کے اندرونی پردے میں قدرت نے ایک سیال مادہ رکھا ہے جس میں یہ حس موجود ہوتی ہے جس سے توازن قائم رہتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تجربہ کے طور پر ایک خرگوش کے کان سے یہ مادہ خارج کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں وہ ڈولتا ہُوا چلتا تھا جیسے نشہ میں چل رہا ہو۔

تو تیسرا قاعدہ یہ ہُوا کہ محض اس بنا پر کہ ہم اپنے ان حواس کے ذریعہ بعض چیزوں کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ ہم ان کے وجود سے ہی انکار کر دیں۔

چوتھا قاعدہ : ہم ثابت کر چکے ہیں کہ انسانی حواس کی رسائی محدود ہے. کیونکہ ہم یہ قدرت نہیں رکھتے کہ اپنی ان آنکھوں سے ہر نظر آسکنے والی چیز کو دیکھ لیں لیکن حواس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ملکہ (قوتِ راسخہ) بھی عطا فرمایا ہے. جس کے ذریعہ ہم حواس کی نارسائی کا مداوا کر سکتے ہیں اور وہ ہے قوتِ خیال (متخیلہ) مثلاً میں اس پر تو قادر نہیں کہ مکّہ میں بیٹھ کر اپنے دمشق والے گھر کو دیکھ لوں لیکن اس کا تصوّر اس طرح کر سکتا ہوں گویا اسے دیکھ رہا ہوں. اس کے معنی یہ ہوئے کہ قوتِ خیال حواس کی تکمیل کرتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قوتِ خیال کی بھی کچھ حدُود ہیں یا یہ مطلقاً آزاد اور لامحدود ہے. کیا کوئی شخص کسی ایسی چیز کو اپنے تصوّر میں متشکل کر سکتا ہے جو اس نے پہلے حواس کے ذریعہ محسوس نہ کرلی ہو۔

علماء نفسیات کے مطابق خیال کی دو قسمیں ہیں، ۱۔ خیالِ "مرتجع" لوٹ کر آنے والا خیال جیسے میرا مکّہ میں بیٹھ کر دمشق والے گھر کا تصور کرنا. اور ۲۔ خیالِ "مبدع" اچھوتا خیال جیسے فن کاروں یعنی شاعروں، افسانہ نگاروں اور مصوّروں کا تخیّل. اب ذرا فن کاروں کے تخیّلات پر غور کیجیے. کیا یہ لوگ واقعی کوئی ایسی چیز لاتے ہیں جس کا وجود باہر کی دُنیا میں نہیں ہوتا. مثلاً جس مُصوّر نے وینس کا مجسمہ تخلیق کیا ہے کیا واقعی اس نے کوئی ایسی شکل بنائی ہے جس سے ملتی جُلتی کوئی صُورت دُنیا میں موجود نہیں اور کیا وہ واقعی بالکل ایک نئی چیز ہے؟ یا اس نے صرف یہ کیا ہے کہ دُنیا میں حقیقتاً موجود چیزوں سے مختلف اجزا لے کر انھیں ایک نئی ترتیب سے باہم مربُوط کر دیا ہے. مثلاً اس نے اپنے مُشاہدے میں جو حسین ترین ناک، مُنھ اور جسم دیکھے تھے انھیں جوڑ کر اس شاہکار میں یکجا کر دیا. اور بطور خود ایک اچھوتی اور نئی چیز بنا ڈالی. لیکن یہ نئی چیز بھی تو انھیں اجزاء سے مرکّب ہے جو پُرانے ہیں، پہلے سے موجود ہیں۔

پیرس کے عجائب گھر میں "آشور" کے "پروں والے بیل" کا جو مجسمہ ہے اس میں بھی فن کار نے صرف یہ کیا ہے کہ انسانی چہرہ بیل کے جسم پر سجا کر پرندے کے پروں کا مزید اضافہ کردیا ہے جس کی وجہ سے وہ واقعی ایک نئی شکل بن گئی ہے۔ لیکن اس کے بھی تمام اجزا قدیم ہیں۔

"قزوینی" کے تخیل نے جو عجیب الخلقت جانور تخلیق کیا ہے۔ یا شعراء استعارہ، تشبیہہ یا کنایہ سے کام لیتے وقت جو حد سے بڑھا ہُوا مبالغہ کرتے ہیں۔ ان تمام صُورتوں میں جو کچھ تخلیق ہوتا ہے وہ صرف اتنا عمل ہے کہ واقعتاً خارج میں موجود مختلف اجزا کو نئی شکل وصورت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی عجیب تر لطیفہ یہ ہے کہ اگر ہم خارج کی دُنیا میں موجود حقیقی اجزا ہی کو باہم ملا جُلا کر کوئی انوکھی چیز بنانے کے سلسلہ میں حد سے زیادہ مبالغے سے کام لیں جس کی بنا پر کوئی انتہائی عجیب وغریب مرکّب وجود میں آجائے تو خود ہمارا تصوّر اس مرکب کو مشخّص کرنے اور پہچاننے سے عاجز آجائے گا۔ مثلاً ہم ایک جزو رنگوں کی دُنیا سے اور ایک جزو آوازوں کی دُنیا سے لے کر ایک مرکب تیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں گویّے نے ایک نغمہ گایا جو عطرِ گلاب کی مانند خوشبودار تھا یا فلاں عطر کی خوشبو کا رنگ سُرخ ہے۔ اب ذرا ان دونوں کیفیتوں کا قوتِ متخیلہ کے ذریعہ تصوّر کیجیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان کا تصوّر ناممکن ہے۔ حالانکہ یہ سب ایسے اجزاء ہیں جو واقعتاً دُنیا میں موجود ہیں۔

گویا ہم خوشبُودار نغمہ یا سُرخ خوشبو کا نقشہ اپنے تصوّر میں نہیں جما سکتے۔ اسی طرح اجسام کے حجم کے سلسلے لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کے علاوہ کسی چوتھی جہت کا تصوّر[1]

---

[1] یہ جہتیں جن کا ذکر کیا گیا ہے حقیقی جہتیں ہیں اور آئین سٹائن نے زمانے کو جو چوتھی جہت شمار کیا ہے وہ صرف ایک مفروضہ ہے حقیقت نہیں ہے۔ (مصنّف)

نہیں کر سکتے۔ ایسا دائرہ فرض نہیں کر سکتے جس کا محیط نہ ہو۔ ایسے مثلث کا تصوّر نہیں کر سکتے جس کے زاویے نہ ہوں۔ اب غور کیجیے کہ اپنے تصوّر و تخیّل کی اس محدود رسائی اور نارسا وسعت ——— کی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم آخرت یا عالمِ آخرت کی چیزوں کا تصوّر کر سکیں؟ جبکہ وہ جہان ہمارے اس جہان سے یکسر مختلف ہے۔ عالمِ آخرت کے مقابلہ میں ہماری اس دُنیا کی وہی حیثیت ہے جو ہماری اس وسیع و عریض دُنیا کے مقابلے میں ماں کے پیٹ میں پلنے والے بچّے کی مختصر اور محدود دُنیا کی۔ اگر کسی طرح ہم پیٹ میں پلنے والے بچے سے رابطہ قائم کر کے دریافت کر سکیں کہ کائنات کیا ہے۔ اور وہ جواب دے سکے تو یقیناً کہے گا کہ یہ پردے جن میں لپٹا ہُوا ہوں اور یہ تاریکی جو مجھے گھیرے ہُوئے ہے یہی کل کائنات ہے۔

اور اگر اُسے بتایا جائے کہ ایک دُنیا اور بھی ہے جس میں دن، رات، چاند، سُورج بحر و بر، میدان اور پہاڑ ہیں، بے آب و گیاہ صحرا اور گھنے باغات ہیں تو وہ ان باتوں کے معنی ہی نہ سمجھ پائے گا اور اگر سمجھ لے گا تو ان کی حقیقت اور کیفیت کا تصوّر کرنے سے قاصر رہے گا

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے جو فرمایا ہے کہ "اس دُنیا میں عالمِ آخرت کی اشیاء کے صرف نام ہی ہیں"۔ اس سے یہی بات مُراد ہے۔ یعنی نہ تو وہاں کی شراب، شرابِ دُنیا کی مانند ہے اور نہ جنّت کی حُوریں اس دُنیا کی عورتوں سے مماثل ہیں، نہ جہنم کی آگ دُنیاوی آگ سے مشابہ ہے اور نہ جہنم کے اوپر بنے ہوئے جس راستے (صراط) کا ذکر ہے وہ ہماری دُنیا کی نہروں اور جوہڑوں پر بنے ہُوئے پُل کی مانند ہے تو چوتھا قاعدہ یہ ہُوا کہ انسانی تصوّر و تخیل ان چیزوں کے علاوہ جو حواس کے دائرۂ ادراک میں آتی ہیں کسی اور چیز کی گرد بھی نہیں پا سکتا۔

پانچواں قاعدہ : جب ہماری آنکھ پانی کے گلاس میں پڑی ہوئی سیدھی لکڑی کو ٹیڑھا دیکھتی ہے تو عقل اس سے دھوکہ نہیں کھاتی بلکہ وہ سمجھ لیتی ہے، کہ لکڑی سیدھی ہی ہے۔ اسی طرح جب صحرا میں ریت پانی دکھائی دیتی ہے تو عقل جان لیتی ہے کہ وہ سراب ہے پانی نہیں بلکہ ریت ہے۔ اسی طرح جب ہم سرکس میں شعبدہ باز کو اپنے مُنھ میں سے سَو رومال نکالتے یا آستین میں سے بیس خرگوش برآمد کرتے دیکھتے ہیں تو عقل سمجھ لیتی ہے کہ یہ فریبِ نظر ہے گویا عقل کا فیصلہ زیادہ درست اور حقیقت کے قریب ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عقل ہر بات کے بارے میں فیصلہ دے سکتی ہے اور اس کی رسائی کی کوئی انتہا نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عقل کسی بھی چیز کا ادراک صرف اس وقت کر سکتی ہے جب وہ دائرۂ زمان و مکان کے اندر ہو۔ جو چیز اس دائرہ سے باہر ہے عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

مثلاً تاریخ کا پروفیسر آپ سے کہتا ہے کہ عرب اور ایران کے درمیان ایک جنگ ہوئی تھی لیکن یہ جنگ نہ تو اسلام سے پہلے ہوئی نہ بعد میں بلکہ زمانے کے ادوار میں سے کسی دَور میں نہیں ہوئی لیکن ہوئی ضرور۔ تو آپ نہ تو اس کی بات کو سمجھ سکیں گے اور نہ کہنے والے کا یقین کریں گے اور نہ اس بات کو تسلیم کریں گے یا جغرافیہ کا استاد آپ سے کہے کہ ایک ملک ہے جو نہ تو میدان میں ہے نہ کوہستان میں نہ خشکی میں نہ تری میں، نہ زمین پر نہ آسمان پر، بلکہ جگھوں میں سے کسی جگہ نہیں ہے۔ لیکن ہے ضرور، تو اس بات کو بھی نہ آپ سمجھ پائیں گے نہ کہنے والے کو سچّا سمجھیں گے اور نہ اس کی بات مانیں گے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عقل صرف ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہے جو زمان و مکان کی حدود کے اندر ہیں اور جو باتیں یا چیزیں ان حدود سے باہر ہیں۔ مثلاً رُوح کے

مسائل تقدیر کے معاملات اللہ تعالٰے کی قدرتیں اور اس کی صفات وغیرہ عقل ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی۔

پھر ایک بڑی واضح بات یہ ہے کہ عقلِ انسانی محدود ہے اور کوئی محدود چیز غیر محدود کے بارے میں نہ تو کوئی فیصلہ دے سکتی ہے اور نہ اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ جنّت میں مومنوں کا ہمیشہ رہنا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ایک مومن کی عقل پُورا ایمان رکھتی ہے اور یہ یقین اسے اس بنا پر ہے کہ اُسے یہ خبر ایک سچے ذریعہ سے ملی ہے۔ لیکن قطع نظر اس سے غور کیجیے کہ کیا آپ کی عقل ہمیشہ رہنے کا کوئی مفہوم سمجھتی ہے؟ ذرا اس بات کو سوچنے کی کوشش کیجیے! آپ محسوس کریں گے کہ آپ جنّت میں رہنے کا تصوّر ایک دو صدیاں چلیے سو صدی، دس لاکھ صدی یا ایک ارب صدی کر لیں گے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ عقل تھک کر سوچنے سے عاجز آ جائے گی اور سوال کرے گی، اس کے بعد اور کیا؟ دراصل وہ یہ چاہے گی کہ اس کی کوئی انتہا طے پا جائے۔ اس لیے کہ لا انتہا کا تصور عقل نہیں کر سکتی۔ اور اگر عقل کا لا انتہا تک پہنچنا فرض کیا جائے گا۔ تو "تناقض" یعنی اجتماع ضدّین لازم آئے گا۔ (یہ ماننا پڑے گا کہ عقل محدود بھی ہے اور لا محدود بھی۔ گویا ایک چیز میں دو متضاد صفتیں جمع ہو گئیں) اور یہ بات خود عقل کے لحاظ سے باطل ہے۔

جرمن فلسفی "کانٹ" کی ایک مشہور کتاب ہے جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عقل صرف اس مادی عالم کے بارے میں فیصلے کر سکتی ہے۔ غیر مادی عالم اس کی رسائی سے باہر ہے لیکن ——— جو کچھ اس نے اب کہا ہے ہمارے فلاسفر اس سے بہت پہلے ان تمام مسائل کو چھان پھٹک چکے ہیں۔ اور اس انداز میں ثابت کر چکے ہیں کہ یہ باتیں انتہائی واضح اور مسلم الثبوت قرار پا چکی ہیں اب ان کے سلسلے میں جب بھی گفتگو ہوتی ہے، ایک رسمی انداز کی گفتگو ہوتی ہے۔ اس میں کوئی

نُدرت یا عجیب بات باقی نہیں رہی۔ یہاں تک کہ "کانٹ" کے "متناقضات" جو بہت مشہور ہیں انھیں بھی ہمارے علماء پہلے ہی طے کر چکے ہیں اور انھوں نے دو اور دو چار کے حسابی انداز میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ "دور" اور "تسلسل" باطل ہے۔ ان کی سب سے واضح اور عام فہم دلیل یہ ہے کہ آپ فرض کیجیے کہ شکل مندرجہ ذیل میں نقطہ "م" سے دو شعاعیں خارج ہو رہی ہیں۔ یعنی دو سیدھے خط ایک دوسرے سے فاصلے پہ چلے جا رہے اور فرض کیجیے کہ ان دونوں کی لمبائی لانہایہ تک جاتی ہے جس کے لیے آپ یہ نشان (ص) مقرر کرتے ہیں۔ اب ان دونوں خطوط کے درمیان آپ مساوی فاصلہ پر عرضاً خطوط بناتے چلے جاتے ہیں ب ج ۔ بٗ جٗ ۔ بٓ جٓ ۔ اسی طرح آپ ان (ص ۔ ص) نشانوں کے خط تک پہنچ جاتے ہیں۔ اب یہ خط جو ان نشانوں کے درمیان ہے محدود ہوا یا لامحدود۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ محدود ہے تو یہ کہنا غلط ہوگا۔ اس لیے کہ ہم نے فرض کیا تھا کہ اس کی کوئی انتہا نہیں اور اگر آپ کہتے ہیں کہ لامحدود ہے تو بھی درست نہیں اس لیے کہ وہ دو نقطوں کے درمیان ہے، پھر غیر محدود کیسے ہوا تو گویا وہ محدود بھی ہوا اور غیر محدود بھی، اور یہ "تناقض" یا اجتماعِ ضدین ہے جو باطل ہے۔
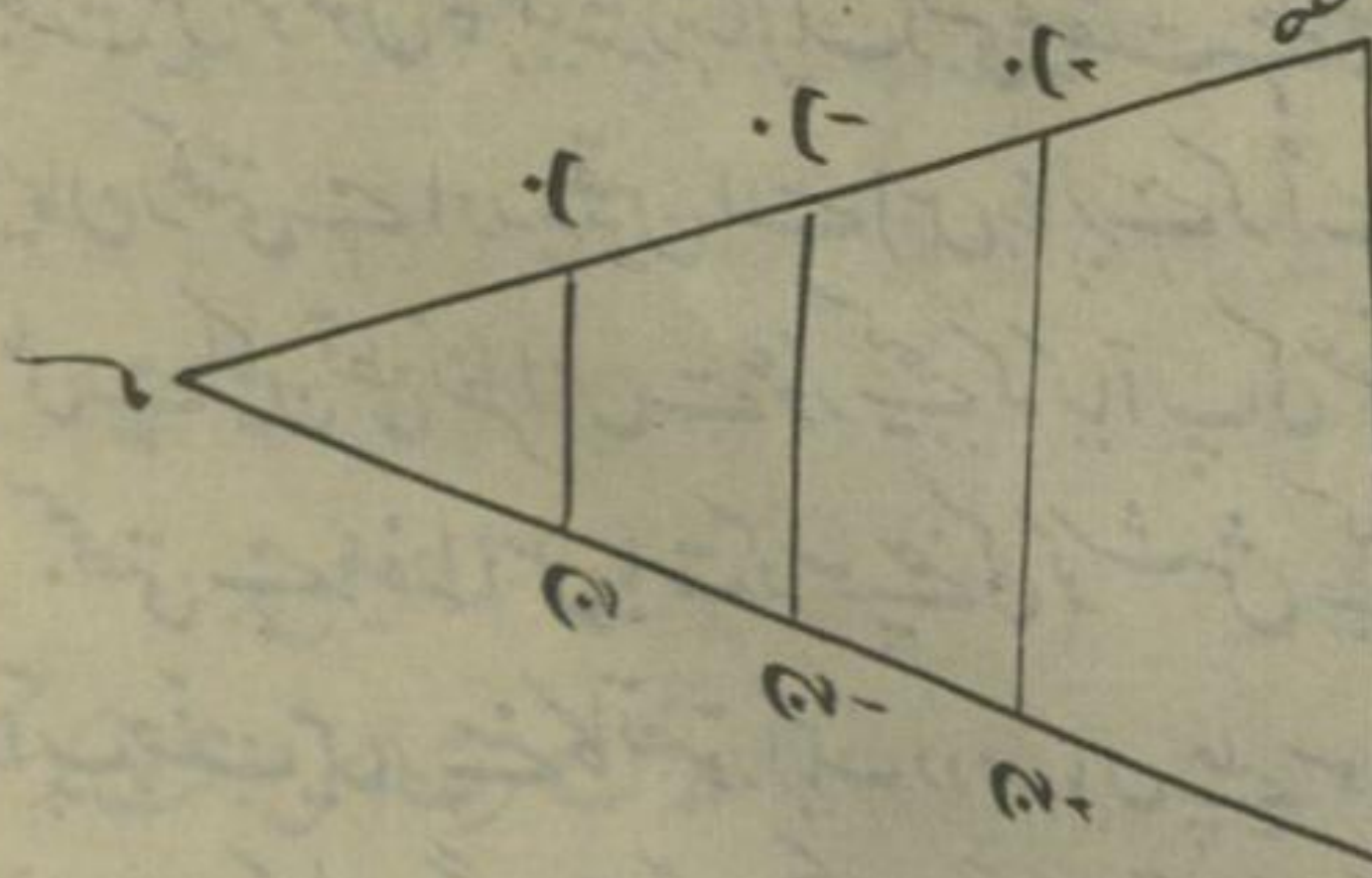
گویا یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ جب عقل (جو خود محدود ہے) غیر محدود اور لامتناہی پہ حکم لگانے کی کوشش کرتی ہے تو اس کا حساب درست نہیں بیٹھتا۔ میزان میں گڑبڑ ہو جاتی ہے اور "تناقض" میں مبتلا ہو جاتی ہے جو محال ہے۔ گویا ایسی صورت میں عقل کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی اس کا فیصلہ صرف مادی اور محدود

معاملات میں ہی درست ہو سکتا ہے۔ ماورائی مسائل اور امورِ غیبیہ (میٹا فزکس) پر فیصلہ دینے کا اختیار عقل کے پاس نہیں ہے۔ یہی وہ بات ہے جو "کانٹ" نے اپنی کتاب میں ثابت کی ہے اور جو ہمارے علماء بہت پہلے کہہ چکے ہیں اور "سید شریف رضی" کی "شرح المواقف"، "امام غزالی" کے رسالہ "المقصد الاسنیٰ"[1] اور علم الکلام کی دیگر کتب میں پوری شرح و بسط سے موجود ہے۔

چھٹا قاعدہ: تمام انسان مومن ہوں یا کافر، عبادت گزار ہوں یا فاسق و فاجر اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں اور مایوسی اس انتہا کو پہنچ جائے کہ اس مصیبت سے چھٹکارے کی کوئی تدبیر کارگر نہ رہے تو ایسی حالت میں مصیبت زدہ شخص اس دنیا کی کسی مادی چیز کی پناہ تلاش نہیں کرتا بلکہ وہ کسی ایسی قوت کی پناہ چاہتا ہے جو اس کائنات سے ماورئی ہو جسے وہ دیکھ تو نہیں سکتا لیکن اس کی روح، اس کا دل، اس کے جسم کا ہر پٹھا اس

---

[1] رسالہ "المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ" تیس۳۰ سال تک میری لائبریری میں موجود رہا لیکن مجھے اسے پڑھنے کا خیال نہ آیا لیکن پھر جب میں نے اسے پڑھا تو اسے امام غزالی کے کمالات کا عجیب و غریب مرقع پایا۔ امام نے اس کتاب میں اسم اور مسمیٰ اور ان کے باہمی ربط و تعلق کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اور اسماء باری تعالیٰ اور مسلمانوں کے طرز و روشِ حیات کے مابین ایک بالکل نئے اور اچھوتے انداز میں رابطہ پیدا کیا ہے۔ امام غزالی کا یہ منفرد انداز ان کی ہر تصنیف میں خواہ وہ کسی موضوع پر ہو موجود ہے اگرچہ ان کی عظیم کتاب "احیاء العلوم" میں تصوّف کی بہت سی خلافِ سنّت باتیں اور بہت سی بے بنیاد حدیثیں بھی موجود ہیں۔ ان باتوں کا اثر پڑھنے والوں پر یہ پڑتا ہے کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر گمنامی کی زندگی اختیار کرلیں۔ اور سخت کوشی اور جہاد کی روح سے متنفر ہو جائیں۔ حالانکہ انھوں نے یہ کتاب صلیبی جنگوں کے دور میں تصنیف کی ہے جب ہر مسلمان مرد و زن پر جہاد اسی طرح فرض تھا جس طرح آج تمام مقبوضہ علاقوں کے مسلمانوں پر کافروں کو وہاں سے نکالنے کے لیے جہاد فرض ہے۔ (مصنف)

کے موجود ہونے کی گواہی دیتا ہے اور اس کی عظمت وجلال کا احساس رکھتا ہے۔ یہ کیفیت امتحان کے دنوں میں اکثر طالب علموں پر اور درد و مرض کی شدت اور چارہ گروں کی بے بسی کے وقت مریضوں پر طاری ہوتی ہے۔

ایسے موقعہ پر یہ سب اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی اپنے آپ سے یہ دریافت کیا کہ اس کیفیت یا اس سے ملتی جلتی کیفیات کا سبب کیا ہے؟ آخر کیوں ہر شخص جو کسی لاعلاج مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے؟ ہم میں سے بہت سے ادھیڑ اور عمر رسیدہ لوگوں کو خوب یاد ہو گا کہ گزشتہ جنگِ عظیم میں اور اس سے پہلی بڑی جنگ کے دنوں میں لوگ کس طرح دین کی طرف متوجہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ سردار اور قائدین خود بھی عبادت گاہوں میں جایا کرتے تھے اور اپنے سپاہیوں کو بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرتے تھے۔

میں نے ماہنامہ "المختار" میں جو "ریڈرز ڈائجسٹ" کا عربی ترجمہ ہے، ایک مضمون پڑھا تھا جو ایامِ جنگ میں ایک پیراٹروپر نے لکھا تھا (یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ ابھی پیراشوٹ اور اس کے ذریعے اُترنے کی ابتداء ہوئی تھی) وہ لکھتا ہے کہ میری پرورش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جس میں اللہ کو یاد کرنے اور نماز پڑھنے والا ایک فرد بھی نہ تھا تعلیم بھی ایسے مدارس میں حاصل کی جن میں نہ دینی تعلیم کا انتظام تھا نہ مذہب سے لگاؤ رکھنے والا کوئی استاد۔ پوری زندگی مادی اور میکانکی انداز میں گزری جیسے کوئی حیوان زندگی بسر کرتا ہے صرف کھانا پینا اور امتیاز خیر و شر کے بغیر جنسی جبلت کو پورا کرنا۔ اس کے باوجود وہ جب پہلی دفعہ پیراشوٹ کے ذریعے کودا اور چھتری کھلنے سے پہلے خود کو فضا میں گرتے ہوئے پایا تو بے ساختہ اس کی زبان پر "یا اللہ" اور "یارب" کے الفاظ جاری ہو گئے اور دل میں دعا مانگ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس میں یہ ایمان کہاں سے آگیا تھا۔

شالین کی بیٹی نے حال ہی میں اپنی یادداشتیں شائع کی ہیں جن میں اس نے بتایا ہے کہ کس طرح وہ مذہب کی طرف رجوع ہُوئی جبکہ وہ ایسے ماحول میں پلی تھی جو پُوری طرح الحاد اور بے دینی میں ڈُوبا ہُوا تھا وہ خود اپنے اس انقلاب پر حیران ہے حالانکہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں. باری تعالیٰ کے وجود پر ایمان ایک ایسی کیفیت ہے جو ایک فطری جبلّت کی طرح نفسِ انسانی میں موجود ہے جس طرح جنسی جبلّت فطری ہے گویا انسان کی ایک تعریف "حیوان دین دار" بھی ہے.

لیکن انسان کی اس فطرت کو کبھی کبھی دُوسرے جذبے شہوت، لالچ، مرغوب چیزوں کا میلان اور مادی زندگی کے حیوانی تقاضے اپنے پردے میں چھپا لیتے ہیں لیکن پھر جب کوئی مصیبت، خطرہ یا کوئی ہولناک حادثہ تحریک پیدا کرتا ہے تو یہ پردہ اُٹھ جاتا ہے اور یہ جبلّت پوری طرح اُبھر کر غالب آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص ایمان و یقین کی کیفیت سے خالی ہو اُسے کافر کہا جاتا ہے. عربی زبان میں کافر چھپانے والے کو کہتے ہیں اور عجیب بات ہے مجھے اپنے اس استدلال کی تائید دو مختلف شخصیتوں کے دو ایسے مقولوں میں ملی ہے جو زمان و مکان اور موقع اور مقصد کے لحاظ سے ایک دُوسرے سے بہت دُور ہیں. لیکن معنی اور مفہوم کے لحاظ سے بہت قریب. ان میں سے ایک حضرت "رابعہ عدویہ" (بصری) کا قول ہے جو مشہور مسلمان عابد و زاھد خاتون تھیں اور دُوسرا ایک مشہور فرانسیسی ملحد "اناتول فرانس" کا مقولہ ہے. اناتول اپنے کفر و الحاد کے باوجود ایک جگہ لکھتا ہے کہ: "جب کسی شخص کو اپنے پیشاب کے تجزیے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے ذیابیطس ہے تو وہ صاحب ایمان ہو جاتا ہے" (یہ اُس زمانے کی بات ہے جب انسولین دریافت نہیں ہوئی تھی) اور محترمہ رابعہ بصری سے کسی نے بیان کیا کہ فلاں عالم نے وجودِ باری تعالیٰ ثابت کرنے کے لیے ایک ہزار دلیلیں دی ہیں. آپ نے ہنس کر فرمایا صرف ایک دلیل کافی ہے. دریافت کیا وہ

کیا؟ آپ نے فرمایا اگر تم صحرا میں تنہا چلے جا رہے ہو اور پاؤں پھسلنے کی وجہ سے کوئیں میں گر جاؤ اور نکلنے کی صورت کوئی نہ ہو تو تم کیا کرو گے ؛ اس نے کہا کہ اپنے اللہ کو پکاروں گا۔ آپ نے فرمایا بس یہی وہ دلیل ہے۔

ہر انسان کے دل کے اندر کسی اَن دیکھے معبُود پر ایمان ویقین کا موجود ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہم مسلمان تو اس لیے واقف ہیں کہ ہمیں خود اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے. کہ ایمان وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے لیکن فرنگیوں کو یہ حقیقت حال ہی میں معلوم ہوئی ہے. فلسفہ اجتماع کے مشہور فرانسیسی ماہر پروفیسر "ڈور کایم" نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ کے وجود پر ایمان ایک انتہائی واضح حقیقت ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس دنیا میں زندہ رہے اور اس کائنات کے لیے کسی معبُود کے موجود ہونے کے بارے میں غور وفکر کیے بغیر مر جائے۔

یہ علیٰحدہ بات ہے کہ نارسائیِ عقل کی وجہ سے وہ معبودِ برحق کو نہ دریافت کر سکے اور غیر اللہ کی پرستش کرتا رہے لیکن جس کی بھی پرستش کرے گا اسی گمان کے ماتحت کرے گا کہ یہی حقیقی معبود ہے یا اس مغالطے میں کہ یہ پرستش الٰہِ برحق سے قرب کا ذریعہ ہے۔

پھر خطرے کے وقت جب انسانی کوششوں کی انتہا ہو جاتی ہے اور بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو انسان بتوں کو چھوڑ کر اللہ (الٰہ حقیقی) کی طرف رجوع کرتا ہے۔

قریش "ہُبل"، "لات" اور "عزیٰ" کی پرستش کرتے تھے یہ سب پتھر کے بُت تھے ان میں ہُبل عقیق کا تھا جسے "عمرو بن لُحَیّ" ہمارے علاقہ "الحمۃ" سے لے گیا تھا۔ (یہ وہی مقام ہے جہاں معدنی چشمے ہیں) لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ یہ بہت بڑا

خُدا اور بڑی قدرت کا مالک ہے۔ چنانچہ عمرو اسے اُونٹ پر لاد کر لے چلا۔ اثنار راہ میں یہ بُت اُونٹ سے گر گیا اور اس کا ایک بازُو ٹوٹ گیا تو اس کی جگہ سونے کا بازُو لگا دیا گیا۔ ملاحظہ کیجیے! خدا جس کا بازُو ٹوٹ گیا یہ لوگ اس کی عبادت کرتے رہے لیکن اس کی عبادت صرف امن کے زمانے میں ہوتی تھی۔ جب سمندری سفر کے دوران طوفان آجاتا اور ڈوبنے لگتے اس وقت انھیں "یا ہُبل" یاد نہیں آتا تھا بلکہ اس وقت یا اللہ کہتے تھے۔

ابتدار آفرینش سے آج تک یہ بات مُشاہدہ میں آتی رہی ہے کہ جب جہاز ڈُوبنے لگتا ہے یا آگ قابُو سے باہر ہو جاتی ہے یا کوئی شدید خطرہ درپیش ہوتا ہے یا مرض حد سے بڑھ جاتا ہے تو ملحد اور منکر لوگ بھی مذہب کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں۔

آخر ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ایمان ایک جبلّت ہے۔ انسان پر سب سے زیادہ صحیح صادق آنے والی تعریف یہ ہے کہ وہ حیوان متدیّن (دین دار حیوان) ہے۔ ذرا ان مادہ پرست ملحدین کی وقتِ نزع حالت پر غور کیجیے، آپ کا کیا خیال ہے: "مارکس" اور "لینن" کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا ہو گا تو کیا انھوں نے "وسائل پیداوار" (جس پر یہ لوگ زندگی بھر بحثیں کرتے رہے) کو پُکارا ہو گا۔ یا اللہ کو پکارا ہو گا۔ آپ یقین کیجیے یہ لوگ اس وقت تک نہیں مر سکے ہوں گے۔ جب تک انھوں نے اللہ کو یاد نہیں کر لیا ہو گا۔ لیکن اس وقت کا یاد کرنا بیکار تھا۔ فرعون نے ساری زندگی کبر و جبر میں گذاری۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ النازعات (۲۴) "میں ہی تمھارا سب سے بڑا رب ہوں" کا دعویٰ کیا لیکن جب ڈوبنے لگا تو پکار اُٹھا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ یونس (۹۰) "میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سرِ اطاعت

جھکا دینے والوں میں ہوں"۔

عشق و محبّت کا جذبہ جسے صرف دو محبت کرنے والے دل ہی محسوس کر سکتے ہیں اس میں بھی اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ ایمان نفسِ انسانی کی فطرت ہے۔ محبّت ایمان کی ایک چھوٹی سی مثال اور عبادت کی ایک قسم ہے فرانسیسیوں نے جب ان پر لادینی کا غلبہ تھا محبت کے لیے عبادت کا لفظ استعمال کیا تھا اور ہم میں سے بعض مغرب زدہ اذہان نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی تھی اور اپنے افسانوں اور ناولوں میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کہ "وہ اس سے محبت کرتا تھا اور اس کی پرستش کرتا تھا"۔ یا "میں نے اس سے اتنی محبت کی کہ اسے پوجنے لگا" اور ان لوگوں نے یہ اس لیے لکھا کہ دراصل عبادت ہی کسی معبود پر ایمان لانے کا فطری اظہار ہے اور محبّت میں ایمان سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

عاشق اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے اور اپنا جذبۂ شوق بہ تمام و کمال اس کے لیے صرف کر دیتا ہے۔ یہی انداز ایک مومن کا اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ عاشق سے اگر اس کا محبوب راضی رہے اور ساری دُنیا ناراض ہو جائے تو اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ یہی حال مومن کا اللہ تعالےٰ کے معاملہ میں ہے۔ عاشق اپنے محبوب سے خائف رہتا ہے اور اس کے ناراض ہونے سے ڈرتا ہے اور محبوب کی طرف سے جو کچھ بھی ہو اس پر راضی رہتا ہے۔ یہی کیفیت مومن کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے چنانچہ جذبۂ عشق اس بات کا ثبوت ہے کہ ایمان انسان کی جبلّی فطرت ہے۔

تنگنائے الفاظ:

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی محبت معشوق سے محبّت کی ہی ایک قسم ہے، ہرگز نہیں! عاشق اگر معشوق کی اطاعت کرتا ہے یا اس سے ڈرتا ہے یا اس کی ہر بات پر خوش ہوتا ہے، اس کی پسند اور رضا کو سب لوگوں کی خوشنودی پر

ترجیح دیتا ہے تو وہ یہ سب کچھ اپنے لطف و لذت کے لیے کرتا ہے. گویا اس کے پردے میں اپنی ذات سے محبت کرتا ہے. اگر کہیں لیلیٰ کو جذام لاحق ہو جاتا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ بدشما ہو جاتا اور آنکھیں اور ناک گل سڑ جاتیں تو قیس عامری (مجنوں) اس کے قریب بھی نہ جاتا اس کا عشق بھول جاتا بلکہ اس سے بھاگ کر دُور چلا جاتا. خالق سے محبت اور مخلوق سے محبت کے مابین یہی فرق ہے. یہ دونوں محبتیں ایک دُوسرے سے یکسر مختلف نوعیت کی ہیں لیکن انسانی الفاظ اپنی تنگ دامانی کی وجہ سے رُوحانی معانی کو اپنے اندر سمیٹنے سے قاصر رہتے ہیں اس لیے ایک ہی لفظ کو مجبوراً متعدد معانی کے لیے استعمال کرنا پڑتا ہے. مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کوہستانی مناظر سے محبت کرتا ہے یا فلاں شخص علمِ تاریخ سے محبت کرتا ہے، فلاں شخص چاول گوشت کے ساتھ کھانا محبوب رکھتا ہے، باپ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے، مجنوں لیلےٰ سے محبت کرتا ہے اور مومن اللہ سے محبت کرتا ہے. ان تمام فقروں میں لفظِ محبت ایک دوسرے سے یکسر مختلف معانی میں استعمال ہو رہا ہے. اسی طرح لفظِ "جمال" ہے جو ہزاروں مختلف معانی کے لیے بولا جاتا ہے. اسی طرح ہم کبھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے اور کبھی بولتے ہیں کہ فلاں شخص سمیع و بصیر ہے. جس کے معنی ہوتے ہیں کہ وہ اندھا بہرہ نہیں. ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کا سمیع و بصیر ہونا کسی بندے کے سمیع و بصیر ہونے سے مشابہ نہیں ہو سکتا. ذاتِ باری تعالیٰ خود مخلوقات میں سے کسی سے مشابہ نہیں ہے اور مخلوق میں کوئی چیز اس سے مشابہ نہیں ہے. قرآن مجید میں صفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق جتنی آیات ہیں وہ سب اسی ذیل میں آتی ہیں. ارشادِ باری ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۔ الشوریٰ (۱۱) اسے کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی.

ساتواں قاعدہ:

انسان اپنے باطنی شعور کے ذریعے یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ مادی دُنیا ہی سب کچھ نہیں. اس سے ماوریٰ بھی ایک رُوحانی دُنیا موجود ہے جس کی حقیقت ہم نہیں جانتے

البتہ اس کی چند جھلکیاں کبھی کبھی دیکھ لیتے ہیں جو اس کے موجود ہونے کا پتہ دیتی ہیں.
مثلاً انسان دیکھتا ہے کہ مادی لذتیں ایک حد پہ پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں یعنی جب مادی لذت اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو لذت نہیں رہتی عادت بن جاتی ہے۔ ان کا کیف زائل ہو جاتا ہے اور جادو ٹوٹ جاتا ہے اور ایک عام اور معمول کی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔
ایک مفلس شخص کسی دولت مند کی کار سرِ راہ گزرتے دیکھتا ہے. یا کسی عالیشان کوٹھی کے قریب سے گزرتا ہے تو دل میں خیال کرتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اگر اسے مل جائیں تو عیش ہو جائے پھر جب یہ چیزیں اسے مل جاتی ہیں

تو اسے ان کی اہمیت کا زیادہ احساس نہیں رہتا. عاشق رات رات بھر جاگ کر وصل محبوب کے خواب دیکھتا ہے، وہ دُنیا کی سب سے بڑی دولت محبوب کے پیار کو سمجھتا ہے، اس کی تمام آرزوؤں کا ماحصل قربِ حبیب ہوتا ہے لیکن جب اسی محبوب سے شادی کر لیتا ہے اور رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے دو سال گزر جاتے ہیں تو وہ آرزوئیں دم توڑنے لگتی ہیں اور جن مسرتوں اور راحتوں کا تصوّر کیا کرتا تھا سب فنا ہو جاتی ہیں۔ اب اس کے پاس صرف ان کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔
کوئی شخص بیماری میں درد اور تکلیف سے بے چین ہوتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ اگر اس درد سے نجات مل جائے اور میں تندرست ہو جاؤں تو دُنیا کی ہر راحت میسّر آ جائے لیکن جب تندرست ہو جاتا ہے اور بیماری کے دنوں میں جو کچھ بیتا تھا وہ بھُول جاتا ہے تو اسے صحت میں وہ لطف و لذّت جس کا تصوّر کیا کرتا تھا محسوس نہیں ہوتی۔ نوجوان شہرت کی آرزو کرتا ہے اور جب پہلی بار کسی نشریاتی مرکز سے اس کا نام نشر ہوتا ہے یا اخبار میں اس کی تصویر آتی ہے، انتہائی خوشی محسوس کرتا ہے لیکن جب یہی شخص شہرت کی بلندیوں کو چھُو لیتا ہے، اس کا نام سب کے لیے گوش آشنا

اور شخصیت جانی پہچانی بن جاتی ہے تو شہرت اس کے لیے ایک رسمی اور معمول کی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ لطف و لذّت مفقود ہو جاتے ہیں۔

انسان جب کسی سنسان اور خاموش رات میں کسی دل فگار مغنّی کا کوئی خواب آگیں نغمہ سُنتا ہے جس کے اثر سے دل پہلو میں پھڑک اُٹھتا ہے اور سُننے والا کسی رُوحانی دُنیا میں پرواز کرنے لگتا ہے یا جب کسی باکمال مصنّف کا شاہکار ناول پڑھتا ہے، اور محسوس کرتا ہے کہ وہ مصنّف کے ساتھ کسی جادُو کی نگری میں پھر رہا ہے، جہاں شعر و نغمہ کی مہک ہے اور سحر کے رنگ بکھرے ہُوئے ہیں اور جب ناول ختم ہو جاتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ کسی سحر انگیز اور پُر لطف خواب سے بیدار ہُوا ہے لیکن جب اسی لطف و کیف کے حصول کے لیے اسی ناول کو پھر پڑھنے کی بے کار کوشش کرتا ہے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح کبھی کبھی جب غور و فکر کرتے کرتے دل مادی آلائشوں سے پاک ہو کر سبکسار ہو جاتا ہے اور صفاء قلب اور لطافتِ رُوح کے پروں پر پرواز کرتا ہُوا ایسی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے کہ پوری کائنات اس کے لیے لائقِ التفات نہیں رہتی۔ اس وقت جلوہ ہائے حسنِ ازل کی جھلکیاں اس کے قلب و نظر کو خیرہ کرتی ہیں اور وہ ایک ایسے رُوحانی کیف و سُرور سے آشنا ہوتا ہے جس کے مقابلے میں وہ لذّت و مسرّت بے معنی اور بے حیثیت ہے جو کسی بھُوکے کو کھانا ملنے پر یا عاشقِ مہجور کو وصالِ محبوب سے یا مفلس درماندہ کو مال و جاہ کے حصول سے ہوتی ہے۔

اور چونکہ نفسِ انسانی اس ماورائی رُوحانی عالم اور اَن دیکھے جہاں کا سدا مشتاق رہتا ہے جس میں سے اسے سوائے ان چند جھلکیوں کے جو نظر آنے سے پہلے اوجھل ہو جاتی ہیں یا خوشبو کے اُن چند جھونکوں کے جو آنے سے پہلے ساکن ہو جاتے ہیں اور کچھ نہیں ملتا۔ اس لیے اس نے یہ بات سمجھ لی ہے کہ مادی لذّتیں محدود اور فنا پذیر ہیں اور رُوحانی کیف و سُرور اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع اور تاثر کے

لحاظ سے دیرپا ہے اور اسی وجہ سے نفسِ انسانی عقل و دلیل سے نہیں اپنے شعور باطنی کی ذہانت سے اس بات پر پُورا یقین رکھتا ہے کہ یہ مادی دُنیا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ بلکہ وہ نامعلوم جہان جو اس مادی عالم کے پسِ پردہ پوشیدہ ہے ایک ایسی لازوال حقیقت ہے جس کی طرف رُوح لپکتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُڑ کر وہاں پہنچ جائے لیکن اس کا یہ جسمِ کثیف درمیان میں حائل ہو جاتا ہے اور اس کے وہاں تک پہنچنے اور نظارہ کرنے میں مانع رہتا ہے۔ یہی وہ داخلی اور نفسیاتی دلیل ہے جو ایک اُخروی عالم کے موجود ہونے کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔

آٹھواں قاعدہ:

اُخروی زندگی پر ایمان ذاتِ باری تعالیٰ پر ایمان لانے کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ اس دُنیا کے حالات و کوائف پر غور و فکر کرنے والا شخص دیکھتا ہے کہ یہاں ایک شخص ساری زندگی ظلم و ستم کرتا رہتا ہے اور اسی حالت میں مر جاتا ہے اور دُوسرا پُوری زندگی ظلم سہتے سہتے گزار کر موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور اللہ تعالےٰ جو کہ عادلِ مطلق ہے ظلم گوارا نہیں کر سکتا اور یہ نہیں ہو سکتا کہ ظالم کو سزا نہ ملے اور مظلوم کی داد رسی نہ ہو۔ بنا بریں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ایک اور زندگی ہو جس میں مظلوم کے ساتھ انصاف کیا جائے اور ظالم اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔ نیکی کرنے والے کو جزا ملے اور بدکردار کو سزا۔

دراصل زندگی کی کہانی اس دُنیا کے ختم ہو جانے سے اختتام پذیر نہیں ہو جاتی۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹیلی ویژن پر فلم چل رہی ہو اور اچانک درمیان سے منقطع کر کے کہہ دیا جائے کہ فلم ختم ہو گئی۔ دیکھنے والوں میں سے کوئی شخص اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔ کہ کہانی کے انجام پذیر ہونے سے پہلے فلم ختم ہو گئی۔ سب چیخ اٹھیں گے کہ ہیرو کا کیا بنا اور کہانی کا انجام کیا ہُوا؟ اس لیے کہ ایک مصنّف سے سب یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ داستان کو اختتام تک پہنچائے اور اس کے

کرداروں کا حساب بے باق کرے۔ یہ سب کچھ اس صورت میں متوقع ہوتا ہے۔ جبکہ مصنّف ایک انسان ہو تو کیا کوئی ذی عقل انسان یہ باور کر سکتا ہے کہ زندگی کی داستان جس کا خالق اللہ تعالیٰ ہے موت کے ساتھ ہی ختم ہو جائے جبکہ ابھی کہانی مکمل نہیں ہوئی اور کسی کا حساب نہیں چکایا گیا۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی بنا پر عقل یہ یقین رکھتی ہے کہ اس کائنات کا کوئی رب ضرور ہے اور اس دُنیا کے بعد ایک اور جہاں موجود ہے۔

یہ عالمِ نامعلوم جس کے نُور کی جھلک رُوحِ انسانی خواب آگیں نغموں یا کسی شاہکار ناول میں دیکھتی ہے یا جس کی خوشبُو کا جھونکا تجلّیِ رُوحانی کے وقت محسوس کرتی ہے۔ یہ افلاطون کا اختراع کردہ عالمِ مثال[1] (آئیڈیلزم) نہیں ہے بلکہ یہ عالمِ آخرت ہے جو ایک حقیقت ہے اور جسے افلاطُون کے خالق نے پیدا فرمایا ہے۔ جب انسانی عقل نے دیکھا کہ دنیوی لذتوں میں سے سب سے بڑی لذّت وصلِ محبوب ہے مگر اس کا کیف بھی نصف منٹ سے زیادہ باقی نہیں رہتا تو اس نے محسوس کر لیا کہ یہ دراصل اُخروی لذّت کا چھوٹا سا نمونہ ہے جیسے آپ کھانے میں سے ایک لُقمہ چکھنے کے لیے اٹھاتے ہیں کہ اچھا لگا تو سب لے لیں گے اور پیٹ بھر کر کھائیں گے یا ڈھیر میں سے نمونے کا دانہ ہے جو دیکھنے کے لیے اُٹھایا جاتا ہے کہ اگر پسند آگیا تو سب خرید لیں گے یہ چند سیکنڈ کی لذّت عالمِ آخرت کی ابدی لذتوں کی (جن کے قائم رہنے کی کوئی حد نہیں اور جو سدا لذّت ہی رہیں گی اور کبھی عادت نہ بنیں گی) ایک چھوٹی سی مثال ہے۔

○

---

[1] المثل العلیا (آئیڈیل ازم) افلاطون کا مشہور نظریہ ہے۔ دراصل اسی نظریہ کی بنا پر "شیٔ مثالی" یا "مثالی چیز" کا استعمال زبان زدِ خاص و عام ہوا ہے۔ (مصنّف)

○

- اللہ تعالیٰ اس کائنات کا پروردگار اور ہر چیز کا خالق ہے۔
- اللہ تعالیٰ ہی اس پوری مملکت کا مالکِ حقیقی ہے اور اپنی مرضی سے جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرّف کرتا ہے۔
- صرف اللہ تعالےٰ ہی واحد پرستش کے لائق معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

○

وجود باری تعالیٰ پر ایمان

چار بُنیادیں

ایمان باللہ چار مقدمات پر موقوف ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔

۲۔ صرف وہی اس کُل کائنات کا ربّ ہے۔

۳۔ صرف وہی ایسا مالک و مختار ہے جو اس کائنات میں اپنی مشیت کے مطابق تصرف کرتا ہے۔

۴۔ وہی واحد و یکتا عبادت کے لائق ہے اور عبادت میں کسی دُوسرے کو اس کا شریک نہیں بنایا جا سکتا۔

وُجودِ باری تعالیٰ

ہم پچھلے قاعدہ میں بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کا عقیدہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جسے انسان کسی عقلی دلیل کے ذریعے ماننے سے پہلے ہی اپنے شعور باطنی کی فراست سے سمجھ لیتا ہے اور باوجودیکہ اس عقیدہ کی صحت کے دلائل دُنیا کی ہر چیز میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ یہ محتاجِ دلیل نہیں، اور میں یہاں دلائل پیش بھی نہیں کروں گا اس لیے کہ وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ ناممکن ہے

دمشق کے مشہور عالم "شیخ جمال الدین قاسمی" نے اپنی کتاب "دلائل التوحید" میں اس موضوع پر بے شمار دلائل پیش کیے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ کتاب آج سے تقریباً نصف صدی پہلے لکھی گئی ہے اور آج جدید علوم نے جو پچاس سال پہلے موجود نہ تھے، مزید بے شمار دلائل مہیا کر دیے ہیں۔ جس شخص نے کتاب "اللہ یتجلیٰ فی عصر العلوم" (جو تیس ایسے ماہرین علوم طبیعیات و فلکیات نے مل کر لکھی ہے جن کا مقام ان علوم میں سب سے بلند اور جن کی بات سند کا درجہ رکھتی ہے) اور کتاب "العلم یدعو للایمان" کا مطالعہ کیا ہے اسے یہ بات صاف نظر آ جائے گی کہ جو شخص واقعی عالم ہے وہ مومن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اسی طرح ایک عام آدمی بھی ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ملحد اور کافر صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا علم نصف یا چوتھائی ہوتا ہے جنھوں نے تھوڑا علم حاصل کیا اور اپنے ناقص علم کی وجہ سے اپنی "فطرتِ مومنہ" کو ضائع کر بیٹھے ایمان پیدا کرنے والے علم تک رسائی حاصل نہ کر سکے اور کفر میں مبتلا ہو گئے۔

ان دونوں کتابوں میں ایسے مقالات ہیں جو ان علماء کے غور و فکر کا حاصل ہیں۔ مثلاً "فرینک ایلن" جس نے ثابت کیا ہے کہ علماء یونان کا یہ نظریہ کہ عالم قدیم اور غیر فانی ہے از قبیل محالات ہے۔ اس لیے کہ سائنس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی ایک عمر مقرر ہے یعنی ہر چیز کی ابتدا ہے اور جس کی ابتدا ہو اس کی انتہا بھی ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی چیز قدیم اور غیر فانی نہیں ہو سکتی۔

"فرینک ایلن" کا مقام علم الحیات (بیالوجی) کے علماء میں بہت اونچا ہے اسی طرح "رابرٹ مورس پیج" جس نے راڈار دریافت کیا نیز ماہر کیمیا "جارج ہربرٹ بلاونٹ" اور طبیعیات کا استاد "جون گلفیلڈ کو تھراں" وغیرہ مجھے توقع ہے کہ آپ یہ دونوں اور اسی قسم کی دوسری کتابیں جو کافی تعداد میں موجود ہیں ضرور پڑھیں گے۔

میں اس جگہ وجود باری تعالیٰ کے بارے میں نہ تو قدیم دلائل پیش کروں گا نہ علماء کلام

کے مباحث اور نہ وہ دلیلیں جو جدید سائنس دانوں نے مہیا کی ہیں بلکہ میں قرآن مجید کے بیان کردہ دلائل میں سے صرف ایک دلیل آپ کے سامنے پیش کروں گا قرآن مجید جو دلائل دیتا ہے وہ انتہائی واضح، صاف اور قاطع ہونے کے علاوہ ان میں نہایت مختصر عبارت میں بہت ہی وزنی بات کہی گئی ہوتی ہے۔ جسے ایک عام آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے اور جب کوئی عالم غور وفکر کے بعد اس کے حقیقی مقصد و مفہوم تک پہنچتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ اس کے زورِ بیان، دقتِ معنیٰ اور وضاحتِ موضوع کو دیکھ کر اس پر انتہائی کیف و سرور طاری ہو جاتا ہے۔ اور عالم و جاہل دونوں کے لیے سوائے اس کے کہ اس پر آمنّا و صدّقنا کہیں کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

قرآن مجید نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کی دلیل ہمارے اندر (ہمارے نفس میں) موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم کسی ایسی حقیقت سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں جس کی تحریر ہماری پیشانیوں پر اس کے سچا ہونے کا منھ بولتا ثبوت ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ الذاریات۔ (۲۱)

"دلائل اور نشانیاں تو تمھارے وجود کے اندر موجود ہیں۔ کیا تمھیں سوجھتا نہیں۔"

ہمارے دل کی گہرائی میں پوری طرح یہ احساس مرتکز ہے کہ اللہ تعالےٰ موجود ہے ہم اپنی فطرتِ ایمانی اور دینی جبلت کی وجہ سے مصائب و تکالیف کے وقت اسی کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارے اندر اور ہمارے ارد گرد پوری دنیا میں ہر طرف اس کے موجود ہونے کے دلائل بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی لیے ہمارا شعورِ باطنی یعنی دل اس کے موجود ہونے پر غیر شعوری ایمان رکھتا ہے۔ البتہ قوتِ فکر و ذہن یعنی عقل دلیل کے ذریعہ اس کے وجود پر ایمان لاتی ہے۔

بخدا میں حیران ہوں کہ کس طرح کوئی شخص جس کا خود اپنا وجود ذاتِ باری تعالےٰ کے موجود ہونے کی دلیل ہے اس کے وجود سے انکار کر سکتا ہے۔ اس کی مثال اس

شخص کی سی ہے جو بچّہ بغل میں دبائے کہتا پھر رہا ہو کہ اس نے زندگی بھر نہ کوئی بچّہ دیکھا ہے نہ چھُوا ہے۔ یا اس شخص کی سی ہے جس نے بھیگا ہُوا لباس پہن رکھا ہو جس میں سے پانی ٹپک رہا ہو اور کہتا ہو کہ میں کبھی پانی کے قریب بھی نہیں گیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ایک بہت ہی کھُلی ہوئی حقیقت ہے تو کیا وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اسے سمجھ نہیں پاتے؟ اس کا جواب یہ ہے اس لیے کہ وہ اپنی ذات پر غور نہیں کرتے، اپنے دل میں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنسٰھُم اَنفُسَھُم۔ الحشر (۱۹) "وہ اللہ کو بھُول گئے نتیجۃً اللہ نے انھیں خود ان کی اپنی ذات بھُلا دی۔" یہ لوگ دراصل اپنی ذات سے فرار چاہتے ہیں اور تنہا اس کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں اور چونکہ ان میں اتنی جراَت نہیں ہے کہ یکسُو ہو کر تنہا اپنا سامنا کر سکیں اس لیے ہر وقت کسی مصروفیت کی تلاش میں رہتے ہیں یا تو ہلکی پھُلکی گفتگو یا کسی فضول کتاب یا کسی اور مشغلہ میں مصروف رہ کر اپنی عمر اس طرح گنواتے ہیں جیسے ان کا اپنا نفس ان کا دشمن ہو جسے دیکھنا گوارا نہ ہو اور اس سے دُور بھاگتے ہوں یا جیسے یہ زندگی جو انسان کی سب سے بیش قیمت پُونجی ہے، ان پر زبردستی لاد دی گئی ہو اور یہ لوگ اسے پھینک کر اس سے خلاصی پانا چاہتے ہوں۔

ذرا عام انسانوں کی حالت پر غور کیجیے آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے بیشتر صرف کھانے پینے اور سونے جاگنے کا عمل سر انجام دیتے ہیں۔ لذّتوں کے حریص ہیں اور درد و تکلیف سے دُور بھاگتے ہیں۔ اپنی ذات، اپنے اہل و عیال اور اپنے پیاروں کے لیے دنیا کی ہر بھلائی کے خواہاں رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص صبح بیدار ہو کر غسل کرتا ہے لباس تبدیل کرتا ہے، ناشتہ کرتا ہے اور اپنے کاروبار کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور اس کاروبار یا محنت کا مقصد بھی صرف دولت جمع کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی خواہش کارفرما رہتی ہے۔ اس کے بعد واپس آکر کھانا کھاتا ہے

آرام فرماتا ہے، اور پھر کاروبار میں جُت جاتا ہے۔ یا خود کو بہلانے کے لیے کوئی ایسی مصروفیت تلاش کرتا ہے جس میں فرصت کے لمحات گزار کر وقت ضائع کر سکے اور عمر (قیدِ حیات) کاٹ سکے۔ اس کے بعد پھر جب بھوک یا نیند محسوس ہونے لگتی ہے تو واپس آ کر کھانا کھاتا ہے اور سو جاتا ہے۔ پھر دُوسری صبح نیا دن شروع ہو جاتا ہے۔ اور گزشتہ دن کا پروگرام دہرایا جاتا ہے۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔ بیکار، بے مصرف، اگر کبھی اپنا ماضی یاد کرتا ہے تو ماضی میں کیا ہے۔ صرف ان دنوں کی گنتی جو زندہ رہ کر گزار دیے اور اگر کبھی مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کا مستقبل کیا ہے صرف دنوں کی وہ تعداد جن میں زندہ رہنا اس کے لیے مُقدّر کر دیا گیا ہے۔

اب اس کے مقابلے میں ایک مسلمان کی زندگی کو لیجیے وہ صرف اتنی ہی نہیں کہ کھا پی لیا، کچھ کام کر لیا، پھر خود کو بہلانے کے لیے تفریح میں مشغول ہو گئے۔ نہیں! بلکہ وہ خود سے یہ بھی سوال کرتا ہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر جا رہا ہوں؟ میری ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہے؟ پھر جب وہ غور و فکر کرتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے، کہ زندگی کی ابتدا و انتہا یہی نہیں ہے کہ ماں کے پیٹ سے نکلے تو زندگی شروع ہو گئی اور مر گئے تو زندگی ختم ہو گئی۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس دُنیا میں آنے سے پہلے وہ شکمِ مادر میں بحالتِ "جنین" تھا اور جنین بننے سے پہلے باپ کے صلب میں زندہ جرثومہ (ہارمون) تھا اس سے پہلے وہ خُون کے اُن ذرّات کی صورت میں تھا جو باپ کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ پھر یہ خُون کہاں سے آیا۔ ظاہر ہے خُون اس غذا سے پیدا ہُوا جو اس کے باپ نے استعمال کی تھی۔ یہ غذا یا تو زمین سے اُگنے والی کوئی سبزی ہو گی یا کسی ایسے جانور کا گوشت جس نے زمینی پیداوار سے غذا حاصل کی ہو گی۔ گویا ولادت سے پہلے ایک نہیں بے شمار مراحل ہیں جن میں سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ہست و بُود کی ایک ہی طویل زنجیر ہے جس کی کڑیاں "میں" اور "آپ" ہیں۔ اس زنجیر میں بیشمار

حلقے ہیں۔ کچھ نمایاں۔ اور کچھ نہ نظر آنے والے۔ اس صورت میں کیا یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ انسان نے خود کو خود اپنے عقل و ارادے کے زور پر پیدا کیا ہو جبکہ انسان کا وجود اس وقت بھی موجود تھا جب نہ اس کے پاس عقل تھی نہ ارادہ۔

دراصل صورتِ حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص چار سال کی عمر تک یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ موجود ہے۔ پھر کوئی شخص اپنی ولادت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کوئی شخص ایسا ہے جسے یہ یاد ہو کہ وہ کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوا تھا، یا جسے اپنے وہ دن یاد ہوں جو اس نے ماں کے پیٹ میں گزارے۔ خود غور کیجیے جب انسان اپنے موجود ہونے کے عرفان سے پہلے ہی موجود تھا تو کیا اس بات کا امکان ہے کہ اس نے خود کو پیدا کیا ہو۔ آپ ذرا کسی کافر ملحد سے پوچھ کے دیکھیے کہ اچھا! آپ نے خود کو خود اپنے ارادہ اور عقل کے زور پر پیدا کیا ہے۔ تو کیا آپ نے خود کو خود ہی بطنِ مادر میں داخل کیا تھا اور کیا خود ہی اپنی ماں بنانے کے لیے اس عورت کا انتخاب کیا تھا۔ اور کیا پھر خود ہی جاکر آپ دایہ کو بلا کر لائے تھے تاکہ آپ کو بطنِ مادر سے باہر لائے۔ ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں۔ اس دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو اس قسم کا فضول اور مہمل دعویٰ کر سکے۔ اچھا تو کیا یہ ممکن ہے کہ کسی پیدا کرنے والے کے بغیر ہی انسان عدم سے وجود میں آگیا ہو؟ یہ بھی محال ہے۔ پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو اُن جمادات نے پیدا کیا ہے جو انسان کے وجود میں آنے سے پہلے دُنیا میں موجود تھیں یعنی چاند، سُورج، سمندر، ستارے، پہاڑ وغیرہ۔

مشہور فلسفی "ڈیکارٹ" نے جب اپنا نظریہ تشکیک (جو اس کی شہرت کا سبب بنا)[1]

---

[1] "ڈیکارٹ" کا مذہب تشکیک کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس سے پہلے علماء اسلام اس موضوع پر بحث کر چکے ہیں اس سلسلہ میں امام غزالی کی "المنقذ من الضلال" دیکھی جائے۔ (مصنف)

اشیا، موجودات پر منطبق کر کے آزمانا چاہا تو تمام خارجی چیزوں پر ٹھیک بیٹھتا چلا گیا لیکن جب اس نے اس کا انطباق اپنی ذات پر کیا تو غلط ہو گیا وہ اپنی ذات کے موجود ہونے میں شک نہ کر سکا اس لیے کہ وہی تو شک کر رہا ہے اور چونکہ شک کرنے کے لیے کسی شک کرنے والے کا ہونا ضروری ہے اس لیے اس وقت اس نے اپنا یہ مشہور فقرہ کہا کہ "میں سوچ رہا ہوں[1] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ میں موجود ہوں" اور واقعی وہ موجود ہے اس بات میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔ یہیں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسے کس نے پیدا کیا؟ کیا اس کے خالق یہ مادی جمادات ہیں جو عقل سے عاری ہیں جبکہ انسان ذی عقل ہے۔ کیا جس کے پاس عقل نہ ہو وہ دوسرے کو عقل عطا کر سکتا ہے؟ یعنی کیا جس کے پاس سرے سے ایک چیز موجود ہی نہ ہو وہ وہی چیز کسی دوسرے شخص کو دے سکتا ہے؟ کیا یہ بات ممکن ہے؟

یہی وہ طرز استدلال تھا جو ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا۔ انھوں نے جب اپنے مجسمہ ساز والد کو اپنے اوزاروں سے بت تراشتے دیکھا تو سوچا کہ پتھر سے ایک مورت بنائی جاتی ہے۔ اور اس مورت کو اس کے والد اور قوم کے لوگ معبود مان لیتے ہیں۔ گویا انسان ایک پتھر کا ٹکڑا پہلے خود ہی اپنے ہاتھ سے گھڑ کر تیار کرے پھر اسی کی عبادت بھی کرے۔ گویا پہلے خود ہی ہم ایک خدا تخلیق کریں۔ پھر اسی سے درخواست کریں کہ وہ ہمارے لیے وہ چیزیں پیدا کرے جو ہم چاہتے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ ایسی بعید از قیاس بات ہے جسے عقل ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔

پھر ابراہیم علیہ السلام کو تلاش ہوئی کہ آخر وہ الٰہ برحق جو درحقیقت خالق کائنات ہے کہاں ہے؟ جب اس مسئلہ پر غور و فکر شروع کیا اور رات ہو گئی اور چمکتے ہوئے روشن ستارے آفاق کی بلندی پر طلوع ہوئے جو نہ تو اس پتھر کی مانند زمین سے نکلے تھے جس

---

[1] فرانسیسی زبان میں اصل الفاظ اس طرح ہیں: "Je pense donc je suis" (مصنف)

سے بُت بنائے جاتے ہیں نہ انھیں انسانی ہاتھ نے عبادت کرنے کے لیے گھڑا تھا، تو انھیں گمان ہُوا کہ جس خُدا کی تلاش تھی وہ مل گیا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ چاند نکل آیا جس کی وجہ سے ستارے غائب ہو گئے۔ چاند دیکھنے میں بڑا بھی تھا اور روشن بھی۔ حضرت ابراہیمؑ کو یقین ہونے لگا کہ یہ چاند ہی الٰہ ازلی ہے وہ تمام رات اس کی نظارگی میں گزار دیتے ہیں، کہ سُورج طلوع ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی چاند کی شمع گُل ہو جاتی ہے پُوری زمین سُورج کے نُور سے روشن ہو جاتی ہے تو وُہ خیال کرتے ہیں کہ یہی درحقیقت وہ معبود ہے جس کی انھیں تلاش تھی لیکن پھر سُورج بھی غائب ہو جاتا ہے اور پُوری کائنات تاریکی میں ڈوب جاتی ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ سوچتے ہیں یہ کیسا خدا ہے جو پسپا ہو کر اپنی مملکت سے کنارہ کش ہو گیا۔ تب انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ سُورج بھی وہ معبودِ حقیقی ہرگز نہیں جو میرا خالق ہے۔ ان موجودات میں سے کوئی بھی خُدا نہیں ہے اور نہ خود میں نے اپنے آپ کو پیدا کیا ہے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ میں کسی پیدا کرنے والے کے بغیر پیدا ہو گیا ہوں۔ پھر صرف ایک امکان باقی رہ جاتا ہے اور وہی درست اور صحیح ہے اور وہ یہ کہ ان تمام جمادات اور مخلوقات کے پس منظر میں ایک بہت بڑا خالق اور معبود موجود ہے جس نے تمام موجودات کو اور مجھے اور ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے۔

یہی وہ دلیل ہے جسے قرآن مجید نے صرف ایک جملے میں بیان کر دیا ہے اور یہ اندازِ بیان کلامِ ربّانی کا ایسا معجزہ ہے جو ایسے ملحدوں کے لیے بھی جو صاحبِ عقل ہیں اور فکر و استدلال کا احترام کرتے ہیں۔ ایک فیصلہ کن اور قاطع دلیل ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۳۵ الطور۔ "کیا یہ لوگ بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے خالق ہیں؟"

کسی زمانے میں بے وقوف اور نیم خواندہ قسم کے اشخاص ہر بات کے جواب میں کہا کرتے تھے کہ "طبیعت" نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے۔ "طبیعت" نے ہی انسان کو عقل عطا کی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانہ میں جب ہم ناسمجھ بچے تھے بعض اساتذہ بھی ہم سے یہی بات کہا کرتے تھے۔ پھر جنگِ عظیم کے بعد کے زمانے میں کچھ ایسے استاد جو پہلے استنبول اور پھر پیرس جاکر نئی تہذیب و تمدّن کا ذائقہ چکھ آئے تھے اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ ان کا شمار اب روشن خیالوں (منوّرین) میں ہونے لگا ہے ـــــــ منوّرین کا لفظ اس زمانے میں اسی طرح عام تھا جس طرح آجکل ترقی پسند (تقدمیین) کی اصطلاح عام ہے۔ اسی طرح ہر دور میں ایک نہ ایک لفظ ایسا ایجاد ہوتا رہا ہے جس کو یہ لوگ ہماری تضحیک کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں جس طرح امریکہ کے آبادکار وہاں کے ہنود احمر (ریڈ انڈینز) کی ان کے منکوں اور رنگ برنگے لباس کو دیکھ کر ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔ تاکہ ان کی سرزمین ہتھیالیں۔

پھر جب ہم بڑے ہو گئے اور ہم نے ان سے پُوچھا کہ یہ "طبیعت" آخر ہے کیا؟ کیونکہ طبیعت کا لفظ لغوی اعتبار سے فَعِیْلَۃٌ کے وزن پر مصدر ہے جو مفعول کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے یعنی مطبوع۔ تو پھر اسے کس نے بنایا۔ ان لوگوں کا جواب ہُوا کرتا تھا کہ یہ اتفاق ہے یعنی "قانونِ احتمالات"۔

ہم کہتے "آپ کو معلوم ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، اس کے معنی کیا ہُوئے؟ اس مثال سے سمجھیے۔

دو شخص کسی صحرا میں چلے جا رہے ہیں۔ اثنار راہ میں انھیں ایک بہت بڑا اور آراستہ پیراستہ محل نظر آتا ہے۔ جس کی دیواریں منقّش اور زرکار اور جس میں قیمتی قالین، گھڑیاں اور فانوس موجود ہیں۔

ان میں سے ایک کہتا ہے کہ یہ محل کسی انسان نے بنایا اور آراستہ کیا ہوگا۔ دوسرا

اس کی بات رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم دقیانوسی خیال کے پس ماندہ شخص ہو یہ سب "طبیعت" کا کارنامہ ہے۔

پہلا پوچھتا ہے کیسے؟ طبیعت نے یہ سب کچھ کیسے سرانجام دیا؟

دوسرا۔ یہاں پہلے سے کچھ پتھر موجود تھے، پھر سیلاب آیا، تیز ہوائیں چلیں اور مختلف فضائی عوامل کے زیرِ اثر پتھر باہم پیوست ہو گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتفاقاً انھوں نے دیوار کی شکل اختیار کر لی۔

پہلا: اور قالین کیسے بن گئے۔

دوسرا: یہاں کچھ بھیڑیں ہوں گی جن کے بال اُڑ اُڑ کر جمع ہوتے رہے اور باہم خلط ملط ہو گئے۔ اس کے علاوہ کچھ رنگ دار معدنی پتھر اور دھاتیں ان میں شامل ہو گئیں جس کی وجہ سے رنگ پیدا ہو گیا اور یہ قالین وجود میں آ گئے۔

پہلا: اور یہ گھڑیاں کیسے بن گئیں؟

دوسرا: کچھ لوہا موجود ہو گا جو فضائی عوامل کے زیرِ اثر کٹ پھٹ گیا اور مدوّر شکل اختیار کر گیا اور باہم گڈمڈ ہو گیا اور وقت گزرنے پر گھڑیوں کی صورت اختیار کر گیا۔

کیا یہ توجیہات سُن کر آپ یہ نہ کہیں گے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے۔ اچھا یہ فرمائیے۔ جگر کے خانوں میں سے ایک خانے میں ایک چھوٹا سا خلیہ جو خوردبین کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا ایسے ایسے کیمیائی اعمال سرانجام دیتا ہے جن کے لیے اگر ایک پوری بڑی لیبارٹری بنائی جائے تب بھی وہ سب کام نہ ہو سکیں۔ یہ خلیہ خون میں موجود زائد شکر کو گلوکوجین میں تبدیل کرتا ہے تاکہ بوقتِ ضرورت اس سے گلوکوز تیار ہو سکے، صفرا پیدا کرتا ہے جس کے ذریعہ خون میں موجود کلسٹرول کی تعدیل ہوتی ہے۔ خون کے سُرخ ذرات (ہیموگلوبینگ سل) پیدا کرتا ہے۔ اور ان کے علاوہ اور بہت سے اعمال سرانجام دیتا ہے۔

کیا۔ خلیہ بھی اتفاقات کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اور یہ اعمال بھی اتفاقات کی وجہ سے

سرانجام پلتے ہیں۔

اور کیا اسی قسم کے کسی اتفاق نے زبان میں نو ہزار ایسے غدود پیدا کر دیے ہیں جن میں سے ہر غدود علیحدہ علیحدہ ذائقہ کا ادراک کر سکتا ہے۔ اور کان میں ایک لاکھ ایسے خلیے پیدا کر دیے ہیں۔ جو سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نیز آنکھ میں ایک سو بیس ملین ایسے خلیے رکھ دیے ہیں جن میں سے ہر ایک روشنی کو محسوس کرتا ہے۔ پھر یہ زمین جس میں بے شمار عجائبات اور اسرار ہیں، یہ ہوائی کرّہ جو اس زمین کو محیط ہے اور اس ہوائی کرّے میں جو زندہ اجسام و اجرام موجود ہیں۔ جو نہ آنکھ سے نظر آسکتے ہیں اور نہ کسی اور طریقہ سے ان کا ادراک کیا جا سکتا ہے یا فضا سے گرنے والے برف کے ذرّوں کی عجیب و غریب شکلیں جو انتہائی باریکی اور خوب صورتی سے بنائی گئی ہیں اور جن کا انکشاف ابھی حال میں ہی ہوا ہے۔ یہ سب محض اتفاقات کا نتیجہ ہیں؟

ذرا اس زمین کی طرف نظر دوڑایئے اس کے اندر چھپے ہوئے معدنیات کو دیکھئے اور اس میں جو رازہائے سربستہ پوشیدہ ہیں ان پر غور کیجیے۔ نیز اس میں جو قسم قسم کے حیوانات اور نباتات موجود ہیں جو وسیع و عریض صحرا اور ناپیدا کنار سمندر ہیں، جو بلند و بالا پہاڑ اور گہری کھائیاں ہیں ان سب کا مشاہدہ اور ملاحظہ کیجیے پھر ذرا ان سب چیزوں کا موازنہ سورج سے کیجیے یہ سب کچھ آپ کو سورج کے کبر و عظمت کے مقابلے میں بہت ہی حقیر و لیسیر نظر آئے گا۔ پھر خود سورج جو زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے وہ بھی آسمان کی پہنائیوں میں موجود کئی سیاروں کے مقابلے میں کسی صحرائے اعظم میں ریت کے ایک ذرّہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ سورج جو ہم سے سو ملین کلومیٹر دور ہے۔ اگر ہم اس کی مسافت کا حساب روشنی کی رفتار سے لگائیں جو تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے تو یہ فاصلہ آٹھ منٹ کا بنتا ہے۔ اب ذرا حساب لگائیے کہ جن سیاروں کی روشنی ہم تک ایک ملین نوری

سال میں پہنچتی ہے اور ایک نوری سال دس ہزار ملیارڈ[1] کلو میٹر کے برابر ہے. تو ایک ملین (دس لاکھ) نوری سالوں میں کتنے کلو میٹر طے ہوئے[2]۔

پھر یہ سب سیارے جن میں کہکشاں کے سیارے بھی شامل ہیں اور کہکشاں کے بارے میں علماء فلکیات صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ ایک منوّر خطہ ہے جس میں بے حد حساب سیارے موجود ہیں جن کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ تمام سیارے اتنی بڑی جسامت کے باوجود جس کے تصوّر سے ہی عقل عاجز ہے۔ ایسی ہولناک تیزی سے گردش کر رہے ہیں جس کا شمار کرنا محال ہے۔ پھر بھی یہ آپس میں ٹکراتے نہیں، کیا یہ سب اتفاقات کا نتیجہ ہے۔

مَیں نے فلکیات کے کسی عالم کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ان سیّاروں کے باہم ٹکرانے کا امکان صرف اتنا ہے جتنا اُن سات عدد شہد کی مکھیوں کے باہم ٹکرانے کا جو ہمارے کرّہ ارض کی فضا میں پرواز کر رہی ہوں۔ سات عدد شہد کی مکھیوں کے مقابلہ میں اس زمین کی وسعت کا اندازہ کیجیے اور پھر اُس وسعت و پہنائی کا تصوّر کیجیے جو کہکشاں کے اَن گنت سیاروں کی نسبت سے فضاءِ کہکشاں میں ہو گی.

پھر کہکشاں کی یہ پُوری فضا اس ناپید اکنار کرّے کا صرف وسطی حصّہ ہے جسے "آسمان دُنیا" کہا جاتا ہے۔ یہ کرّہ یعنی "آسمان دُنیا" بھی حقیقی ٹھوس جسم رکھتا ہے محض ہوا یا فضا یا[3] کوئی فرضی

---

[1] ملیارڈ۔ ایک ہزار بلین کے برابر ہے۔ (مترجم)

[2] اس سلسلے میں ان تفاصیل کو دیکھیے جو اپالو ۹ سے متعلق ہیں۔ اپالو ۹ کرۂ قمر تک پہنچا تھا اور اس نے آنے جانے میں چار لاکھ کلو میٹر مسافت طے کی تھی یعنی روشنی کی رفتار کے حساب سے ۱½ سیکنڈ (مصنّف)

[3] آسمان کے بارے میں جو کچھ میں نے بیان کیا ہے یہ قرآن مجید کی آیات اور علماءِ فلکیات کے اکتشافات کی روشنی میں مَیں نے خود اخذ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کسی دوسرے مصنّف یا محقق کی طرف سے کچھ نہیں ملا۔ اس پر تفصیلی گفتگو میں نے اپنی کسی دوسری کتاب میں کی ہے۔ (مصنّف)

خط نہیں ہے جو صرف سیاروں کا مدار ہو جیسا کہ دورِ حاضر کے بعض "جدیدیت پسند" مفسرین نے فرض کر لیا ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک کرّہ ہے جو ہماری اس فضا اور اس کی کل کائنات کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور ہماری دُنیا کو ہر طرف سے بند کیے ہوئے ہے۔

اس میں کھلنے اور بند ہونے والے دروازے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اسے ہماری اس زمین کی فضا کے لیے ایک حفاظتی چھت کے طور پر بنایا ہے۔ اس میں جو ستارے نظر آتے ہیں وہ گویا اس چھت کو روشن اور آراستہ کرنے والے چراغ ہیں۔

اس میں بلندی اور حجم بھی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک فضا ہے جس کی وسعت و فسحت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہو سکتا ہے۔ وہ بھی اس فضا کی مانند ہو یا اس سے بھی بڑی ہو۔ اسے ایک اور کرّہ گھیرے ہوئے ہے جو اس سے بھی زیادہ بڑا اور ضخامت والا ہے۔ پھر تیسری فضا ہے۔ پھر تیسرا کرّہ ہے اسی طرح اس کے بعد چوتھی فضا اور چوتھا کرّہ۔ پھر پانچویں فضا اور پانچواں کرّہ۔ پھر چھٹی فضا اور چھٹا کرّہ۔ پھر ساتویں فضا اور ساتواں کرّہ ہے۔ اس کے بعد وہ اجرامِ فلکی شروع ہو جاتے ہیں جن کی عظمت اور بزرگی کی کوئی حد نہیں۔ یعنی "عرش" و "کرسی" ان عالموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں کچھ نہیں بتایا۔

اور انتہائی عجیب بات جو کسی خلّاقِ اعظم کے وجود کی بھی بہت ہی مضبوط دلیل ہے۔ یہ ہے کہ یہی پوری فضا اپنے تمام لوازمات اور کیفیات کے ساتھ انتہائی چھوٹی شکل میں بھی موجود ہے اور وہ اتنی چھوٹی ہے کہ عقل اس کے چھوٹے پن اور باریکی کا ادراک کرنے سے اسی طرح قاصر ہے جس طرح وہ فضاء بالائی کا اس کی وسعت و پہنائی کی وجہ سے احاطہ کرنے سے عاجز ہے۔

فضا کا یہ انتہائی چھوٹا ماڈل ذرّے (ایٹم) کی شکل میں موجود ہے، اس ذرّے میں جو برقی خوردبین کے بغیر نظر ہی نہیں آسکتا۔ اس ذرّے میں جسے قدیم علماء اور فلاسفر "جزوِ لایتجزیٰ" کا نام دیا کرتے تھے، وہ ذرّہ جس کے متعلق سائنس دانوں نے حساب لگایا ہے

کہ اگر چالیس ملین ذرّے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رکھ دیے جائیں تو ان کی لمبائی ایک سنٹی میٹر سے زیادہ نہ ہوگی۔ اسی ذرّے کے وسط میں ایک فضا ہے جس کے اندر ایک مرکزہ ہے اور اس مرکزے کے گرد چھوٹے چھوٹے اجرام اسی طرح گردش کر رہے ہیں جس طرح فضا میں سیارے گردش کرتے ہیں اور یہ مرکزہ ذرّے کے مقابلہ میں اتنا چھوٹا ہے جتنا ایک محل کے مقابلے میں گندم کا دانہ اور اس مرکزے کا وزن اس کے گرد گردش کرنے والے الیکٹرون کے مقابلہ میں ۱۸۰۰ گنا زیادہ ہے کیا یہ سب کچھ اتفاقات اور حادثات کا نتیجہ ہے؟

ایک مومن کے لیے جو بات خوشی اور اطمینان کا باعث ہے، یہ ہے کہ ایک مدّت سے (جب سے سائنس نے نئے نئے انکشافات کیے ہیں) علماء نے "طبیعۃ" اور "اتفاقات" وغیرہ قسم کی فضول اصطلاحات کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ اب ان الفاظ کو صرف وہ عامی قسم کے لوگ بولتے ہیں جو عالم ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن درحقیقت علم سے انھیں دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کُل کائنات کا ربّ ہے

یہ ایمان کے عقائد میں سے دُوسرا عقیدہ ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ دل سے پوری طرح اس بات پر یقین کر لیں کہ صرف اللہ تعالےٰ ہی واحد و یکتا ان تمام جہانوں کا خالق ہے۔ اسی نے عالمِ حیوانات، عالمِ نباتات، عالمِ افلاک اور وہ تمام عالم جو ہمیں نظر آتے ہیں اور وہ بھی جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں، پیدا فرمائے ہیں اور ان سب جہانوں کے لیے اس نے ایسے ایسے عجیب و غریب اصول و آئین وضع فرمائے ہیں کہ سائنس کے شعبہ ہائے طب، کیمیا، طبعیات اور فلکیات۔ ابھی تک ان میں سے صرف چند قوانین ہی دریافت کر سکے ہیں۔ اور صرف وہی واحد ذات ہے جو ان تمام جہانوں کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے

بارے میں مکمل علم رکھتی ہے۔ اس کے پاس ایک کتاب میں تفصیل سے لکھا ہُوا موجود ہے کہ کس درخت میں کُل کتنے پتّے ہیں۔ اور ہر پتّے کی وضع قطع کیا ہے اور یہ کہ دنیا میں کل کتنے جراثیم موجود ہیں اور ان جراثیم کا طول وعرض کیا ہے۔ اور کن اجزا سے مرکّب ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہ ہر ذرّے (ایٹم) میں کتنے الیکٹرون متحرک اور کتنے ساکن ہیں اور ان کی کل تعداد کیا ہے؟ ان پر کون کون سی عارضی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ ان کا حرکت وسکون کس قسم کا ہے اور وُہ کیا کیا حالتیں بدلتے ہیں اور تبدیلی کے انداز واطوار کیا ہیں؟

ان تمام جہانوں کا رب صرف وہی ہے۔ اسی نے سب کو وجود عطا فرمایا اور وہی ان کی حفاظت فرماتا ہے۔ وہی ان کی حالتوں اور کیفیتوں میں تغیّر وتبدّل لاتا ہے۔ اسی نے اس کائنات کے ذرّے ذرّے میں ایسے شواہد و دلائل رکھ دیے ہیں جن سے ہر ذی عقل وشعور انسان کو اس کا پتہ ملتا ہے اور وہ ہدایت پاتا ہے۔

ایمان کے بنیادی اصولوں میں سے یہ دُوسرا اصول ہے جسے ماننا اور جس پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے لیکن کیا صرف اس پر ایمان لے آنا کسی کے مومن ہو جانے کے لیے کافی ہے؟ آپ کے پاس آکر ایک شخص اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہی خالقِ کائنات ہے، وہی رب العالمین ہے تو کیا صرف اسی اقرار کی بنا پر آپ اسے مومن شمار کریں گے؟ نہیں! صرف اتنا اقرار کر لینا مومن ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ بہت سی پہلی اُمتیں بھی اس بات کا اقرار کرتی تھیں۔ مشرکینِ قریش جن کے شرک کو مٹانے اور جن کے عقایٔد کو غلط قرار دینے کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہُوئے بلکہ آپ کو ان مشرکوں سے جہاد کرنے کا بھی حکم دیا گیا۔ ان سے بھی جب ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا جاتا تھا تو وہ بھی اس کے رب الارباب ہونے کا اعتراف کیا کرتے تھے اور اس کے وجود سے انکار ہرگز نہ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ابلیس علیہ اللعنۃ بھی جو کائنات میں شر کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رب ہونے سے

انکار نہ کر سکا۔ اس کا اظہار اس نے اپنے اس قول میں کیا ہے جو وہ جناب باری کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ۔ الحجر (۳۹) اے میرے رب جس طرح تو نے مجھے بہکایا ہے۔" اور رَبِّ اَنْظِرْنِیْ الحجر (۳۶) "اے میرے رب مجھے مہلت دے۔" گویا وہ اقرار کرتا ہے کہ اس کا رب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بنابریں اس کے ساتھ ساتھ یہ اقرار بھی ضروری ہے کہ:

"اس پوری کائنات کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہے"

لہٰذا تیسرا بنیادی اصول یا عقیدہ یہ ہوا کہ اس کائنات کا مالک بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسے اس کائنات پر ہر قسم کے تصرف کا ایسا ہی آزاد اور مکمل اختیار حاصل ہے جیسا کسی خود مختار مالک کو اپنی مقبوضہ اور مملوکہ چیز پر حاصل ہوتا ہے، وہی جسے چاہتا ہے زندگی عطا فرماتا ہے، جسے چاہتا ہے موت سے ہمکنار کرتا ہے۔ کسی میں یہ قدرت نہیں کہ اپنی ذات سے موت کو روک کر خود کو دُنیا میں ہمیشہ کے لیے باقی رکھ سکے۔ وہی جسے چاہتا ہے بیمار کرتا ہے جسے چاہتا ہے شفا عطا فرماتا ہے۔ مال و دولت اور فقر و عسرت بھی اسی کی طرف سے ہے۔ سیلاب بھی وہی لاتا ہے اور خشک سالی بھی۔ گزشتہ سال شمالی اٹلی میں ایسے شدید سیلاب آئے کہ شہر تہ و بالا ہو گئے اور تہذیب و تمدن تباہ و برباد ہو گیا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں خشک سالی تھی جس کے اثر سے کھیتیاں سوکھ گئیں۔ جانور ہلاک ہو گئے اور پانی کا راشن ہو گیا تھا۔

آخر وہ کون ہے جس نے اِن لوگوں پر اتنا پانی برسایا کہ وہ چیخ اُٹھے اور اُن دُوسروں کو اس طرح محروم کر دیا کہ وہ پانی کو ترس گئے۔ وہ کون ہے جو ایک شخص کو لڑکیاں عطا فرماتا ہے اور دُوسرے کو لڑکے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے اگر کسی کے گھر لڑکی پیدا ہو جائے تو کیا اس میں یہ قدرت ہے کہ اسے لڑکا بنا دے۔

کیا بانجھ میں طاقت ہے کہ خود کو اولاد کی خوش بخشی دے سکے؟ وہی خود اپنی مرضی سے کسی کی موت بچپن میں لکھ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے طویل عمر عطا فرما دیتا ہے کہ وہ بوڑھا ہو کر مرے۔ کسی علاقے میں سردی اور پالا بھیج دیتا ہے۔ کسی ملک میں گرم لہر اور کسی ملک میں زلزلہ لے آتا ہے۔ یہ سب روزمرّہ کے مشاہدات ہیں اور ان سے مقاومت اور ان کی مدافعت کا یارا انسان کے پاس نہیں ہے۔

صرف اللہ تعالےٰ ہی پرستش کے لائق معبود ہے

مذکورہ بالا وجوہات کے باعث بہت سے لوگ یہ اقرار بھی کر لیتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہی اس مملکت کا مالک ہے اور اس کائنات میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا اختیار رکھتا ہے لیکن یہ اعتراف کر لینا بھی کیا مومن ہونے کے لیے کافی ہے؟ نہیں! یہ بھی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ اقرار بھی ضروری ہے کہ وہی ایک ایسی ہستی ہے جو عبادت کے لائق اور پرستش کے قابل ہے۔ جب آپ نے یہ اعتراف کر لیا کہ اللہ تعالےٰ موجود ہے، وہی رب العالمین ہے، وہی مالک الملک ہے تو پھر عبادت میں اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کیجیے اور نہ کسی غیر کے لیے عبادت کی کوئی بھی شکل و ہیئت اختیار کر کے اس کا مدِّمقابل بنایئے۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ کے موجود ہونے اس کے رب العالمین اور مالک الملک ہونے کا تو اقرار کرتے ہیں لیکن ایسی توحیدِ خالص اختیار نہیں کرتے جو درحقیقت الوہیتِ باری تعالیٰ کا تقاضا ہے ایسے لوگوں کے بارے میں مجھے اللہ تعالےٰ کی عنایتِ خاص سے سورۃ "الناس" پر غور کرتے ہوئے ایک نکتہ ملا ہے جو کسی اور تفسیر میں میری نظر سے نہیں گزرا اور مجھے اُمید ہے میری یہ توجیہہ قرینِ صواب اور درُست ہو گی۔

سورۃ "الناس" میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ

النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ۔ نکتہ یہ ہے کہ کلام پاک میں لفظ ناس کو بار بار کیوں دہرایا گیا یعنی جب ایک بار ذکر کر دینے کے بعد باقی جگہ ضمیر "ھم" سے کام چل سکتا تھا۔ اسم ظاہر "الناس" مکرر کس لیے استعمال کیا گیا۔ معنیٰ تو اس طرح بھی ادا کیے جا سکتے تھے کہ:
بِرَبِّ النَّاسِ وَمَلِکِھِمْ وَ اِلٰهِھِمْ۔ جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں (واللہ اعلم) یہ ہے کہ جناب باری تعالیٰ یہ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں کہ یہ تینوں فقرے علیحدہ علیحدہ مکمل اور مستقل قضیے (جملے) ہیں جو باہم مربوط ہونے کے باوجود اپنی اپنی جگہ پوری پوری ذاتی اہمیت کے حامل ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ربُّ الناس بھی ہے جس کے معنی ہوئے کہ وہ انسانوں کا خالق بھی ہے اور محافظ بھی اور وہ ملک الناس بھی ہے یعنی ان کا مالک اور اپنی مرضی سے جس طرح چاہے ان پر تصرّف کرنے والا۔ اور الٰہ الناس بھی یعنی صرف وہی انسانوں کا معبود حقیقی ہے جو عبادت اور پرستش کا مستحق ہے اور اس بات کا کوئی جواز یا گنجائش نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کی عبادت یا پرستش کی جائے اور اس اندازِ بیان کا تقاضا یہ ہے کہ یا تو بیک وقت تینوں قضیوں کی تصدیق اور اقرار کیا جائے یا بیک وقت تینوں سے انکار کر دیا جائے۔ اب خود غور کیجیے کہ جو لوگ پہلے اور دوسرے قضیے کی تصدیق کرتے ہیں اور تیسرے کو قبول نہیں کرتے کیا وہ مومن ہو سکتے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ تین برابر کی حیثیت کے قضیوں میں سے ایک یا دو کو تو قبول کر لیا جائے اور باقی سے انکار کر دیا جائے۔ جب تینوں قضیے مسلّم الثبوت ہیں تو ان کے حکم میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔

توحید الالوہیت

مدد مانگو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو

اور

دُعا بھی صرف اللہ تعالیٰ سے ہی مانگو۔

صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معبود ماننا

اللہ تعالیٰ کے ربّ العالمین اور مالکِ کائنات ہونے پر ایمان لانا دل کا عمل ہے گویا ایک ایسی بات جس کو بطور عقیدہ انسان قبول کر لیتا ہے لیکن ذاتِ باری تعالیٰ کے اِلٰہ اور معبود ہونے پر ایمان کا تقاضا صرف اس بات پر یقین کر لینے اور عقیدہ بنا لینے سے پورا نہیں ہوتا۔ اس کی تکمیل کے لیے عملاً اللہ کی عبادت کرنا اور اس کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ بنانا اور صرف اسی کی عبادت کرنا بھی ضروری ہے۔ گویا اگر کوئی شخص کبر و نخوت کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کی عبادت سے گریز کرتا ہے۔ یا اس کی عبادت میں کسی دوسرے کو بھی معبود مان کر شریک کر لیتا ہے تو وہ ہرگز مومن نہ ہوگا خواہ دل میں وہ اعتقاد رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی ربُّ العالمین اور مالکِ کون و مکان ہے۔ تو اب سب سے اہم مسئلہ یہ ہوا کہ وہ عبادت جو ایمان باللہ کا اقتضا ہے کیا ہے؟ لفظِ عبادت سے بظاہر جو بات ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، نماز، روزہ، قرآن مجید کی تلاوت اور اسی قسم کی دوسرے اعمال (جن سے اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل ہو) کا نام عبادت ہے اور یہ بات اپنی جگہ درست بھی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عبادت صرف یہی اور اسی قسم کے اعمال ہیں بلکہ وہ ہر مفید اور جائز کام جو کوئی مومن اللہ تعالےٰ کی رضا اور حصولِ ثواب کی خاطر کرتا ہے عبادت میں داخل ہے۔ گویا غذا کا اس نیت سے کھانا کہ طاقت حاصل کر کے بجا آوریٔ احکام کے

قابل ہو سکے، محض نیت کی وجہ سے عبادت بن جائے گا۔ اسی طرح نکاح اس نیت سے کرنا کہ خود اور اس کی بیوی گناہ سے بچے رہیں یہ نکاح عبادت ہو جائے گا۔ اسی طرح نیتِ خیر کی وجہ سے دولت کمانا اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا عبادت ہو گا بعینہٖ کسی شخص کا علم حاصل کرنا اور بڑی بڑی ڈگریاں لینا، عورت کا امورِ خانہ میں مصروف رہنا اور اپنے خاوند کی خدمت کرنا، اپنی اولاد کی حفاظت کرنا وغیرہ سب عبادت ہو گا یعنی ہر جائز کام جس میں کرتے وقت کرنے والے کی نیت اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو عبادت ہو جائے گا تو گویا عبادت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ اس میں انسان کے تمام اعمال آجاتے ہیں اور زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیتا ہے اور غالباً ارشادِ باری تعالیٰ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ - الذاریات (۵۶) "میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"۔ میں عبادت سے یہی عبادت مُراد ہے۔

عبادت کی رُوح

عبادت کی رُوح بھی ہے اور جسم بھی۔ رُوحِ عبادت وہ عقیدہ، غرض اور مقصد ہے جس کی وجہ سے عبادت کی جاتی ہے اور عبادت کا جسم۔ اعضا کا وہ عمل ہے جو انسان زبان سے الفاظ ادا کر کے یا بدن سے حرکات کی صورت میں انجام دیتا ہے۔ مثلاً نماز کی حرکات یعنی قیام و قعود اور رکوع و سجود اور الفاظ یعنی تلاوتِ قرآن اور ذکر و تسبیح یہ سب نماز کا جسم اور ظاہر ہیں۔ ایک شخص نماز ادا کرتا ہے لیکن اگر اس کی ادائیگی کی محرک خالص توحید اور درست عقیدہ نہ ہو اور اس سے مقصود اللہ تعالےٰ کی رضا طلب کرنا اور اس کا حکم ماننا نہ ہو تو نماز صرف ایک جسدِ بے رُوح ہو گی۔ یعنی اس کا ظاہر ادا ہو گا، اصلی مقصد پُورا نہ ہو گا۔

توحیدِ خالص کی بُنیاد

بنیادی عقیدہ تو صرف اتنا ہے۔ یہ یقین رکھا جائے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہر قسم کے نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت و اختیار رکھتا ہے لیکن اس کی وضاحت کے لیے ایک تمہید کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اسی نے یہ تمام جہان پیدا فرمائے اور ان جہانوں میں طرح طرح کی چیزیں خلق فرمائیں۔ اسی نے ہمیں عقل عطا فرمائی اور حکم دیا کہ ہم اس کی پیدا کردہ مخلوقات پر اپنی عقل سے غور و فکر کریں، فرمایا: اُنْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط یونس (۱۰۱) ذرا غور سے دیکھو زمین و آسمان میں کیا کچھ پیدا کیا گیا ہے۔" اس حکم کے مطابق جب انسان نے غور و فکر کیا تو اسے پتہ چلا کہ اس دُنیا میں جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں ان میں سے بعض چیزوں کو بعض پر غلبہ اور تسلّط حاصل ہے۔ مثلاً آگ کسی خشک درخت کو چُھو جائے تو اسے جلا ڈالتی ہے مگر پانی آگ کو بُجھا دیتا ہے۔ ایک خاص قسم کا مچھر اگر انسان کو کاٹ لے تو انسان ملیریا میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن ایک بُوٹی "سنکونا" میں اس نے ایک ایسا مادہ (کونین) رکھ دیا ہے جس کے استعمال سے ملیریا دُور ہو جاتا ہے۔

پھر اس نے تمام اشیاء، موجودات میں باہم خاص قسم کے رابطے اور نسبتیں رکھی ہیں۔ یعنی دُنیا میں موجود اشیاء کے ذخائر کی مقدار مقرر ہے اور ایک چیز کے دوسری چیز سے مل کر کوئی نئی تیسری چیز وجود میں لانے کے لیے بھی نسبتیں اور مقداریں مقرر اور متعین ہیں۔ مثلاً کلورین (ایک مہلک عنصر) اور سوڈیم (یہ بھی مہلک عنصر ہے) اگر ایک خاص مقدار میں باہم ملائے جائیں تو ان کے امتزاج سے ایک مُرکّب بنتا ہے جو نہ صرف مُفید ہے بلکہ انسان کے لیے اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر گزارہ ممکن نہیں

یعنی سوڈیم کلورائیڈ (خوردنی نمک)

"اس انداز میں غور وفکر کرتے ہُوئے انسان کو معلوم ہُوا"

۱۔ کہ اس دنیا میں موجود چیزوں میں باہم علاقے اور رابطے کا تناسب ایک مستقل اور منظم قانون کے تابع ہے اور اس کا ایک خاص اور معین اسلوب ہے جس میں تغیرّ و تبدّل واقع نہیں ہوتا۔ اور یہی اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سُنّت (طریقہ) ہے اور اسی کو اصطلاحاً ہم "قوانین طبعیہ" کا نام دیتے ہیں۔

۲۔ اشیاء کے مابین یہ رابطے جنہیں ہم قوانین طبعیہ کہتے ہیں۔ یہ سب کے سب اس طرح کے واضح اور کھلے ہُوئے نہیں ہیں جس طرح لکڑی اور آگ کا باہم رابطہ واضح ہے یعنی آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے یا جیسے پانی اور آگ کا باہم رابطہ کہ پانی آگ کو بجُھا دیتا ہے (یہ ایسے رابطے ہیں کہ سب جانتے ہیں) بلکہ اکثر رابطے نہایت دقیق اور مشکل سے سمجھ میں آنے والے ہیں۔

ایک کلیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا میں ہر مرض کے لیے دوا بھی پیدا فرمائی ہے لیکن یہ دوا اس طرح کھلی جگہ کہ ہر شخص کو نظر آجائے اور ایسی مکمل اور تیار صورت میں موجود نہیں ہے کہ آپ اُٹھائیں اور استعمال کر لیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے مختلف انداز میں اور عجیب وغریب طریقوں سے ایسی ایسی جگہ چھپا کر رکھا ہے جہاں اس کے موجود ہونے کا سان وگمان بھی نہیں ہو سکتا مثلاً "پنسلین" جو ایک نہایت شفا بخش دوا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے پھپھوندی میں پیدا فرمایا ہے جو خود ایک مُہلک زہر ہے اسی طرح اس نے نفیس ترین مہکتے ہُوئے عطر اور طرح طرح کے چمک دار روپ والے رنگ انتہائی بدبودار اور بدترین شکل و صورت والے مادّے "قطران" (کولتار) میں رکھ دیے ہیں جس میں سے یہ سب

خوشبوئیں اور رنگ نکالے جاتے ہیں۔

پھر کسی ایک چیز کا دوسری چیز میں موجود ہونا بھی کوئی سیدھی سی بات نہیں ہے بلکہ اُس خاص مجزء کو جو ہمیں مطلوب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے مادے کے ساتھ اس طرح مخلوط کر کے اور اس طرح اٹا پھسا کر رکھا ہے کہ مطلوب چیز کو نکالنے اور جُدا کرنے کے لیے بہت لمبے کیمیائی عمل، تجربات اور کوششوں کی ضرورت پڑتی ہے جس شخص نے کتاب "التلمیذ الخالدہ"[1] پڑھی ہے اسے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ایک گرام "ریڈیم" حاصل کرنے کے لیے کس طرح مختلف مادوں کے ایک بہت بڑے انبار کو جو کسی چھوٹے ٹیلے سے کم نہ تھا صاف کرنا پڑا تھا اور اس پر پے در پے مختلف تجربات اور کیمیائی عملیات آزمانے پڑے تھے جو کئی سال جاری رہے تھے۔

۳۔ خالق کائنات جل مجدہٗ کے وضع کردہ اِن نوامیس فطرت اور قوانین طبعیہ میں سے ہم ابھی تک دریا میں سے ایک قطرے کے برابر بھی دریافت نہیں کر سکے اور اسی حقیر سی دریافت پر ایسے ایسے عجائبات دیکھنے میں آتے ہیں کہ عقلِ انسانی حیران ہے اور انہی انکشافات پر نئے نئے علوم کی بنیادیں استوار ہو گئی ہیں اور ان علوم کے کئی کئی شعبے اور صنفیں موجود ہیں آ گئی ہیں۔ مثلاً علم الحیات (بیالوجی) علم الکیمیا، (کیمسٹری) علم طبعیات (فزکس) علم الاجسام، (فزیالوجی) علم طب اور ان کے علاوہ بہت سے علوم اور ان علوم کے ہر شعبہ میں تحقیق و تدوین اور مزید اکتشافات کی غرض سے کچھ لوگوں نے خود کو اسی شعبہ کے لیے وقف کر دیا ہے جن کو اس شعبہ یا صنف

---

[1] التلمیذ الخالدہ۔ مادام "کیوری" اور اس کے خاوند کا قصہ ہے مجھے توقع ہے کہ طلباء اسے ضرور پڑھیں گے تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ حصولِ علم میں کس طرح اور کتنے صبر و برداشت سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہمارے متقدمین کے سوانح حیات میں اس انداز کے صبر و برداشت اور حصول علم کے لیے پُرخلوص جد و جہد کے سینکڑوں واقعات اور بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ (مصنف)

کی مناسبت سے اسی علم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً علماء حیاتیات، علماء کیمیا وغیرہ اسی طرح باقی سب علوم میں۔

۴۔ اس تحقیق و اکتشاف کے دوران ہمیں معلوم ہوا کہ کائنات میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ کچھ ہمارے لیے مفید اور کچھ مضر، اور یہ نفع و ضرر بھی دو طرح کا ہے۔ ۱۔ ایسا نفع و ضرر جس کا سبب واضح ہوتا ہے اور ان قوانین طبعیہ کے مطابق ہوتا ہے جو ہمیں معلوم ہو چکے ہیں اور جن کو ہم نے اپنے علوم مدوّنہ کی بنیاد بنا لیا ہے مثلاً ایک شخص کوئی زہریلی چیز کھا لیتا ہے اور اس کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی ہے جبکہ ہمیں پہلے ہی بذریعہ تجربہ دل پر اس چیز کے زہریلے اثرات کا علم تھا۔ ۲۔ بعض دفعہ کسی ظاہری سبب کے بغیر نفع یا نقصان وقوع پذیر ہو جاتا ہے اور اسے ہم پہلے سے معلوم کسی قانون کے مطابق نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ایک تندرست قوی الجثہ شخص کی حرکتِ قلب اچانک بند ہو جاتی ہے جس کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن یہ دونوں ہی صورتیں من جانب اللہ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قسم کے نفع و نقصان کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس انداز میں پیدا فرمایا ہے کہ اس کی فطرت میں حصولِ منفعت کی خواہش رکھ دی ہے۔ چنانچہ انسان نفع حاصل کرنے کے لیے ہر طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح نقصان سے بچنے کی جبلت بھی انسان کی فطرت ہے اور اس مقصد کے لیے بھی وہ ہر ذریعہ اختیار کرتا ہے اور ہر قسم کی طاقت سے ممکن الحصول مدد لیتا ہے" جلبِ نفع" اور "دفعِ ضرر" کی یہ کوشش دو طرح کی ہے ایک، جس کی ہمارا دین اجازت دیتا ہے اور دوسری جس سے دین منع کرتا ہے اور اسے ایمان کے خلاف قرار دیتا ہے چنانچہ یہ جاننا ضروری ہے کہ کس قسم کی کوشش اور مدد جائز ہے اور کون سی ناجائز۔

مثلاً آپ کا بچہ بیمار ہو جاتا ہے اور آپ اپنے پڑوسی ڈاکٹر کو آواز دیتے ہیں، وہ آکر مریض دیکھتا ہے، مرض تشخیص کرتا ہے اور نسخہ لکھ دیتا ہے۔ یہ استمداد کی ایک جائز صورت ہے۔ اس لیے کہ آپ نے حصولِ شفاء کے لیے خالقِ کائنات کے بنائے ہوئے طبعی قانون کے مطابق ایک ایسے شخص سے مدد طلب کی جو اس قانون سے واقف ہے اس کے برعکس اگر آپ کسی جھوٹے عامل یا جادوگر کو بلاتے ہیں کہ وہ علم اور قانون طبیعی کو نہ جاننے کے باوجود کسی غیبی قوت سے (جس کا وہ مدعی ہے اور جس قوت کے موجود ہونے کا کوئی ثبوت نہ تو سائنسی علوم سے ملتا ہے اور نہ قرآن وحدیث سے) آپ کے بچے کو تندرست کر دے تو یہ استمداد ناجائز ہوگی۔

اسی طرح اگر آپ کسی ڈاکٹر کی موت کے بعد اس کی قبر پہ جاکر آواز دیتے ہیں، جبکہ وہ اپنی موجودہ حالت میں نہ مرض تشخیص کر سکتا ہے، نہ نسخہ لکھ سکتا ہے، ظاہر ہے یہ طریقہ بھی ناجائز ہوگا۔ لیکن اگر تمام علمی تدابیر اور معروف سائنسی طریقے اور علاج ناکام ثابت ہو چکے ہوں اور آپ حصولِ شفاء کے لیے دعا یا صدقہ کا سہارا لیں یا اللہ کے کسی نیک بندے سے دعا کروائیں تو یہ مدد حاصل کرنے کا ایک جائز طریقہ ہوگا لیکن اگر آپ کسی نیک شخص کی قبر پر کھڑے ہو کر اس سے دعا کی درخواست کریں جبکہ وہ اس حالت میں نہ زبان ہلا کر دعا کر سکتا ہے اور نہ اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر از خود مریض کو تندرست کر دینے کی طاقت ہے۔ تو یہ استعانت بھی ناجائز ہوگی۔ مریض کو طبیب کا تجویز کردہ نسخہ پلا کر اس کی صحت کے لیے آپ کی کوشش ایک جائز کوشش ہے۔ لیکن اگر آپ نسخہ بطور تعویذ مریض کے گلے میں ڈال دیتے ہیں یا پانی میں گھول کر مریض کو پلا دیتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس طرح مریض ٹھیک ہو جائے گا تو یہ غلط اور ناجائز عمل ہوگا۔ ایسی چیزوں سے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فائدہ کا واضح سبب نہیں بنایا۔ فائدہ اور نفع طلب کرنا ناجائز ہے۔ ایک بانجھ عورت جسے بچہ کی خواہش ہو

اگر کسی طبیب سے مدد مانگتی ہے یا ایسی دوائیں استعمال کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور جو سائنسی طریقوں سے دریافت اور تیار کی گئی ہیں تو اس نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا اور دین کے خلاف نہیں لیکن اگر وہ شام[1] کی بوڑھی عورتوں کی مانند یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ جو عورت ماہ رجب کے پہلے جمعہ کو کوہ "قاسیون" میں واقع حنبلیوں کی جامع مسجد کے دروازے کی زنجیر ہلائے گی وہ حاملہ ہو جائے گی یا کسی مقبرے کی جالی میں کپڑے کی دھجی باندھ کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہے گی تو وہ ایک ناجائز کام کرے گی اور عقیدہ توحید کے خلاف عمل کا ارتکاب کرے گی۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قوانین طبیعی سے استفادہ کرنا یا ایسے شخص سے رجوع کرنا جو ان قوانین کا عالم ہو یا ایسے ذرائع اختیار کرنا جن سے عام طور پر فائدہ اٹھایا جاتا ہے جائز ہے بشرطیکہ یہ بات یاد رہے کہ درحقیقت فائدہ پہنچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ فرضی غیبی قوتیں جن کی تائید نہ سائنسی علم اور مشاہدہ سے ہوتی ہے اور نہ قرآن و حدیث سے اُن کا ثبوت ملتا ہے۔ ان قوتوں سے استعانت ایسا کام ہے جو ممنوع اور عقیدۂ توحید کے خلاف ہے۔

حلال اور حرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے

یہ تمام فوائد جو ہم قوانین طبیعی پر عمل کرنے سے حاصل کرتے ہیں یہ سب دُنیوی فوائد ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری عقل کو صرف مادی قوانین دریافت کرنے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔ غیر مادی اور ماورائی اُمور اور اُن کے اصول و قوانین پر مطلع

---

[1] یہ عقیدہ اور اس سے ملتے جلتے تو تمام اسلامی ممالک کے علاوہ دُنیا کے بہت سے اور علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اٹلی کی عورتیں یہ اعتقاد رکھتی ہیں کہ جو بانجھ عورت کسی ولی (سینٹ) کی قبر کے روشن دان پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اندر جھانکے گی اس کا بانجھ پن دُور ہو جائیگا۔
(الناشر)

ہونے کی طاقت انسانی عقل کو حاصل نہیں ہے۔ اور نہ عالمِ آخرت کے منافع اور فوائد حاصل کرنا عقل کے اختیار میں ہے۔ بنابریں ہم حصولِ فوائد اور دفع ضرر کے تمام ذرائع جو ہمیں حاصل ہیں مادی حدود میں رہتے ہوئے اور اسی دُنیا کے لیے استعمال کر سکتے ہیں از خود اپنے لیے عالمِ آخرت کا نفع یا نقصان حاصل نہیں کر سکتے۔

اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اُخروی نفع و نقصان کے اسباب و ذرائع بھی مہیا فرمائے ہیں یعنی نفع کا ذریعہ فرائض و واجباتِ دین کا ادا کرنا ہے۔ اور نقصان کا باعث حرام کاموں کا مرتکب ہونا ہے۔ بنابریں حلال کرنے اور حرام قرار دینے کا اختیار اللہ تعالےٰ نے صرف اپنے پاس رکھا ہے کیونکہ انہی کا نتیجہ ثواب یا عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنی رائے سے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے سکے اور نہ کسی کو یہ اختیار ہے کہ جس کام کو اللہ تعالیٰ نے واجب نہیں کیا اسے واجب کر دے یا جس کو اس نے حرام نہیں کیا اسے حرام کر دے جس شخص نے حلال و حرام کرنے کا حق کسی غیر اللہ کو دیا گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی عبادت کی یا اسے اللہ تعالےٰ کی عبادت میں اللہ کا شریک بنا لیا۔[1]

حُبّ اللہ اور خشیت اللہ

انسان بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند۔ مثلاً لذیذ کھانے اور خوبصورت مناظر ہمیں پسند ہیں۔ مرد عورت کو پسند کرتا ہے یعنی اس سے محبت کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ

---

[1] اس لیے کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا بھی ایسا ہی جرم ہے جیسا حرام چیز کو حلال کر لینا۔ مثلاً ایک مسلمان شراب پیتا ہے لیکن اسے حرام سمجھتا ہے اور اپنے گناہ کا معترف ہے اور دُوسرا شربتِ لیموں کو حرام کہتا ہے تو شربتِ لیموں کو بلا دلیلِ شرعی حرام قرار دینے والے کا گناہ اس شرابی سے زیادہ بڑا ہے جو حرام مانتے ہوئے اور اعترافِ گناہ کرتے ہوئے شراب پیتا ہے۔ (مصنّف)

محبّت حد سے بڑھ جاتی ہے یعنی عشق ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ اس محبّت میں کسی حد تک عبادت کا رنگ آ جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ محبت انسان کی دُوسری چاہتوں کی طرح مُقیّد اور ایک حد تک محدود رہتی ہے۔ اس لیے کہ ہم دراصل اس فائدے سے محبّت کرتے ہیں جو ہمیں کسی چیز سے پہنچتا ہے یا اس لذت سے محبّت کرتے ہیں جو قربِ محبُوب سے حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر محبوب کسی مرض میں مبتلا ہو جائے جس سے اس کی صُورت بگڑ جائے۔ اعضا گل جھڑ جائیں اور اس کا حُسن ختم ہو جائے یا جو کھانا ہمیں پسند تھا وہ سڑ جائے اور اس میں پھپھوندی لگ جائے اور بُو آنے لگ جائے یا جو منظر ہمیں مرغوب تھا وہ بدل جائے اور اس میں حسن باقی نہ رہے تو ہماری محبّت اور پسندیدگی بھی ختم ہو جائے گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ چاہت کراہت میں بدل جائے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی محبّت جو ایک مومن محسوس کرتا ہے ہر غرض سے آزاد اور لامحدود محبّت ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس دُنیا میں بھی ہم کسی چیز سے محبت کرتے ہیں تو دراصل اس محبّت میں اس خالق کی محبّت پوشیدہ ہوتی ہے جس نے اسے پیدا فرما کر ہمارے لیے مہیّا فرمایا اور ہمیں یہ قدرت عطا فرمائی کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور اس کے دیکھنے اور چھُونے سے لُطف اندوز ہو سکیں۔

علاوہ ازیں انسان دُنیا کی بہت سی چیزوں سے ڈرتا ہے مثلاً انسان دہکتی ہُوئی آگ، وحشی درندے، مہلک زہر اور طاقت ور ظالم سے ڈرتا ہے لیکن یہ ڈر محدود اور مقیّد ہے یعنی اس خوف کا باعث دراصل اس نقصان سے بچنا ہے جو ان چیزوں میں پوشیدہ ہے یا ان سے پہنچ سکتا ہے۔ اسی لیے جب انسان خود کو ان کے نقصان سے محفوظ محسوس کرتا ہے تو اس کا خوف جاتا رہتا ہے۔ برعکس اللہ تعالیٰ سے خوف اور اس کی خشیّت لامحدود اور ہر قید سے آزاد ہے۔

دراصل اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس سے ڈرتے رہنا ہی توحید کی بنیاد اور عبادت کی رُوح ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ مشہور شاعر "ابن فارض" کی طرح اللہ تعالیٰ کو محبوب و معشوق بنا کر اس کی شان میں قصیدے لکھیں اور نہ یہ کہ آپ اس محبت کا نام عشق الٰہی رکھ دیں جس طرح لوگوں نے حضرت "رابعہ عدویہ" (البصری) کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ آپ پر ایسی دہشت اور گھبراہٹ طاری ہو جو موجب نفرت ہے اور نہ اس سے مراد ایسا نالہ و شیون ہے جو اعصاب کو مختل کر دے بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اور خوشنودی کو ترجیح دیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ. آل عمران (۳۱) "کہہ دیجیے کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔" تو گویا محبت کا پیمانہ دراصل اطاعتِ احکام ہے اور خوف سے مُراد حرام چیزوں اور ناجائز کاموں سے پرہیز کرنا اور ثوابِ آخرت کو دُنیاوی لذتوں پر ترجیح دینا ہے۔

پھر ایک اور بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اور مخلوق کی اطاعت میں فرق ہے اس لیے کہ انسان کسی انسان کی اطاعت یا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کرتا ہے جیسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت۔ یا اپنی خواہشات نفس کے ماتحت یا کسی خطرے کے ڈر سے مثلاً قبیلہ اپنے حاکم کی اطاعت کرتا ہے یا بیٹا باپ کی اطاعت کرتا ہے یا بیوی خاوند کی اطاعت کرتی ہے یا انسان اپنے محسن کی اطاعت کرتا ہے بشرطیکہ وہ اسے کوئی ایسا حکم نہ دے جس سے نقصان پہنچے۔ اور کبھی کبھی ہم کسی کی ایذا رسانی سے بچنے کے لیے بھی اس کا

حکم ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن یہ سب اطاعتیں (رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے علاوہ کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے) محدود ہیں۔ ایسی اطاعتِ مطلقہ نہیں ہے جس کی کوئی حد ہی نہ ہو۔ اطاعتِ مطلقہ یعنی ہر بات میں اطاعت خواہ وہ بات ہمیں پسند ہو یا نہ ہو اور ہر حال میں اطاعت خواہ اس حکم کی حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور یہ اطاعت ہی دراصل اللہ تعالیٰ سے محبّت کا نتیجہ بھی ہے اور اس کی نشانی بھی۔

صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں وضاحت

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہُوا ہے اور اس کے مخاطبِ اول بھی عرب ہی ہیں اس لیے قرآن مجید کی آیات سے جو مفہوم ایک حقیقی عرب سمجھے گا وہی ان کا صحیح مفہوم ہو گا۔ بشرطیکہ وہ قواعدِ زبان کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس جگہ لفظ حقیقی معنیٰ میں استعمال ہُوا ہے وہاں حقیقی معنیٰ اور جس مقام پر مجازی معنیٰ میں استعمال ہُوا ہے وہاں مجازی معنیٰ مُراد لے۔ لیکن چونکہ سب زبانوں کے الفاظ صرف اس زمین پر موجود مادی اشیاء اور ان کے معانی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بنائے گئے ہیں اس لیے لفظوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ یہ انسانی شعور کے محسُوسات کا بھی احاطہ کر سکیں چہ جائیکہ اللہ تعالےٰ کی صفات کو بیان کر سکیں۔ پھر ہم (لبسا اوقات) مختلف قسم کے کئی معانی ادا کرنے کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ ان سب معانی کے لیے ہمیں علیحدہ علیحدہ لفظ نہیں ملتے۔ مثلاً لفظ "جمیل" (خوبصورت) بہت سے مختلف معنیٰ کے لیے بولا جاتا ہے ہم کہتے ہیں خوبصورت باغ، خوبصورت بیان، خوبصورت عورت۔ حالانکہ باغ کا جمال، بیان اور عورت کے حسن وجمال سے بہت ہی مختلف ہے بلکہ عورت کے حسن وجمال کے تو سینکڑوں رُوپ اور انداز ہیں جو سب ایک دُوسرے سے مختلف ہیں لیکن ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں

ان سب کی ادائیگی کے لیے لفظ "جمال" کے سوا اور کوئی لفظ موجود نہیں۔

جب الفاظ انسانی فکر و شعور کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے بھی قاصر ہیں تو ظاہر ہے صفاتِ باری تعالیٰ کا احاطہ کرنے کے لیے ان کا دامن کس قدر تنگ ہوگا۔ بنابریں یہ جائز نہیں کہ قرآن مجید میں جو الفاظ صفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں نازل ہوئے ہیں انھیں ہم لغوی معنیٰ میں سمجھنے کی کوشش کریں یعنی یہ کہنا غلط ہوگا کہ چونکہ آیۂ کریمہ يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ الفتح - (۱۰) میں لفظ "ید" استعمال ہوا ہے اور "ید" کے معنی لغت میں ہاتھ ہیں۔ اس لیے "ید اللہ" سے ہماری طرح کا ہاتھ مراد ہے۔ دراصل یہی اصول اُن آیاتِ قرآنیہ کے معانی سمجھنے کی بنیاد ہے جن میں صفات باری تعالیٰ بیان ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ الشوریٰ (۱۱) "اس کی مانند کوئی چیز نہیں" فرما کر یہ بات بتا دی گئی ہے کہ وہ خالق ہے اور مخلوق میں کوئی چیز اس سے مشابہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی جائز نہیں ہے کہ صفاتِ باری تعالےٰ کے ضمن میں جتنے الفاظ قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر لفظ کے اس معنی کی نفی کر دی جائے جس پر لفظ دلالت کرتا ہے۔ اور الفاظ کو بے معنی قرار دے دیا جائے۔ اس لیے کہ قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس کے معانی معطل کر دیے جائیں اور اس کے الفاظ کو معانی سے خالی قرار دے دیا جائے۔

پھر آیاتِ صفات کا مفہوم سمجھنے کی صحیح صورت کیا ہوگی؟

قرآن مجید میں آیاتِ صفات تین قسم کی ہیں

۱:۔ وہ آیات جو باری تعالیٰ کی شان و عظمت بیان کرنے کے بارے میں ہیں۔ مثلاً اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۔ طٰهٰ۔ (۵) "رحمٰن (کائنات کے تختِ سلطنت پر) جلوہ فرما ہے۔" اب ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ عرش پر مستوی نہیں

ہے کیونکہ اس صورت میں ایسی بات کی نفی لازم آئے گی جس کا اثبات خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اسی طرح عرش پر بیٹھا ہے جس طرح کوئی انسان کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں مخلوق سے مشابہت لازم آئے گی۔ تو پھر ہم صرف یہ کہیں گے کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہونے کی بنا پر اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس سے دراصل خود اللہ تعالےٰ کی مراد کیا ہے۔ اس کی حقیقت اور تفصیل ہم نہیں سمجھ سکتے اس لیے کہ وہ ہمیں بتائی نہیں گئی اور چونکہ عقل انسانی (جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں) از خود اس کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہے، اس لیے ہم اس پر قیاس آرائی نہ کریں گے بلکہ سلفِ صالحین کی پیروی کریں گے۔

۲۔ کچھ آیاتِ صفات علمِ بلاغت کے معروف اسلوب صنعتِ "مشاکلت" کے طرز پر نازل ہوئی ہیں۔ مشاکلت کی مثال درج ذیل شعر ہے:

قَالُوْا اقْتَرِحْ شَیْئًا نُجِدْ لَکَ طَبْخَہٗ
قُلْتُ اطْبِخُوْا لِیْ جُبَّۃً وَّ قَمِیْصًا

انھوں نے کہا کہ کسی چیز کی فرمائش کیجیے کہ ہم اسے آپ کے لیے عمدہ طریقے سے پکا کر پیش کریں۔ میں نے کہا میرے لیے ایک جبّہ اور ایک قمیص پکا دو۔

یا جس طرح شاعر ابو تمّام نے "عموریہ" کی جنگ کے موقع پر جب نجومیوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ جب تک انجیر اور انگور پک نہ جائیں فتح حاصل نہیں ہو گی۔ یہ شعر کہا تھا کہ

تِسْعُوْنَ اَلْفًا کَآسَادِ الشَّرٰیِ نَضِجَتْ
جُلُوْدُھُمْ قَبْلَ نُضْجِ التِّیْنِ وَالْعِنَبِ

نوّے ہزار غضبناک شیروں کی مانند (بہادر) جن کی کھالیں پک گئیں انگور اور انجیر پکنے سے پہلے (پہلے شعر میں لفظ طبخ اور دوسرے شعر میں نضج بطور "مشاکلہ" استعمال ہوا ہے خود قرآن مجید کی بہت سی آیات میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے مثلاً نَسُوا اللّٰہَ

فَنَسِیَھُمۡ ؕ التوبہ۔ (۶۷) "وہ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے اور نتیجۃً اللہ تعالیٰ انھیں بھول گیا۔" ظاہر ہے لفظ نسیاں اس آیت میں لغوی معنی میں ہی استعمال ہُوا ہے جس سے کسی بات کا حافظہ سے غائب ہو جانا مُراد لیا جاتا ہے چنانچہ فَنَسِیَھُمۡ ؕ میں نسیان کی نسبت جو اللہ تعالےٰ کی طرف ہے "مشاکلۃ" ہے۔ اس کے حقیقی معنی مُراد نہیں لیے جا سکتے اللہ تعالیٰ کو نسیان لاحق نہیں ہو سکتا: وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝ مریم ۶۴ "اور تمھارا رب بھولنے والا نہیں ہے۔" تو اس آیت پر بھی ہمارا ایمان ہے اور اس سے دراصل کیا مراد ہے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں بعینہٖ یہ آیت: وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۔ آلِ عمران۔ (۵۴) یا: يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمۡ ۔ النساء (۱۴۲) (ان میں مکر و خدع کی نسبت جناب باری کی طرف بطورِ مشاکلہ ہے)۔

۳۔ کچھ آیتیں ایسی ہیں جن کے معنیٰ مُراد دُوسری آیات کی روشنی میں واضح ہوتے ہیں جیسے ارشاد باری تعالےٰ: وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ يَدُ اللّٰهِ مَغۡلُوۡلَةٌ ؕ غُلَّتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَلُعِنُوۡا بِمَا قَالُوۡا ۘ بَلۡ يَدٰهُ مَبۡسُوۡطَتٰنِ يُنۡفِقُ كَيۡفَ يَشَآءُ ؕ المائدہ (۶۴) "یہودی کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ باندھے گئے ان کے ہاتھ اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں اللہ کے ہاتھ تو کُشادہ ہیں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔" اس آیت میں "ید" سے جو معنیٰ مراد لیے گئے ہیں اس کی وضاحت یہ آیت کرتی ہے: وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُوۡلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ ۔ الاسراء (۲۹) نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کُھلا چھوڑ دو۔" اس آیت سے یہ بات واضح ہُوئی کہ "بسط ید" سے مُراد جُود و سخا ہے اور جُود و سخا کے لیے ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بھی حقیقتاً ایسے ہی ہاتھ ہوں جیسے انسان کے ہوتے ہیں اسی طرح قرآن مجید میں مختلف مقامات پر۔ بَيۡنَ يَدَىۡ

رَحْمَتِهٖ - النمل (۶۳) اور بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ - سبا (۴۶) اور وَالْقُرْاٰنُ لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ - فصلت - (۴۲) آیا ہے۔ حالانکہ "رحمت"، "عذاب" اور "قرآن" کے حقیقی ہاتھ نہیں ہیں۔

محکم اور متشابہ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس قرآن میں "آیاتِ محکمات" بھی ہیں جن کے معانی واضح اور الفاظ ہر طرح کے ابہام سے پاک ہیں اور کچھ آیات "متشابہ" بھی ہیں جن کے حقیقی معنیٰ پُوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتے اور مومن پر لازم ہے کہ آیات متشابہات پر قیاس آرائیاں نہ کرے اور نہ اس طرح ان کے پیچھے پڑ جائے کہ انھیں جمع کر کے ان کے متعلق بحث و مناظرہ کرتا رہے اور فتنے بپا کرے اور آیاتِ صفات بھی متشابہات میں سے ہیں (اس لیے ان کا بھی یہی حکم ہے)

ان آیات کے بارے میں سوادِ اعظم کا موقف اور سمجھنے کا انداز

پہلے مسلمان جو اُمت کے سلفِ صالح، برگزیدہ اور افضل ترین افراد ہیں۔ انھوں نے آیاتِ متشابہات کے بارے میں بحثیں اور ان کی تشریح پر قیاس آرائیاں نہیں کی تھیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس طرح نازل ہُوئیں اور جو ان سے مُرادِ باری تعالےٰ ہے اس پر بعینہٖ ایمان لے آئے تھے۔

لیکن بعد میں جب علم کلام وجود میں آیا اور اسلامی عقائد پر اعتراضات ہونے لگے تو علماء میں ایک نیا طبقہ پیدا ہُوا۔ جس نے ان اعتراضات کا رد کرنے کے لیے ابحاث کے ڈھیر لگا دیے اور آیاتِ صفات کے بارے میں طرح طرح کی تاویلیں کیں اور جن الفاظ کا اطلاق لغوی اور اصلی معنی پر نہیں ہو سکتا تھا انھیں عرب کے مُروّجہ طریقے پر مجاز اور تاویل کے

کے ذریعہ دُوسرے معانی پر منطبق کیا۔

متقدمین اور متاخرین دونوں کے طریقِ کار کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سلف صالحین کے طریقہ میں سلامتی ہے اور متاخرین کا موقف مضبوط اور محکم ہے لیکن یہ دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیات سب کی سب اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور جو شخص ان میں سے کسی کا انکار کرے گا وہ کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہہ کر کہ ان الفاظ میں معنی ہی نہیں ہیں انھیں معطل قرار دے گا تو بھی کُفر کا مرتکب ہو گا۔ اور جو شخص ان سے لغوی معنی مُراد لے کر ان معانی کا اطلاق اللہ تعالےٰ پر کرے گا۔ اور خالق کو مخلوق سے مشابہ قرار دے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا راستہ پُرخطر ہے اور اس پر آگے بڑھنا مہلک ہو سکتا ہے۔ اس لیے سب سے بہتر اور محفوظ طریقہ سلفِ صالحین کا اتباع ہے۔ اس میں سلامتی اور استحکام دونوں ہیں۔

عبادت کے انداز

جو دل اس بات پر ایمان لے آتا ہے کہ نفع اور نقصان صرف اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور حلال اور حرام قرار دینے کا اختیار بھی صرف اسی کو ہے۔ نیز مطلق اور لامحدود اطاعت و محبّت بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور خوفِ مطلق بھی صرف اسی سے لازم ہے اس دل میں اللہ تعالےٰ کی عظمت و کبریائی پُوری طرح سما جاتی ہے اور اسے "اللہ اکبر" کے حقیقی معنیٰ کا شعور حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی نظر میں اللہ کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز حقیر و صغیر ہو جاتی ہے۔

اور چونکہ انسانی اعمال میں سے بعض عمل ایسے ہیں جو تعظیمِ مطلق کی علامت ہیں مثلاً دُعا، نماز، رکوع و سجود، نذر، قربانی، تسبیح و تہلیل وغیرہ اس لیے مومن یہ اعمال صرف اللہ تعالےٰ کی خاطر کرتا ہے۔ ایک مومن نہ تو کسی دُوسرے کے لیے نماز پڑھ سکتا ہے

نہ رکوع و سجود کر سکتا ہے نہ کسی اور سے "سُبحانَکَ" کہہ سکتا اور نہ گناہوں کی مغفرت طلب کر سکتا ہے اس لیے کہ یہ سب تعظیمِ مطلق کے انداز ہیں جو عبادت کی رُوح ہے۔

تعظیم اور عبادت کا سب سے بڑا مظہر دُعا ہے لغوی اعتبار سے دُعا کے معنیٰ پُکارنے یا آواز دینے کے ہیں اور شریعت کسی زندہ شخص کو جو آپ کی آواز سُن سکے پکارنے یا اس سے مدد مانگنے سے منع نہیں کرتی تاکہ آپ اس کے علم یا قوت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ دراصل پکارنا یا بلانا اس وقت ہمارا موضوعِ بحث نہیں ہے۔ ہماری مُراد یہاں وہ دُعا ہے جو عبادت کی رُوح اور مغز ہے۔ یعنی ظاہری مادی اسباب و ذرائع موجود نہ ہونے کے باوجود فائدہ پہنچانے یا تکلیف دُور کر دینے کی درخواست کرنا۔ یہ وہ دُعا ہے جو بلا واسطہ صرف اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہیے اس کے سوا کسی دوسرے سے مانگنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ شفا بھی طبیب سے خواہ زندہ ہو طلب نہیں کرنی چاہیے۔ طبیب صرف دوا تجویز کر سکتا ہے۔ شفا دینا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ بنا بریں مناسب یہ ہے کہ شفا کسی غیر اللہ سے نہ طلب کی جائے۔ اسی طرح کسی مُردہ شخص اور بے جان چیزوں (پتھر وغیرہ) سے کوئی ایسی چیز مانگنا جس کا دینا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ناجائز ہے اس لیے کہ کسی سببِ ظاہری کے بغیر فائدہ پہنچانا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

ایک مومن کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ حصولِ مقصد کے لیے پہلے مادی اور ظاہری اسباب و ذرائع سے کام لیتا ہے۔ پھر ان اسباب کے کارگر ہونے کی درخواست دُعا کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے اور جن مقاصد کے لیے اسباب ظاہری کا ہمیں علم نہیں ان میں وہ صرف اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتا ہے۔ اور یہ یقین رکھتے ہوئے کہ اس کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہوا ہے اور وہ اپنے ہر بندے کی دُعا سُنتا ہے۔ اس سے مخاطب ہو کر التجا کرتا ہے کہ اے میرے معبود مجھے میرے مقصد میں

کامیابی عطا فرما۔ مومن نہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دُوسرے سے دُعا مانگتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتے وقت کسی دُوسرے کو اس کا شریک بناتا ہے اور نہ اپنے اور اپنے ربّ کے درمیان کسی غیر کو وسیلہ یا واسطہ بناتا ہے۔ یہی وہ دُعا ہے جو عبادت کا مغز اور رُوح ہے۔

عبادت کی غرض وغایت

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عبادت کا ایک ظاہری ڈھانچہ ہوتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو زبان سے ادا ہوتے ہیں اور وہ ارکان ہیں جو اعضاء جسم ادا کرتے ہیں اور عبادت کی رُوح وہ عقیدہ ہے جو عبادت پر آمادہ کرتا ہے اور وہ مقصد جس کے لیے عبادت کی جاتی ہے۔ عقیدے کے سلسلے میں کسی حد تک وضاحت پہلے ہو چکی ہے اس وقت میں مقاصدِ عبادت کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔

عبادت کا صحیح مقصد یہ ہے کہ عبادت کی وجہ اور اس کی غرض وغایت محض حصولِ رضائے باری تعالیٰ ہو۔ یعنی ہم عبادت مال وجاہ حاصل کرنے یا لوگوں کو خوش کرنے کے لیے نہ کریں اور نہ اسے دُنیاوی فوائد کے حصول کا ذریعہ بنائیں اور نہ اس کا مقصد نیک مشہور ہونا ہو۔ اور یہی درست مقصد "اخلاص" کہلاتا ہے اور عبادت میں جب دُوسرے مقاصد شامل ہو جاتے ہیں تو وہ ریا بن جاتی ہے اور جو چیز کسی عمل کے مقصد کا تعیّن کرتی ہے وہ "نیت" ہے۔ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ ہم سے ہمارے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کریں گے بلکہ اُس غرض وغایت اور مقصد ونیّت کے بارے میں پرسش ہوگی جس کے لیے عمل کیا گیا۔ بسا اوقات ایک عمل بطور خود اچھا ہوتا ہے لیکن مقصد دُرست نہیں ہوتا، نیّت نیک نہیں ہوتی اور اخلاص نہیں ہوتا اس صُورت میں نیکی بدی میں اور اچھائی بُرائی میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً نماز ایک نیک عمل ہے لیکن

پڑھنے والے کی نیت اگر ریاکاری ہوتا کہ لوگ اس کے نیک ہونے کا یقین کرلیں اور اس کی وجہ سے اسے مال یا تحائف دیں۔ اس کے پیشِ نظر اللہ تعالےٰ کا حکم بجالانا اور اس کی رضا کا حصول نہ ہو۔ تو بھی نماز ایک بُرا کام بن جائے گی۔ اگرچہ نماز بذاتِ خود ایک نیک عمل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مہاجرین کی ہجرت اپنے اپنے مقاصد اور نیتوں کی بنا پر ایک دُوسرے سے مختلف تھی۔ اگرچہ بظاہر سب کا عمل ایک جیسا تھا لیکن نتائج کے اعتبار سے کسی کا اچھا اور کسی کا بُرا۔ سب مہاجر سفر اور قطع منازل میں باہم شریک تھے۔ ایک ہی وقت اور ایک ہی راستے پر چلے تھے۔ اب جن کا مقصد اپنے دین کو بچالے جانا اور حصولِ رضائے الٰہی تھا، ان کا یہ سفر تو ہجرت فی سبیل اللہ ہُوا اور انھیں مُہاجر کا ثواب ملا۔ لیکن جس کی غرض مدینہ میں کسی عورت کو پیغام دے کر شادی کرنا تھا اور مہاجرین کو جاتے دیکھ کر اس نے دل میں سوچا کہ ان لوگوں کے ساتھ ہو جاؤں تاکہ اس عورت سے شادی کرنے میں سہولت رہے یا اس کا مقصد[1] تجارت کرنا تھا اور مہاجرین کے ہمراہ اس لیے چل پڑا کہ اپنا کاروبار کر سکے اور واحد یہی مقصدِ سفر تھا تو اس کی ہجرت صرف دُنیا کے لیے ہُوئی اللہ تعالیٰ کے لیے نہ ہُوئی۔

دراصل نیّت ہی وہ بنیاد ہے جو عادت اور عبادت میں امتیاز پیدا کرتی ہے مثلاً ایک شخص دیر سے اُٹھنے کی وجہ سے کھائے پیئے بغیر اپنے کاروبار کے لیے چلا جاتا ہے

---

[1] دراصل اس میں اشارہ ہے مشہور حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ الخ کے اس مضمون کی طرف فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ یعنی جس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اس کی ہجرت تو فی سبیل اللہ ہے اور جو کسی عورت سے شادی کرنے یا تجارت کرنے کی غرض سے ہجرت کر رہا ہے اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے شمار ہوگی وہ ثوابِ مہاجرین کا حقدار نہ ہوگا۔ (مترجم)

اور غروبِ آفتاب تک اس کے پیٹ میں کھانا پانی کچھ نہیں پہنچتا۔ بظاہر اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک روزے دار کرتا ہے۔ لیکن روزے کے ثواب سے محروم رہا۔ اس لیے کہ نہ اس نے روزے کی نیّت کی تھی اور نہ اس کا مقصد روزہ رکھنا تھا۔[1]

اس کے برعکس تمام روزمرّہ کے جائز کام جو انسان کرتا ہے اگر کرتے وقت کرنے والے کی نیّت ان کے ذریعے اللہ تعالےٰ کی رضا کا حصول ہو اور نیّت میں خلوص ہو تو بھی عادی امور اور روزمرہ کے کام اس کی عبادت بن جائیں گے۔ اسی بنا پر ہم نے یہ بات کہی تھی کہ تمام فائدہ بخش کام جو انسان کرتا ہے اگر وہ نیتِ خیر کے ساتھ انجام دیے جائیں تو عبادت بن جاتے ہیں۔ گویا ایک مُسلمان کی پوری زندگی عبادت ہے اس کا کھانا، پینا، اُٹھنا بیٹھنا، کمانا اور شادی کرنا سب خلوصِ نیّت کی وجہ سے عبادت بن جاتا ہے۔ دراصل ارشادِ باری تعالیٰ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝٥٦ الذاریات۔ "میں نے جنّوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے" کا صحیح مفہوم بھی اسی تعبیر سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس آیت میں لفظِ عبادت اسی وسیع معنیٰ میں استعمال ہوُا ہے۔ اور اسی اعتبار سے عبادت مقصدِ تخلیق ہے۔

خلاصۂ بحث

جو کچھ اُوپر بیان ہوُا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ توحید فی الاُلوہیۃ (عبادت میں اخلاص)

---

[1] یہ بات احناف کے اس مسلک سے متصادم نہیں ہے کہ اگر ایک شخص وضو کی نیت کیے بغیر اپنے اعضاءِ جسم دھولیتا ہے تو اس کا وضو ہو جائے گا۔ اس لیے کہ وضو بذاتہٖ مستقل عبادت نہیں ہے بلکہ وہ دوسری عبادت یعنی نماز کے لیے شرط ہے جس طرح نماز کے لیے دُوسری اور باتیں مثلاً کپڑوں کا پاک ہونا، جگہ کا پاک ہونا، سترِ عورت، وقت کا صحیح ہونا وغیرہ شرط ہیں۔

جولہ ایمان باللہ کی چوتھی اور سب سے اہم شق ہے یہ ہے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ ہر قسم کا نفع اور نقصان صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ بنابریں ہم ہر قسم کا نفع یا فائدہ صرف اس سے طلب کریں۔ اب اس سے طلب کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اُن قوانین طبیعہ سے استفادہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ ہیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ براہ راست اس سے دُعا مانگیں اور صرف اسی کے حضور درخواست کریں اور اس کے سوا کسی سے نہ مانگیں اور نہ مانگتے وقت کسی غیر کو اس کا شریک یا اپنے اور اپنے رب کے درمیان وسیلہ اور واسطہ بنائیں۔ اسی طرح استعانت بھی صرف اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے یا ان اسباب وسائل سے جنھیں خود اس نے مدد حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور اس میں بھی اس بات کا دھیان رہے کہ نافع حقیقی باری تعالیٰ ہے نہ کہ یہ اسباب و ذرائع جن سے ہم کام لے رہے ہیں۔ اسی طرح توحید فی الالوہیہ کی شرط یہ بھی ہے کہ ایسی محبت جو اطاعت مطلقہ کا باعث ہو وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے اور اللہ ہی سے ایسا خوف بھی جو حرام کاموں سے بچنے کا موجب ہو ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان تعظیم مطلق کے تمام مظاہر خواہ وہ قولی ہوں یا عملی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کردے اور صرف اسی کی رضا اس کا مقصد عبادت ہو۔ عبادت کے ذریعہ دنیا حاصل کرنا اور دُنیا والوں کی نظروں میں نیک اور اچھا بننا مطلوب نہ ہو۔

علمی تحقیق و اکتشاف

چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل عطا فرمائی ہے۔ اور یہ حکم بھی دیا ہے کہ ہم اس کائنات کے اسرار و رموز اور موجودات کے عجیب و غریب قوانین پر غور و فکر کریں جو خود اُسی نے وضع فرمائے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری ہم پر فرض ہے۔ بنابریں علوم طبیعہ اور موجودات کے رازوں سے پردہ اُٹھانا بھی عبادت ہے۔

بشرطیکہ ہم صرف اس قانون اور کائنات کے رازوں کو جان لینے پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ اس دریافت و انکشاف کے ساتھ ساتھ اس معبودِ برتر و برحق کے بارے میں بھی غور و فکر کریں جس نے یہ قوانین و اسرار بنائے ہیں۔ اس طریقہ پہ غور و فکر سے اللہ تعالیٰ پر ایمان بڑھے گا اور عبادت میں اخلاص پیدا ہوگا۔ دوسری شرط یہ ہے، کہ رموزِ فطرت کے اکتشاف و انکشاف سے جو علم ہمیں حاصل ہو اُسے انسانوں کی فلاح و بہبود میں استعمال کیا جائے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو ایسے کاموں میں نہ استعمال کیا جائے جو انسانوں کے لیے مضرت رساں اور ایذا کا موجب ہوں اور فساد فی الارض کا باعث بنیں۔

ایک شُبہ کا ازالہ

اکثر لوگ دریافت کرتے ہیں کہ آپ کا اس کافر کے بارے میں کیا خیال ہے جو انسانیت کے لیے مُفید کام سر انجام دیتا ہے، خیرات کرتا ہے، مدرسے کھولتا ہے، پناہ گاہیں اور ہسپتال بناتا ہے۔ کیا ان سب کاموں کے باوجود آپ کے نزدیک اس کے لیے آخرت میں کوئی ثواب نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نیکی کرنے والے مرد یا عورت کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔ ہر نیکی کرنے والے کو اس کے حسنِ عمل کا پھل ضرور ملتا ہے، بلکہ وہ تو ہر شخص کو اس کی خواہش اور طلب کے مُطابق اجر عطا فرماتا ہے۔ کیا کسی کے عمل کا سب سے بڑا اجر یہ نہیں ہے کہ کرنے والے کو وُہ کچھ دیا جائے جو وہ مانگے؟

اب معاملہ یہ ہے کہ نیک عمل کرنے والا اگر مومن ہے، اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور ثوابِ آخرت کا طلب گار ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ثوابِ آخرت عطا فرمائے گا۔ اور اگر وہ خود ہی دُنیاوی فوائد کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا اس کی خواہش شہرت

اور نیک نامی ہے ، وہ چاہتا ہے کہ اخبارات اس کے بارے میں مضامین لکھیں، اور تاریخ کے صفحات میں اس کا نام زندہ رہے تو اُسے بھی اس کا مطلوبہ مقصد مل جاتا ہے۔ جب وہ خود آخرت میں اپنے لیے کچھ چاہتا ہی نہیں تو آپ اس سلسلے میں کیوں پریشان ہوتے ہیں، اسے اگر ثواب آخرت نہیں ملتا تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟

ایک بیکار بحث

علم کلام کی کتابیں ذات وصفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں ابحاث سے پُر ہیں مثلاً اس قسم کے نکتے اٹھائے گئے ہیں کہ باری تعالیٰ کا "علم" ذاتی ہے یا اس کا علم صفت "علم" کی وجہ سے ہے۔ پھر "صفات ذاتیہ" مثلاً "علم"، "قدرت" وغیرہ اور "صفات فعلیہ" مثلاً "خلق"، "رزق" وغیرہ میں تفریق کی گئی ہے۔ پھر کلام باری تعالیٰ کے بارے میں بھی بحث ومناظرہ کا ایک اور عظیم اور لاحاصل فتنہ کھڑا کر رکھا ہے جس کا مقصد یہ الجھنیں پیدا کرنا تھا کہ آپ بتائیں قرآن مجید "قدیم" اور غیر مخلوق ہے یا مخلوق یعنی "حادث" ہے، خوبیوں کی نسبت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو سکتی ہے تو بُرائیوں کی نسبت اس کی طرف ہو سکتی ہے یا نہیں، صالح کون ہے اور اصلح کون، قضا کیا ہے اور قدر کیا؟ انسان کو ارادہ واختیار دیا گیا ہے یا نہیں اور اسی قسم کی فضول بحثیں۔ دراصل اس قسم کے مسائل میں بہترین اور درست طریق کار یہ ہے کہ ان پر بحث ومناظرہ نہ کیا جائے۔ ویسے بھی اگر ہم ان مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے وقت عدالتی زبان استعمال کریں تو ہم کہیں گے یہ دعویٰ ہی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر "ناقابل سماعت" ہے۔

۱۔ اس لیے بھی کہ اُمت کے سلف صالحین (صحابہ کرام اور تابعین کبار رضوان اللہ علیہم) جو کہ مسلمانوں میں سب سے افضل اور اُمت مسلمہ کے منتخب افراد تھے ان مسائل

سے نہ تو واقف تھے اور نہ انھوں نے اس انداز میں کبھی بحث و مناظرہ کیا اور ان کا مسلک ہی سب سے زیادہ باعثِ سلامتی ہے اور ان کا ایمان ہی سب سے زیادہ صحیح تھا۔ اور یہی لوگ دین کے معاملات میں ہمارے امام ہیں۔

۲- جو شخص بھی ان اختلاف پیدا کرنے والے فرقوں کے مسائل و اقوال پر غور و تحقیق کرے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ ان تمام مسائل و ابحاث کی بنیاد صرف یہ ہے کہ انھوں نے خالق کو مخلوق پر قیاس کر لیا تھا اور انسانی عقل کی منطق اور انسانی نفس کے احوال کو اللہ تعالیٰ پر منطبق کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ بکسر غلط طریقِ کار تھا۔ خالق ہرگز مخلوق کی مانند نہیں ہے قرآن مجید میں صاف بتا دیا گیا ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ الشوریٰ (۱۱) "کوئی چیز اس کے مثل نہیں"۔

۳- یہ سب مسائل ہماری دنیا سے ماوریٰ ہیں اور عالمِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں اور ایمان کے قواعد میں سے پانچویں قاعدے میں یہ بات تفصیل سے بیان ہو چکی ہے کہ عقل کا حکم صرف مادی دنیا اور مادی امور تک محدود ہے۔ عقل ماورائے مادہ پر حکم لگانے اور اس کا ادراک کرنے سے عاجز و قاصر ہے۔

ان مسائل میں بہترین طریق کار

میں آپ کو ایک نئی سمت میں دعوت دیتا ہوں اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ زیادہ مفید اور حق سے قریب تر ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم موضوعِ بحث کو ذات و صفاتِ باری تعالےٰ کی بجائے انسانی زندگی میں ایسے راہِ عمل کی طرف موڑ دیں جو رضائے الٰہی کے حصول کا باعث بنے اور اس قسم کی لاحاصل بحثیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے۔ یا صفاتی چھوڑ کر ہم یہ کہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے، ہمارا ظاہر و باطن اس پر عیاں ہے، ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل و معاملات کا ہر پہلو اس کے

سامنے ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ایسا راستہ اختیار کریں جو ہمارے رب کی بھیجی ہوئی شریعت کے مطابق ہو۔ تاکہ اس کے علم میں ہمارے متعلق ایسی باتیں آئیں جو اسے ہم سے راضی رکھیں۔

یہ تو ایک درست طریقہ ہوگا۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے والوں اور ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں بحث و جدال اور مناظرہ کرنے والوں کی مثال۔ طلباء کے ان دو گروہوں کی سی ہے جن کو بتایا جائے کہ عنقریب وزارتِ تعلیم کی طرف سے ایک بااختیار کمیٹی آئے گی جو طلباء کا امتحان لے گی اب ان میں سے جو طلبا سمجھ دار ہونگے وہ تو یہ سوچ کر کہ امتحان ہونے والا ہے۔ امتحان کی تیاری کریں گے کتابیں پڑھیں گے اور مقررہ نصاب اچھی طرح یاد کریں گے اور جو بے وقوف ہوں گے وہ ایسے سوالات کریں گے کہ ان کا امتحان کس انداز کا ہوگا، کیا سب کے سب امتحان لیں گے یا چند افراد، ان کی تعداد جفت ہے یا طاق۔ یہ لوگ کار کے ذریعہ آئیں گے، یا طیارے سے وغیرہ؟ اور مسلسل اسی قسم کی باتوں میں مصروف رہ کر اپنا وقت ضائع کریں گے حتیٰ کہ امتحان کا دن آجائے گا اور وہ اس کے لیے قطعاً تیار نہ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ روزِ قیامت "علم الکلام" کے ان مباحث کے بارے میں (جن پر انھوں نے اپنے اختلافات کی بنیاد رکھی ہے اور مختلف فرقے بن گئے ہیں اور جن موضوعات پر انھوں نے کتابوں کے انبار لگا دیے ہیں) کچھ دریافت نہ فرمائیں گے۔ یہ مسائل اگر ایمان کی شرط ہوتے تو سب سے پہلے ان پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بحث فرماتے چونکہ ان مقدس ہستیوں نے ان مسائل سے صرفِ نظر کیا تھا۔ اس لیے ہمیں بھی انھیں چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ سب مباحث فلسفہ یونان کی یادگار ہیں جس کی بساط اب اُلٹ چکی ہے۔ اس کے اکثر نظریات غلط ثابت ہو چکے ہیں اور دلائل بے وزن ہو گئے ہیں۔ اس کی جگہ اب علمِ "مابعد الطبیعات"

(میٹا فزکس) نے لے لی ہے۔ یہ بھی ایک نیا فلسفہ ہے جو شبہات پیدا کرنے اور گمراہ کرنے میں اس قدیم فلسفہ سے کچھ کم نہیں ہے۔ بنا بریں ہمیں صرف کتاب اللہ کو پیش نظر رکھنا اور اسی پر اعتماد کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں جن امورِ غیبیہ کا ذکر ہے ان میں سے ابھی صرف چند معرضِ ظہور میں آئے ہیں۔ ہم ان سب اُمور پر ایمان لاتے ہیں جو اس میں بیان ہوئے ہیں اور ان میں سے جو بات ہماری سمجھ میں نہ آسکے اسے اس کے نازل کرنے والے کے سپرد کرتے ہیں۔

○

مظاہر ایمان

○

- ایمانِ کامل کے آثار مومن کے عمل اور طرزِ حیات میں نمایاں نظر آتے ہیں۔
- شریعت کا حکم ہے کہ انسان پہلے ہر قسم کی تدابیر اور ذرائع اختیار کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگے کہ وہ اس کوشش اور عمل کے مثبت نتائج عطا فرمائے۔
- توکّل یہ نہیں ہے کہ آپ تدابیر اور اللہ کے بنائے ہوئے نوامیسِ فطرت سے کام لینا چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے انتظار کرتے رہیں۔
- مومن کے نقطۂ نگاہ سے دینی رشتہ خونی رشتہ سے زیادہ محکم اور عقیدے کا رابطہ نسبی رابطے سے زیادہ قوی ہے۔

○
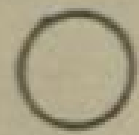
ایمان کی نشانیاں

جو طالب علم یہ جانتا ہو کہ امتحان قریب ہے، اس کے انعقاد میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ پھر بھی اگر وہ اس کے لیے تیاری نہ کرے اور کھیل کود میں مشغول رہ کر امتحان سے لاپروائی اختیار کرے تو اس کے متعلق سمجھنا چاہیے کہ اسے امتحان سر پر آجانے کا پختہ یقین نہیں ہے۔ اسی طرح وہ بھٹکا ہوا مسافر جسے آپ نے منزل کا راستہ بخوبی سمجھا دیا ہو اور بظاہر آپ کی بات مان کر اس پر یقین کا اظہار بھی کر رہا ہو لیکن (آپ کے بتائے ہوئے) داہنے ہاتھ جانے کی بجائے بائیں سمت چلنے لگے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اسے راہ نما کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ایمان کامل ہو تو اس کے آثار مومن کے عمل اور طرز و روش سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ایمان اور عمل

ایمان کو عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ عمل ایمان کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ یہی وہ علامت ہے جس سے لوگوں کو کسی کے مومن ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایمان اور عمل صالح کو ساتھ ساتھ اور یکجا بیان کیا ہے ارشادات باری تعالیٰ ملاحظہ کیجیے ا۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ

إِيمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط الانفال (۲-۳)

"سچے اہلِ ایمان تو وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سُن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔"

۲- اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ط النور۔ (۶۲) "مومن تو دراصل وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔"

۳- قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝۲ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝۴ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹ المومنون۔ "یقیناً فلاح پائی ہے ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں لغویات سے دور رہتے ہیں، زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو اُن کی ملکِ یمین میں ہوں کہ ان پر (محفوظ نہ رکھنے

ہیں) وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔"

۴۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط البقرہ (۱۷۷) "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو یوم آخر کو اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے۔ اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال، رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکاۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔"

ایمان میں کمی بیشی

بعض علماء کا خیال ہے کہ ایمان عقیدہ ہے جو تجزیہ (کمی بیشی) قبول نہیں کرتا ان کے مطابق عقیدے کے لحاظ سے کوئی شخص یا تو صرف مومن ہو سکتا ہے یا کافر تیسری صورت ممکن نہیں۔ لیکن جمہور کا مسلک یہ ہے کہ چونکہ ایمان عملِ صالح سے علیحدہ نہیں ہو

سکتا اور عمل کم و بیش ہوتا رہتا ہے اس لیے ایمان بھی کم و بیش ہوتا ہے۔ اور یہی وہ مسلک ہے جس کی تائید قرآن مجید سے ہوتی ہے۔ ارشاداتِ باری تعالیٰ ملاحظہ کیجیے (۱) وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا - الانفال (۲) "جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔" (۲) فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا التوبہ (۱۲۴) "جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سورت نے) اضافہ ہی کیا ہے۔" (۳) وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَّتَسْلِيمًا ط الاحزاب - (۲۲) اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔"

ترکِ عمل سے انسان کافر نہیں ہوتا

تمام علماء اہلِ سنت اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے لیکن اس کام کو حرام سمجھتا اور مانتا ہے یا کوئی فرض ترک کر دیتا ہے لیکن اس کے فرض ہونے کو تسلیم کرتا ہے تو اسے آخرت میں عذاب تو ملے گا لیکن وہ کافر نہیں ہو گا اور نہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے اَلزَّانِي لَا يَزْنِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ "زانی شخص زنا کرتے وقت مومن نہیں رہتا"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زنا کرتے وقت اسے یہ یاد نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر اسے یہ بات یاد رہے تو اسے اللہ تعالیٰ سے شرم آئے اور زنا نہ کر سکے۔ اس کی مثال اس فاسق شخص کی سی ہے جو زنا کے لیے آمادہ ہو اور اُسے محسوس ہو کہ اس کا باپ جھانک رہا ہے جو اسے دیکھ لے گا۔ کیا اس صورت میں وہ اپنا کام جاری رکھ سکے گا۔ یا باپ سے شرما کر زنا سے باز آ جائے گا؟ ظاہر ہے اگر باپ کی شرم بُرا کام کرنے سے روک سکتی

ہے تو اگر ایک مُسلمان کو یہ یاد ہو کہ اس کا ربّ اسے دیکھ رہا ہے تو وہ گناہ سے کیوں نہ باز آئے گا۔

ایمان کے فوائد

ایمان کا ثمرہ اور فائدہ یہی قلبی عمل ہے جس کا خلاصہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ایک مشہور ارشاد میں جسے "جوامع الکلم" کہا جا سکتا ہے۔ ایسے جامع اور قطعی انداز میں بیان فرما دیا ہے کہ کسی انسان کا اندازِ بیان فصاحت و بلاغت اور جامعیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور جو آپؐ کے شواہد نبوت میں سے ہے "احسان" کی تعریف بیان کرتے ہُوئے آپؐ نے فرمایا: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ "اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہ دیکھ سکو گے تو وہ تو تمھیں ضرور دیکھ رہا ہے۔

ذِکر

ایمان کے ثمرات میں سے پہلا ثمرہ ہر وقت اللہ کو یاد رکھنا ہے۔ میں نے کسی بزرگ کے بارے میں جن کا نام مجھے یاد نہیں کہیں پڑھا تھا کہ ان کے سلوک کی ابتدا اس طرح ہُوئی۔ ان کے ایک نیک اور عبادت گزار ماموں تھے، انھوں نے ایک دن اپنے ماموں سے کہا کہ مجھے ایسے اعمال بتائیے جن کے نتیجہ میں مَیں آپ جیسا ہو جاؤں۔ انھوں نے کہا کہ ہر روز تین مرتبہ کہا کرو: "اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میری ہر بات سے باخبر ہے"۔ انھوں نے ایک ہفتہ یہ وِرد جاری رکھا اس کے بعد ان کے ماموں نے حکم دیا کہ روزانہ ہر نماز کے بعد تین بار یہی فقرے دُہراؤ۔ انھوں نے یہ عمل بھی شروع کر دیا مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔ پھر انھوں نے حکم دیا کہ اب یہی بات زبان ہلائے بغیر دل میں دہراتے رہو،

اس طرح تم دائم الذکر اور ہر وقت اللہ کی طرف دھیان رکھنے والے ہوجاؤ گے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جتنا ذکر کا حکم دیا ہے کسی اور چیز کا نہیں اور جتنی تعریف ذکر کرنے والوں کی فرمائی ہے کسی اور کی نہیں فرمائی۔ عربی لغت کی رُو سے جس میں قرآن حکیم نازل ہُوا ہے ذکر دو قسم کا ہے ایک دل میں یاد رکھنا اور دوسرا زبان سے ذکر کرنا۔ اور یہ دونوں قسمیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ دل کے ذکر کی مثال اس آیت میں بیان ہُوئی ہے:
فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ز وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَهٗ ج الکہف (۶۳)
"مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر بھول گیا"۔
"اَنْ اَذْکُرَهٗ" سے یہاں یاد رہنا مُراد ہے۔ اسی طرح اُذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰی وَالِدَتِكَ۔ المائدہ (۱۱۰) "یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی"۔ یا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ المائدہ (۱۱) "اے ایمان والو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے"۔ یہاں بھی ذکر سے مُراد دل میں سوچنا اور یاد کرنا ہے۔

اور زبان سے ذکر کی مثالیں قرآن مجید میں یہ ہیں: ۱۔ وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ ۔ مریم (۴۱) ۔ ۲۔ وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ ۔ مریم (۱۶) ۳۔ اُذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ز ۔ یوسف (۴۲) ۴۔ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ ۔ المائدہ (۴) ان سب آیتوں میں ذکر سے مُراد زبان سے ذکر کرنا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ میں ذاکر کی خُوبی پیدا ہو جائے تو اپنے دل میں یعنی شعور میں اللہ کو یاد کیجیے خواہ تنہا ہوں یا کسی محفل میں، بازار میں ہوں یا راہ گزر میں، ہر وقت اور ہر حال میں یہ بات یاد رکھیے کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے چنانچہ آپ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جو آپ کے رب کو ناپسند ہو۔ کوئی فرض ادا کریں تو یہ ذہن میں ہو کہ اللہ کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اسی طرح اگر حرام کاموں سے بچیں تو اس خیال سے کہ

ان سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، مباح کام کرتے وقت بھی آپ کی نیت ایسی ہونی چاہیے کہ آپ ثواب کے مستحق ہوں اور اگر کسی وقت آپ کے سامنے دو راستے آجائیں تو ان میں سے وہ راہ انتخاب کیجیے جو آپ کو جنت سے قریب کرے اور جہنم سے دور لے جائے اور اگر کبھی بھول کر گناہ کر بیٹھیں اور پھر آپ کو احساس ہو کہ آپ نے غلط کام کیا ہے تو فوراً توبہ کیجیے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیے: اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ؕ الاعراف (۲۰۱)۔

"حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقِ کار کیا ہے۔"

علاوہ ازیں زبان سے بھی اللہ کو یاد کیجیے اس لیے کہ بہترین ذکر زبان کا ذکر ہے بشرطیکہ حضورِ قلب میسر ہو۔ اگر ذہن غائب ہو اور جو کچھ آپ زبان سے ادا کر رہے ہیں دل میں نہ اترے تو یہ ذکر کلام مہمل ہوگا بے مقصد اور بے معنیٰ۔ جس طرح شام میں کیک بیچنے والے آواز لگاتے ہیں "اللہ کریم"۔ ان کا مقصد ذکرِ الٰہی نہیں بلکہ کیک فروخت کرنا ہوتا ہے۔ یا سبزی فروش پکارتے ہیں۔ "اللہ دائم" وغیرہ اور کبھی کبھی زبان کا ذکر گناہ بھی بن جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص شراب پیتے وقت بسم اللہ پڑھے یا پیشہ ور گانے والیوں کے فحش گیتوں پر سبحان اللہ کہا جائے۔ ایسے موقع پر کہنے والے کا مقصد اگر طنز و استہزا ہو اور اس بات کا کوئی واضح ثبوت موجود ہو کہ اس نے اس انداز سے ہنسی اڑائی ہے تو وہ شخص کافر ہو جائے گا۔

سب سے بہتر ذکر تلاوتِ قرآن مجید ہے۔ سوائے ان مواقع کے جن کے لیے شارع علیہ السلام نے مخصوص اذکار تلقین فرمائے ہیں۔ مثلاً رکوع و سجود کی تسبیحیں یا وہ دعائیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور و منقول ہیں۔

آج کل جن محفلوں کو محفلِ ذکر کہا جاتا ہے جن میں رقص (وجد و حال) کا رواج

ہے اور اس رقص میں قیام و رکوع اور جھکنے اور سیدھا کھڑے ہونے کی متوازن حرکات ہوتی ہیں۔ مخصوص نغمے گائے جاتے ہیں اور صاحبِ "وجد" کلمہ طیبہ کی بجائے اکثر آہ، اوہ یا اَخ، قسم کی مبہم آوازیں نکالتا ہے۔ بنا بریں "رسائل ابن عابدین"[1] میں (جو حنفی مسلک کی معتمد کتاب ہے) لکھا ہے کہ یہ عمل حرام ہے البتہ اگر صاحبِ "وجد" مغلوب الحال ہو اور اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو اور یہ حرکتیں ارادۃً نہ کر رہا ہو بلکہ اس کا باعث غلبۂ جذبات اور مستیٔ حال ہو (تو حرام نہیں ہے) لیکن اس کے باوجود اگر اس عمل کو حلال سمجھے گا تو اس پر کفر کا حکم لگ جائے گا

کیفیتِ بیم و رجا

مومن جہاں ہر وقت عذابِ الٰہی سے ڈرتا رہتا ہے، اس کی اُمیدِ بخشش سے بھی سرشار رہتا ہے۔ جب اسے خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سریع الحساب اور شدید العقاب ہے تو اس پر خوف کا غلبہ طاری ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے یاد آتا ہے کہ وہ غفور الرحیم اور ارحم الراحمین ہے تو اس پر اُمید غالب آ جاتی ہے۔ ایمان میں یہ دوگونہ کیفیت اس بنا پر ہے کہ انسان پر اگر ہر وقت خوف کا ہی غلبہ رہے اور اس کا دل اتنا متاثر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی مایوس ہو جائے تو وہ اس آیت کا مصداق بن جائے گا۔

اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۷) یوسف۔ "اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہُوا کرتے ہیں۔" اور اگر اس کے دل میں ہر وقت صرف اُمید ہی موج زن رہے اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بے نیاز ہو جائے تو اس پر یہ آیت صادق آئے گی: فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (۹۹) الاعراف۔ "اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔"

---

[1] رسائل ابن عابدین (شامی)۔ مطبع امیریہ جلد ثالث۔ صفحہ ۳۰۷ (مصنف)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ خالق تعالیٰ شانہٗ مخلوق سے مشابہ نہیں ہے۔ بنابریں اس سے ڈرنے کا انداز بھی وہ نہیں ہے جیسے مخلوق سے ڈرا جاتا ہے۔ مثلاً آپ تنہا اور نہتے ہوں اور کوئی شیر کچلیاں نکالے دھاڑتا ہوا آپ پر حملہ آور ہو جائے تو آپ یقیناً ڈر جائیں گے، لیکن اللہ تعالےٰ کا خوف شیر سے ڈرنے کی مانند نہیں ہے۔ شیر کا خطرہ آپ کی جان پر سے ٹل بھی سکتا ہے لیکن اگر اللہ تعالےٰ جو شیر کا خالق اور رب ہے۔ آپ کو شیر کے حوالے کرنا چاہے تو اس کا فیصلہ جو اس نے آپ کے خلاف صادر فرما دیا ہے کوئی ٹال نہیں سکتا۔

اسی طرح گرجتا چنگھاڑتا سیلاب بڑھا چلا آرہا ہو اور آپ اس کی گزرگاہ میں کھڑے ہوں، بچنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی ہو، ایسی حالت میں بھی آپ ضرور خوف محسوس کریں گے لیکن یہ خوف بھی جناب باری تعالیٰ سے خوف کی مثل نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ میں تو یہ قدرت ہے کہ اگر چاہے تو سیلاب کو روک سکتا ہے، خشک کر سکتا ہے اور لوٹا بھی سکتا ہے۔ پھر سیلاب سے تو فرار بھی ممکن ہے اور بچنے کا بھی امکان۔ لیکن عذابِ الٰہی جب آئے گا تو اس سے فرار ممکن نہ ہو گا۔ انسان بیماری سے، بلاؤں سے دوستوں کے بچھڑنے سے خائف رہتا ہے لیکن یہ خوف بھی اللہ تعالیٰ کے خوف جیسا نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں بھی تو اسی کے اختیار میں ہیں وہ چاہے تو آپ کو مصیبت میں گرفتار کر دے اور چاہے تو محفوظ رکھے۔ اس کائنات میں دوسری کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی مصیبت کو ٹال سکے۔

بنابریں مومن پر لازم ہے کہ وہ خوف و رجا کی کیفیت میں رہے جب نماز کے لیے کھڑا ہو اور زبان سے رحمٰن و رحیم کے کلمات ادا کرے تو امید و رجا کی کیفیت محسوس کرے اور جب مالکِ یوم الدین کہے تو اس پر خوف طاری ہو۔ آج کل اکثر مسلمانوں پر خوف کے مقابلے میں رجا کی کیفیت کا زیادہ غلبہ ہے۔ اور معاف کر دیے جانے کی توقع اور آرزو عذاب سے بچنے کی کوشش پر غالب ہے۔

علاوہ ازیں اگر مسلمان دینی فرائض ادا کرتا رہے (خواہ مستحبات کا تارک ہو) اور حرام کاموں سے بچا رہے (خواہ مکروہات[1] سے نہ بچ سکے) تو اس کا شمار بھی اللہ سے ڈرنے والے متقیوں میں ہوگا لیکن جنّت میں بلند درجات سے محروم رہے گا۔ اس کی مثال اس طالب علم کی سی ہے جو کم درجے کی کامیابی حاصل کرتا ہے نہ امتیازی نہ معیاری۔ اسے کلاس سے تو نہیں اُتارا جاتا ہے البتہ اس کی کامیابی اوسط درجے کی ہوتی ہے۔

توکّل

جناب باری کا ارشاد ہے: اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا۔ یونس (۸۴) "اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو۔" نیز ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۵۹ آل عمران۔ "اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔"

ان آیات میں جس توکّل کا ذکر ہے وہ دراصل کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟

ہم پہلے یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو اشیا پیدا فرمائی ہیں، وہ فائدہ بھی دیتی ہیں اور نقصان بھی پہنچاتی ہیں۔ اسی طرح قوانینِ طبعیہ نفع کا سبب بھی ہیں اور نقصان کا بھی۔ تو کیا توکّل کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اس کائنات کی اشیاء۔ اور قوانین طبعیہ کے نفع و نقصان سے صرف نظر کر دیں اور تدابیر و اسباب سے کام لینا چھوڑ دیں؟

گروہِ صوفیا میں ہمیں کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو ترکِ اسباب و تدابیر کو ہی توکّل خیال کرتے ہیں۔ یہ لوگ روزی کمانے کے لیے بھی کام نہیں کرتے بلکہ منتظر

---

[1] مکروہات سے مراد مکروہ تنزیہی ہے نہ کہ تحریمی۔ یعنی جو گناہ صغیرہ کا ارتکاب تو کرتا ہے، لیکن کبائر سے بچا رہتا ہے۔ (مصنّف)

رہتے ہیں کہ ان کا مقسوم ہاتھ ہلائے بغیر ان تک پہنچ جائے، مریض کا علاج نہیں کرتے اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ دوا کے بغیر ہی شفا حاصل ہو جائے گی۔ صحراؤں میں سفر کرتے وقت زادِ راہ ساتھ نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ رزق مشقّت کے بغیر انھیں ملتا رہے گا۔ تعلیم حاصل کرنے کے مخالف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ علم از خود حاصل ہو جائے گا۔ یہ سب باتیں شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ہیں۔ شریعت کا تو حکم ہے: فَانْتَشِرُوا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔ الجمعہ (۱۰) "تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو۔" نیز ارشادِ نبویؐ ہے یَا عِبَادَ اللّٰہِ تَدَاوَوْا۔ "اے اللہ کے بندو! بوقتِ ضرورت دوا استعمال کرو۔" نیز حکم ہے وَتَزَوَّدُوْا البقرہ (۱۹۷) "سفر میں زادِ راہ لے کر چلو۔" نیز مشہور حدیث ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ۔ "تحصیل علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔"

غیر مسلم معاشرے میں جو مادی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور صرف مادی زندگی ہی اس کا مقصدِ حیات ہے۔ بہت سے لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ مادی ذرائع ہی حصول نتائج کا واحد سبب ہیں یعنی دوا از خود شفا دیتی ہے اور کوشش و جد و جہد ہی کسی مقصد کو حاصل کرنے کا حقیقی ذریعہ ہے۔ حالانکہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بسا اوقات تمام اسباب و ذرائع موجود اور مہیا ہوتے ہیں لیکن نتائج مطلوبہ حاصل نہیں ہوتے۔ کئی بار آپ دوا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن شفا حاصل نہیں ہوتی۔ بارہا ہسپتال کے ایک ہی کمرے میں ایک ہی مرض کے دو مریض ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر بھی ایک ہی ہوتا ہے، دوائیں بھی ایک ہی قسم کی دی جاتی ہیں لیکن ان میں سے ایک مر جاتا ہے اور دوسرا تندرست ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات کسان جدید ترین آلات سے زمین کاشت کرتا ہے، بہترین بیج استعمال کرتا ہے۔ قیمتی کھاد ڈالتا ہے لیکن شدید گرمی یا سردی کی لہر آجاتی ہے، یا جھلسا دینے والی خشک سالی یا سب کچھ بہا لے

جانے والا سیلاب آ جاتا ہے اور تمام کوششیں اور تدابیر ضائع ہو جاتی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ نہ تو محض اسباب وتدابیر ہی حتمی نتائج کا باعث ہیں اور نہ تدابیر کا ترک کر دینا معقول طریقِ کار ہے۔ بلکہ عقل کا تقاضا بھی اور شریعت کا حکم بھی یہ ہے پہلے تمام ذرائع اور تدابیر اختیار کی جائیں پھر حصولِ نتائج کے لیے اللہ تعالےٰ سے دعا مانگی جائے۔ " بر توکّل زانوے اشتر بہ بند" اونٹنی کو رسّی سے باندھو اور اللہ پر توکّل کرو۔ اپنے اسباق پُوری طرح یاد کرو اور اللہ تعالےٰ پر توکّل کرتے ہُوئے امتحان میں کامیابی کی دُعا مانگو۔

حقیقی توکّل یہی ہے اسباب سے صرف نظر اور قوانینِ فطرت سے کام نہ لینا بھی توکّل نہیں ہے اور یہ بات بھول کر کہ ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ غیر اللہ سے حقیقی فائدے کی اُمید رکھنا بھی توکّل کے خلاف ہے اسباب وتدابیر بھی ضروری ہیں۔ اسباب سے کام لینے کا حکم شریعت نے بھی دیا ہے۔ اور فطری قوانین کی بجاآوری بھی اسی طرح ہو سکتی ہے لیکن چونکہ نتائج کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اس لیے محض مادی اسباب وذرائع اختیار کر لینا بھی کافی نہیں ہے۔ بنابریں حقیقی متوکّل علی اللہ وہ شخص ہے جو حصولِ مقصد کے لیے اپنی پوری کوشش بروئے کار لائے اور تمام تدابیر سے کام لے اور یہ یقین رکھے کہ کامیابی عطا فرمانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ اسی پر توکّل کرے اور اسی سے اپنے مقاصد میں کامیابی کی دُعا مانگے۔

شُکر

حقیقی شکر گزاری یہ ہے کہ تمام تر کوشش اور دُعا کے بعد بھی کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو بندہ اپنے رب کی رضا پر راضی رہے: وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ۔ النمل (۴۰)

"اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے"۔ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○ ۱۴۴۔ آل عمران" البتہ جو شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا"۔ شکر دراصل ایمان کا پھل ہے۔ انسانوں میں سے بھی اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے۔ اور آپ اس کا شکریہ ادا نہیں کرتے تو آپ نہ صرف کوتاہی کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ بدسلوکی کے مرتکب ہیں، حالانکہ وہ تو صرف ایک ذریعہ ہے۔ محسن حقیقی دراصل اللہ تعالیٰ ہے جس نے آپ کو سمع و بصر کی نعمت سے نوازا، صحت و امن کا انعام عطا کیا اور آپ کے لیے دُنیا کی تمام چیزیں مسخر کیں۔ بلکہ ان کے علاوہ بھی آپ کو اتنی اور ایسی ایسی نعمتیں بخشیں جن کا شمار اور احاطہ ممکن نہیں۔ دراصل انسان کو کسی نعمت کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف اس کے نہ رہنے کے بعد ہوتا ہے۔ اگر دانت میں درد ہو رہا ہو تو انسان خیال کرتا ہے کہ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ درد دُور ہو جائے پھر جب درد دُور ہو جاتا ہے تو یہ نعمت اسے یاد بھی نہیں رہتی۔ اگر کسی کو کسی وقت ایک روپے کی ضرورت پڑ جائے اور وہ اسے کسی صورت نہ ملے تب اسے دولت کی قدر معلوم ہوتی ہے لیکن پھر جب یہی شخص دولت مند ہو جاتا ہے تو اُسے دولت کی اہمیّت یاد نہیں رہتی۔ اسی طرح اگر بجلی کا رابطہ منقطع ہو جائے اور پُورا گھر تاریکی میں ڈُوب جائے اس وقت احساس ہوتا ہے کہ روشنی کتنی بڑی نعمت ہے لیکن پھر جب روشنی لوٹ آتی ہے تو اس نعمت کی قدر و قیمت کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

اگر ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار اور احاطہ نہیں کر سکتے تو کیا اس کا شکر بھی ادا نہ کریں، نہیں! اس کا شکر ادا کیجیے، زبان سے شکر اس طرح ادا کیجیے کہ اس کی حمد و ثنا میں رطبُ اللّسان رہتے ہُوئے کہیے الحمدللہ اور رَبّ لَکَ الْحَمْدُ۔ اے اللہ تیرا شکر ہے اور میرے رب سب تعریف صرف تیرے ہی لیے ہے۔ اور اپنے عمل سے اس طرح شکر ادا کیجیے کہ جو نعمتیں اللہ نے آپ کو عطا کی ہیں ان میں سے ان لوگوں کو حصّہ

دیجیے جوان نعمتوں سے محروم ہیں۔ دولت مند کا شکریہ ہے کہ غریبوں کی مالی اعانت کرے۔ طاقت ور کا شکریہ ہے کہ کمزوروں کی مدد کرے۔ با اختیار لوگوں کا شکریہ ہے کہ حق داروں کو ان کا حق دلوائیں اور عدل و انصاف کریں۔ اگر آپ خوشحال ہیں آپ کے دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے ہیں اور آپ، کا ہمسایہ بھُوکا ہے تو آپ ناشکر گزار ہیں خواہ آپ زبان سے ہزار بار الحمدللہ کہیں اور دل سے اپنے خالقِ منعم کا شکر اس طرح ادا کیجیے کہ ہمیشہ اس کی رضا پر راضی رہیے اور جو آپ کا مقسوم لکھ دیا گیا ہے اس پر قانع رہیے، نہ تو اپنی حالت پر کڑھیں اور موجود نعمتوں کو کم سمجھیں اور نہ کسی دُوسرے سے (اس پر اللہ کے انعامات کی وجہ سے) حسد کریں۔

جس شخص میں شکر گزاری کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے:

۱۔ دل سے اس کا شکر ادا کرے اور محروم لوگوں کی مدد کر کے اپنے:
۲۔ عمل سے شکر کا اظہار کرے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان رہتے ہوئے:
۳۔ زبان سے اس کا شکر ادا کرتا رہے وہ یقیناً شکر گزار بندہ بن جائے گا۔

صبر

مسلمان کے لیے دوگونہ نعمتیں ہیں۔ اگر اسے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو اسے اس کا اجر و ثواب ملتا ہے اور اگر اُسے کوئی نقصان پہنچتا ہے اور اس پر صبر اختیار کرتا ہے تب بھی اسے اجر و ثواب ملتا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے کسی شکر گزار دولت مند کے اجر و ثواب کا موازنہ اگر کیا جا سکتا ہے تو صرف کسی غریب صابر شخص کے اجر و ثواب سے کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس غریب کا اجر دولت مند کے اجر سے بھی زیادہ ہے، دیکھیے: یہ

الَّذِینَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ ۹۶ النحل۔ "اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔"

یہ دُنیوی زندگی صرف عیش و راحت ہی نہیں اس میں تکلیف و مشقّت بھی ہے۔ بیماری، مفلسی، پیاروں کی جُدائی، دوستوں کی بے وفائی اور امن سے محروم ہو جانا یہ سب چیزیں اس زندگی کے مزاج کا ناقابلِ تغیّر و تبدّل عنصر ہیں۔

گو سراپا کیف عشرت ہے شرابِ زندگی اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

اور۔ ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

"تلخیاں زندگی کی فطرت کا جزوِ لاینفک ہیں اور تو چاہتا ہے کہ زندگی ہر بدمزگی اور کدورت سے پاک ہو۔ زمانے یعنی زندگی سے اس کے مزاج کے خلاف مطالبہ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو پانی کے اندر آگ کی چنگاری تلاش کرے۔"[1]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ ۱۵۵۔ البقرہ "اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں گے انھیں خوشخبری دے دو۔" صبر کرنے والوں کو بشارت اس لیے دی گئی ہے کہ یہ لوگ وقت کے ساتھ ساتھ مصائب کو بھول کر تکلیف سے نجات پا جاتے ہیں اور ثواب پاتے ہیں اور بے صبرے درد و داغ کا بوجھ اُٹھائے پھرتے ہیں اور انھیں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

مصیبتیں اور صعوبتیں اس زندگی کا لازمہ ہیں، ان سے بچا رہنا ممکن نہیں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو آپ ان کا علاج صبر سے کریں اور ثواب پائیں۔ یا ان پر پیچ و تاب کھاتے رہیں۔ یہ کیفیت آپ کی مصیبت میں اضافہ تو کر سکتی ہے آپ کی تکلیف

---

[1] عربی شعر کا ترجمہ۔

کا مداوا نہیں بن سکتی۔ یہ تو ہے صبر کی پہلی قسم یعنی مصائب پر صبر کرنا۔ صبر کی دوسری قسم یہ ہے کہ آپ خود کو گناہوں سے بچا کر رکھیں۔ نوجوان کا صبر یہ ہے کہ وہ ہر طرف کھلی عریانی دیکھتا ہے اس کی طبیعت اسے دیکھ کر بدکاری کی طرف مائل ہوتی ہے لیکن وہ خوفِ خُدا کی وجہ سے آنکھیں مُوند لیتا ہے۔ اُسے ناروا لذتوں کے تمام راستے معلوم ہیں لیکن خود کو اس طرف جانے سے روکتا ہے۔ ایک سرکاری مُلازم کو رشوت پیش کی جاتی ہے جو اس کی چھ ماہ کی تنخواہ کے برابر ہے۔ وہ ضرورت مند بھی ہے اس کے باوجود اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا، یہ اس کا صبر ہے۔ طالب علم کا صبر یہ ہے کہ امتحان دیتے وقت اسے موقع ملتا ہے کہ وہ کتاب سے نقل کر کے چوری کا مرتکب ہو اور باوجودیکہ اس کی کامیابی کا دارومدار اسی پر تھا اور وہ ایسا نہیں کرتا۔ تمام گناہ نفسِ انسانی کو لذّت بخشتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص قدرت رکھنے کے باوجود ان سے رُکا رہتا ہے تو وہ یقیناً صابر کہلانے کا مستحق ہے۔ صبر کی تیسری قسم یہ ہے کہ بجا آوریٔ احکام میں جو تکلیف و مشقّت ہوتی ہے، اسے برداشت کیا جائے۔ مثلاً موسمِ سرما میں فجر کے وقت مزیدار نیند اور گرم بستر کی راحت کو چھوڑ کر نماز کے لیے اُٹھنا یا آگ برساتے گرم موسم کے ماہِ رمضان میں بھوک اور پیاس برداشت کرنا یا اپنے نفس کو جو مال و دولت سے محبّت کرتا ہے، زکوٰۃ یا صدقہ دینے کے لیے مال خرچ کرنے پر آمادہ کرنا وغیرہ۔

اسی طرح موجودہ دَورِ پُر آشوب میں جبکہ دین اسی طرح نادر و کمیاب ہو گیا ہے جس طرح اپنے ابتدائی دَور میں تھا۔ دین پر قائم رہنا بھی صبر ہے۔ فی زمانہ دین پر قائم رہنا اتنا ہی دُشوار ہے جس طرح آگ کے انگاروں پر کھڑا ہونا۔ عوام دین دار لوگوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں اور حُکّام وقت ان کے درپئے آزار رہتے ہیں انھیں تنخواہیں کم دی جاتی ہیں اور شہر بدر کر دیا جاتا ہے۔ جو شخص یہ سب تکالیف اللہ کی خاطر

اور ثواب کی غرض سے برداشت کرتا ہے وہ ان آیاتِ مبارکہ کا مصداق ہے :
(۱) اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ ۵۹۔ عنکبوت " جنھوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔ (۲) اُولٰٓئِكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا۔ القصص (۵۴) " یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا۔ اس ثابت قدمی کے بدلے جو انھوں نے دکھائی (۳) وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ ۳۵۔ حٰمٓ سجدہ۔" یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہیں۔

احکامِ شرع کی اطاعت

یہ بات ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ایمان دل کا مخفی عمل ہے جسے سوائے اللہ تعالےٰ کے کوئی نہیں جان سکتا۔ انسان تو صرف ظاہری حالت ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے ہم نے مومن اور غیر مومن میں فرق و امتیاز کا معیار شخص کے ظاہری اعمال و اقوال کو قرار دیا ہے۔ یعنی " اسلام "، " ایمان " کا مظہر ہے۔ اسلام کے لغوی معنیٰ ہیں فرمانبرداری۔ " اسلم " اور " سَلَمَ " کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔

بیٹا باپ کی فرماں برداری اس اعتماد کی وجہ سے کرتا ہے جو اسے باپ پر ہے، عاشق اپنے محبوب کی اطاعت محبت کی وجہ سے کرتا ہے، شکست خوردہ شخص فاتح کی اطاعت ڈر کی وجہ سے کرتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان اپنے ربّ کے احکام کی اطاعت کسی غرض یا مطلب کے بغیر مطلقاً کرتا ہے۔ اس کا ہر حکم مانتا ہے خواہ اس کا فائدہ اور حکمت اس کی سمجھ میں نہ آئے اور ہر اس کام سے باز رہتا ہے جس سے منع دیا گیا ہو خواہ منع کرنے کی وجہ اسے معلوم نہ ہو سکے۔

یہ اطاعت مطلقہ (جو مسلمان اپنے رب کی کرتا ہے) اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک عملی پہلو جس کا مظہر زبانی اقرار اور عملاً اطاعتِ احکام ہے۔ اس کا بیان انشاء اللہ اس کتاب کے اس حصہ میں کیا جائے گا جو "اسلام" کی وضاحت کے لیے مخصوص ہے۔ اور دُوسرا پہلو قلبی ہے اور اس وقت ہم اسی پہلو سے بحث کریں گے یعنی اس وقت ہم "ایمان" کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔

ایمان سے مُراد یہ ہے کہ شریعت کے احکام پر دل پوری طرح رضامند ہو۔ اور نفس کو مکمل اطمینان حاصل ہو۔ نیز فرائض کی ادائیگی اور حرام کاموں کا ترک کرنا رضاکارانہ طور پر ہو۔ گویا اطاعتِ احکام کی وجہ سے نہ دل تنگی پیدا ہو نہ ناپسندیدگی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ "اے محمد! تمھارے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔" یہ تو عملی پہلو ہے۔ اور: ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ ۶۵۔ النساء۔ "پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو۔ اس پر اپنے دل میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔" یہ اس کا قلبی پہلو ہے۔ گویا جب تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو دل سے صحیح نہ مان لے اور ان پر پُوری طرح راضی اور مطمئن نہ ہو۔ محض احکام پر عمل کر لینا مومن ہونے کے لیے کافی نہیں: إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ ۵۱ النور۔ "ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمہ کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

بعض لوگ ہمیشہ شریعت کے ہر حکم یا نہی کے بارے میں یہ پُوچھتے ہیں کہ اس کی

حکمت کیا ہے گویا وہ کوئی حکم اس وقت تک تسلیم نہیں کرنا چاہتے جب تک انھیں اس کی حکمت یا فائدہ معلوم نہ ہو جائے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ شریعت کے ہر حکم میں حکمت موجود ہے جو کبھی تو ہمیں قرآن و حدیث سے معلوم ہو جاتی ہے اور کبھی غور و فکر اور استنباط سے ظاہر ہو جاتی ہے لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی حقیقی حکمت نہ سمجھ سکیں، تو کیا اس بنا پر کہ ہم اس کی حکمت نہ پا سکے ہم اپنے رب کا حکم ماننے سے انکار کر دیں گے؟

ذرا تصوّر کیجیے آپ اپنے بیٹے کو حکم دیتے ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ جب تک اس کا مقصد یا فائدہ معلوم نہ ہو جائے میں نہ مانوں گا۔ حالانکہ ہو سکتا ہے موقع ایسا ہو کہ تفصیلی گفتگو کی گنجائش ہی نہ ہو یا کوئی ایسا راز ہو جسے بیان کرنا خلافِ مصلحت ہو، تو کیا آپ اس بیٹے کو نافرمان نہ خیال کریں گے۔ اور کیا آپ کی یہ خواہش نہ ہو گی کہ وہ ہر صورت میں آپ کا حکم مانے، اس لیے کہ وہ آپ کا بیٹا ہے اور آپ باپ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے جو حقوق بندوں پر ہیں انھیں اس حق پر قیاس نہیں کیا سکتا جو باپ کو بیٹے پر حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک حق یہ ہے کہ ہم اس کے احکام کی اطاعت ہر حال طوعاً و کرہاً کریں۔ خواہ وہ حکم ہمیں پسند ہو یا نہ ہو، یہ جائز نہیں کہ ٹال مٹول کے لیے بہانے ڈھونڈیں یا بے راہ روی کے لیے کتبِ فقہ میں ایسے اقوال تلاش کریں جن سے ہماری خواہشات پوری ہو سکیں۔ نہ یہ جائز ہے کہ اغیار کی تہذیب اور رسم و رواج میں سے جو باتیں ہم نے لے لی ہیں، انھیں صحیح ثابت کرنے کے لیے نصوصِ شریعیہ کی غلط تاویلیں کریں اور اس کوشش میں صراطِ مستقیم سے منحرف ہو جائیں، تاکہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہمارا دین ان رسوم و رواجات کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن پھر جب اجتماعی رواج بدل جائے یا اغیار کی تہذیب کا منبع مغرب سے مشرق کی طرف منتقل ہو جائے تو ہم اپنا طرزِ استدلال بھی بدل دیں اور نئی

تاویلیں شروع کر دیں۔[1]

ان میں سے کوئی طریقہ بھی درست نہیں ہے بلکہ شریعت سے حکم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا پھر اس حکم پر ہر حال میں راضی اور مطمئن رہنا ہی اس مومن کی شان ہے جو اس دینِ حق کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے۔

دوستی اور دشمنی

ایمان کی نشانی یہ ہے کہ محبت یا عداوت صرف اللہ کے لیے ہو۔ نیک اور پرہیزگار لوگوں سے محبت کی جائے خواہ اس میں ہمارا ذاتی فائدہ نہ ہو۔ اور کافر و فاجر لوگوں کو ناپسند کیا جائے خواہ ان سے ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔ بلکہ اگر ان کے ساتھ دوستی اور تعلقات ہمارے لیے فائدہ مند ہوں اور بہت گہرے ہوں پھر بھی ہم انھیں ناپسند کریں بلکہ تعلقات منقطع کر لیں۔ اس لیے کہ ایک مومن کے نقطہ نگاہ سے دینی برادری خونی رشتے سے زیادہ محکم ہے۔ اور عقیدہ کا رشتہ نسبی رشتوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ جناب باری تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے ان کے کافر بیٹے کے بارے میں صاف کہہ دیا تھا کہ وہ آپ کے خاندان کا فرد نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ بدکردار ہے اور یہ بھی واضح طور پر فرما دیا ہے کہ مومنوں اور مومنوں سے عناد رکھنے اور اسلام کے خلاف جنگ کرنے والے کافروں کے درمیان دوستی اور "معاہدہ بقاءِ باہمی" نہیں ہو سکتا خواہ دونوں فریقوں میں باہم کتنے ہی مضبوط تعلقات کیوں نہ ہوں۔ ارشاد ہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

---

[1] اسی قسم کی تبدیلی کی ایک مثال یہ ہے کہ کبھی ہم "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح بولتے ہیں اور کبھی "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ لگاتے ہیں اور اس طرح ہم حالات اور وقت کے بدلنے اور اپنے حاکموں کی خواہشات کے مطابق قلابازیاں کھاتے رہتے ہیں۔ (مصنّف)

وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۔ المجادلہ (۲۲) "تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے۔" غیر مسلموں پر مسلمان ہو جانے کے لیے کسی قسم کا جبر نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ صرف یہ انتظام ضروری ہے کہ یہ لوگ اسلام کا راستہ نہ روک سکیں اور اسلامی دعوت کے خلاف محاذ آرائی نہ کر سکیں۔ اگر یہ لوگ اطاعت قبول کر لیں، یا مسلمان ہو جائیں اور دعوتِ اسلامی کی مخالفت چھوڑ دیں تو ہم بھی انھیں سلامتی سے زندہ رہنے کا حق دیں گے اور ان کے حقوق کی حفاظت کریں گے تو گویا مومن اگر محبت کرتا ہے تو دین کے لیے اور دشمنی کرتا ہے تو صرف دین کے لیے مومن کی محبت میں شرافتِ نفس اور طبیعت کی نرمی واضح طور پر نمایاں ہوگی۔ دوستوں کے ساتھ درگزر اور فیاضی کا سلوک کریگا۔ اپنے بھائی کے لیے اسے ذلت بھی برداشت کرنی پڑے تو اسے ذلت خیال نہیں کرے گا۔ خود کتنا ہی ضرورت مند ہو بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیگا۔ اسی طرح اگر اسے غصہ آئے گا تو صرف اللہ کے لیے آئے گا۔ اپنے دین کا دفاع کرتے ہوئے اور اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے انتہائی بہادری اور بے جگری سے لڑے گا۔ گویا مومن نرمی اور سختی، رحم دلی اور تند مزاجی کا حسین امتزاج ہے۔ نرمی اور رحم دلی اپنے مومن بھائیوں کے لیے اور سختی اور جبر و قہر دشمنان دین اور شیطان کے دوستوں کے لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے : ۱:۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ۔ الفتح (۲۹) "محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔" نیز ۲ :۔

اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ط المائدہ (۵۴) "مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں

گے جو اللہ کی راہ میں[1] جدّو جہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔" درحقیقت جب تک ہم مومن تھے۔ ہماری شان یہی تھی پھر جب ہم نے جہاد ترک کر دیا شریعت کی مخالفت شروع کر دی خود پر اور اپنوں پر ظلم کرنے لگے اور دشمنوں کے سامنے جھک گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں کی پاداش میں ہم پر ایسے دشمن مسلّط کر دیے جو نہ تو اللہ سے ڈرتے ہیں اور نہ ہم پر رحم کھاتے ہیں اب یہی لوگ ہمارے ملکوں کے مالک ہیں اور ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔

توبہ و استغفار

اللہ تعالیٰ نے انسان کے خمیر میں دُنیا کی محبّت ڈال دی ہے۔ اسی لیے انسان ہر وقت آرزوؤں کا تانا بانا بُنتا رہتا ہے۔ مال و دولت اور عورتوں سے اختلاط اسے بہت مرغوب ہے۔ غصّے اور انتقام کا جذبہ اس کی گھُٹّی میں ہے پھر اس پر شیطان مسلّط ہے جو ہر وقت اسے بدکاری اور فحاشی کے سبز باغ دکھاتا رہتا ہے اور گناہ کے کام اس کے سامنے حسین بنا کر پیش کرتا ہے۔ مزید براں اس کے اندر بھی ایک نفس امّارہ موجود ہے جسے صرف بُرے اور حرام کاموں کی ہی رغبت اور خواہش رہتی ہے اور ان کاموں میں شیطان اس کی مدد کرتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کر گزرتا ہے۔

ان حالات میں اگر کسی سے گناہ سرزد ہو جائے تو نافرمانی کی سزا اور گناہوں

---

[1] جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں یہ ارشادِ باری تعالیٰ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے: لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ (الممتحنہ ۸) "اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا۔" (مصنّف)

کے نتائج سے بچنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے گناہ گار کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے فرمایا ہے کہ اگر تم چاہو تو تمھارے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ اور پھر تم ایسے ہو جاؤ گے گویا تم نے گناہ کیا ہی نہ تھا۔ بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ گناہوں کے بدلے تمھارے صحیفہ اعمال میں نیکیاں درج کر دی جائیں۔ اسی طرح جیسے کسی تاجر نے اپنے کھاتے میں آپ کے نام سو دینار ڈال رکھے ہوں لیکن پھر وہ نہ صرف یہ کہ یہ رقم آپ کے نام سے کاٹ دے اور کھاتہ صاف کر دے بلکہ سو دینار آپ کی طرف سے اپنے کھاتہ میں جمع کر لے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ الفرقان۔ "الّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور الرحیم ہے"۔

توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے جب تک آدمی تندرست اور صحیح وسالم ہے اس حالت میں اگر سچی توبہ کر لیتا ہے تو اس کی توبہ قبول کر لی جاتی ہے۔ یہ دروازہ صرف نزع کے وقت بند ہوتا ہے جب جان نکلنے کے قریب ہوتی ہے اور انسان حقیقت کا سامنا کر رہا ہوتا ہے۔ اور اپنی آنکھوں سے ان باتوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے جن کی خبر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی ایسے وقت میں توبہ لاحاصل ہے اس لیے کہ توبہ دراصل نام ہے۔

"اپنے ارادے اور اختیار سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی چھوڑ کر اطاعت کی طرف لوٹنے کا"۔

اور اس وقت یعنی بحالت نزع تو اسے جبراً اور بزور لوٹایا گیا ہے۔ اس لیے یہ توبہ اور اقرار اسے فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ اب تو اس کا اختیار ہی سلب ہو چکا ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے : اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ۔ النسآء " ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے اس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی اور اسی طرح توبہ ان کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔"

توبہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ توبہ کرنے والا ہر بُرے کام سے کنارہ کش ہو جائے۔ غور کیجیے آپ راستے میں چلے جا رہے ہیں۔ ایک شخص کھڑکی کھول کر آپ پر گندا پانی پھینک دیتا ہے آپ اسے بُرا بھلا کہتے ہیں۔ وہ آپ سے معذرت بھی کرتا ہے لیکن ساتھ ہی گندا پانی بھی آپ پر برابر ڈالتا جاتا ہے۔ کیا آپ اس کی معذرت قبول کر لیں گے؟

توبہ کی رُوح بھی ہے اور جسم بھی۔ توبہ کی رُوح گناہ کے بُرا ہونے کا شعور پیدا کرنا ہے اور جسم گناہوں سے باز رہنا ہے۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھیے کہ ایک شخص ایک راستے پر چلا جا رہا ہے۔ اسے ایک کتبہ نظر آتا ہے جسے پڑھ کر وہ جان لیتا ہے کہ یہ راستہ وہ نہیں ہے جس پر اسے جانا ہے۔ یعنی اسے احساس ہو جاتا ہے کہ وہ غلط راہ پر چل رہا ہے۔ دراصل یہ محسوس کر لینا ہی بنیادی بات ہے۔ اس لیے کہ اگر

غلطی کا احساس ہی نہ ہو تو درست راہ مل ہی نہیں سکتی ۔ لیکن اگر جان لینے کے باوجود جو نتیجہ اس علم سے نکلتا ہے اس پر عمل نہ کرے اور غلط راہ پر ہی چلتا رہے تو اسے جان لینا بھی کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ یہ طریق کار نہ صرف بہت بڑا گناہ ہوگا بلکہ نتائج کے لحاظ سے بھی انتہائی خطرناک ہوگا اس لیے کہ جو شخص جانتا ہی نہیں کہ وہ غلط راہ پر چل رہا ہے۔ اسے تو پھر بھی کسی حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جو جانتا ہے اور جاننے کے باوجود قصداً غلط راہ پر چلا جا رہا ہے اس کے پاس تو کوئی عذر بھی نہیں [1]

توبہ کی دوسری شرط یہ ہے کہ جو بُرائیاں اور گناہ کر چکا ہے ان کے بدلے نیکیاں کرے اور جو خرابیاں کر چکا ہے ان کی جگہ اصلاح کرے یعنی اپنا کردار بدل کر اور درست راہ اختیار کر کے اپنی توبہ کو پُورا پُورا حقیقی رنگ دے۔ ارشاد باری تعالےٰ ہے : كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵۴۔ الانعام "تمھارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اُوپر لازم کر لیا ہے۔ یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی بُرائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔" ۲۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا

---

[1] اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ جو شخص لاعلمی میں غلط کاری کا مرتکب ہوتا ہے، اُسے اصطلاحاً ضالّ (گمراہ) کہا جائے گا اور جو جانتے بُوجھتے غلط روش اختیار کرے گا وہ "مغضوب علیہ" ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں یہودیوں کو "مغضوب علیہ" کہا گیا ہے کہ وہ سچائی کو بخوبی جانتے ہوتے اس کی مخالفت کرتے رہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے : فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ البقرہ (۸۹)۔ "مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔" (مصنف)

مِنۡ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۸۹ ۔ آل عمران "البتہ وہ لوگ اس سے بچ جائیں گے جو توبہ کر کے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" ۳- اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَيَّنُوۡا فَاُولٰٓـئِكَ اَتُوۡبُ عَلَيۡهِمۡ ۚ البقرہ (۱۶۰) "البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں ان کو میں معاف کردونگا۔"

اور اصلاح یہ ہے کہ آپ حقیقتاً گناہ ترک کردیں اور آپ کا دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم، عزم صادق ہو۔ اب اگر آپ نے پختہ ارادہ اور عزم صادق کرلیا پھر کسی وقت نفس غالب آگیا یا حالات نے مجبور کردیا اور آپ کوئی گناہ کر بیٹھے اور پھر آپ نے توبہ کی تو دوبارہ آپ کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اگرچہ آپ یہ حرکت بار بار کریں اور بار بار توبہ کریں پھر بھی توبہ قبول ہو جائے گی بشرطیکہ آپ کے بنیادی عزم میں لغزش نہ آنے پائے۔ اور دل میں یہ نہ کہنے لگیں کہ جب خواہشات سے مجبور ہوں گا گناہ کرلوں گا اور بعد میں توبہ کرلیا کروں گا۔ ظاہر ہے ایسی توبہ سچی توبہ نہ ہوگی اور نہ مقبول ہوگی۔

یہ طریق کار تو اس توبہ کا ہے جو حقوق اللہ کے ضمن میں کی جائے اس میں یہ کافی ہے کہ آپ اپنے سابقہ گناہوں پر نادم ہو کر گناہ کے ارتکاب سے باز آجائیں اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا سچا عزم کرلیں۔ لیکن حقوق الناس کا معاملہ مختلف ہے اگر آپ نے کسی پر ظلم کیا ہے یا کسی کا مال کھا لیا ہے یا اسے جسمانی ایذا دی ہے یا کسی کی توہین کی ہے یا کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دی ہے یا غیبت کی ہے یا چغلی کھائی ہے یا بدنام کیا ہے تو ان سب اقدامات اور ان سے ملتی جلتی صورتوں میں ضروری ہے کہ حق دار کو اس کا حق ادا کیا جائے یا پھر وہ خود ہی اپنے حق سے دست بردار ہو جائے اور آپ کو معاف کردے یا اللہ تعالیٰ آپ پر یہ عنایت فرمائے کہ اُسے آپ سے راضی کردے ورنہ آپ کی توبہ قبول نہ ہوگی اور قیامت کے دن مظلوم کو آپ کی نیکیاں دے دی جائیں گی

یا اس کے گناہ آپ کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے۔

گناہ کتنے زیادہ کیوں نہ ہوں توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا بنا بریں کسی کو اللہ تعالےٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو چاہیے اللہ کی رحمت و عفو سے مایوسی سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ الزمر (۵۳) "(اے نبی) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے"۔ گویا توبہ نام ہے برائیوں کو چھوڑ کر نیکی کی طرف لوٹنے کا اور استغفار سے مراد اللہ سے مغفرت طلب کرنا ہے۔ اور استغفار کا حکم خود شریعت نے دیا ہے اور اس کی بہت ترغیب دی گئی ہے۔ ارشاداتِ ربانی ملاحظہ کیجیے: (۱) هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ ؕ هود (۶۱) "وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ (۲) وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ ۹۰ هود۔ "دیکھو! اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔ (۳) وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ۔ هود (۵۲) "اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو پھر اس کی طرف پلٹو۔" اس قسم کی تلقین مختلف انبیاء کی زبانی قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے جس میں ہر نبیؑ اپنی قوم کو نصیحت کرتا ہے اور انھیں اپنے رب سے معافی مانگنے اور اس کے عذاب سے نجات پانے کا طریقہ سکھاتا ہے۔

علاوہ ازیں گناہ گاروں کے مختلف درجے ہیں مثلاً جو لوگ کافر تھے اور اسی حال میں مر گئے ان کی مغفرت کی تو کوئی امید نہیں۔ ارشاد باری ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ

يُشْرَكَ بِهٖ ۔ النساء۔ (۴۸) "اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا۔" آیت میں لفظ شرک آیا ہے اور مشرکین کا کفر اہل کتاب کے مقابلہ میں زیادہ شدید ہے۔ لیکن اس آیت کا اطلاق اہل کتاب اور مشرکوں پر یکساں ہوتا ہے۔ بنا بریں جو شخص بحالت کفر مر گیا اس کے لیے "رحمہ اللہ" یا "غفر اللہ لہ" کا استعمال جائز نہیں اور نہ اسے "مرحوم" و "مغفور" کہا جا سکتا ہے لیکن مسلمان گنہ گار اگر توبہ کیے بغیر مر جائے تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہ چاہے گا تو اسے بخش دے گا کیونکہ فرمایا گیا ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ج النساء (۴۸) "اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔" اور اگر چاہے گا تو انھیں جہنم کا عذاب دے گا۔ لیکن وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ لیکن کسی شخص کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جہنم کی آگ کوئی معمولی چیز یا ہلکا سا عذاب ہو گا اس لیے کہ اس دنیا کی آگ جو ایک نعمت بھی ہے اسے چند منٹ کے لیے کوئی برداشت نہیں کر سکتا تو ہم خود کو طویل زمانوں کے لیے عذابِ جہنم کے سپرد کیسے کر سکتے ہیں۔

اب رہ گئے توبہ کرنے والے تو اللہ تعالیٰ اپنے کرم و احسان سے ان کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ یہ تو ان کے متعلق ہے جو گناہ کر لینے کے بعد توبہ کرتے ہیں اس کے برعکس وہ لوگ جو ارادۂ گناہ کے بعد اور مرتکب گناہ ہونے سے پہلے ہوش میں آجاتے ہیں اور خوفِ خدا کی وجہ سے اس گناہ کی شدید خواہش کے باوجود اس سے باز رہ کر توبہ کر لیتے ہیں ان کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہے۔ مثلاً ایک شخص شیطان کے فریب میں آکر زنا پر آمادہ ہو جاتا اور پھر جب اس کے تمام ذرائع مہیا ہوتے ہیں یا اقدام کے قریب ہوتا ہے، اسے اللہ یاد آجاتا ہے اور وہ اس وقت ایسی حالت میں زنا سے کنارہ کش ہو جاتا ہے کہ اس پر شہوتِ نفسانی پوری طرح سوار ہے اور دل میں رغبت موجود ہے۔ مگر ایسے لوگ کہاں ہیں؟ اللہ کے ان خاص بندوں کے سوا جنھیں اس نے اپنی عنایت سے اس کی توفیق عطا کی ہو دوسروں کے لیے یہ

عمل بہت دشوار ہے اس لیے کسی کو اس قسم کا تجربہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی خطرناک مرض کے جراثیم اپنے اندر اس خیال سے جذب کرتا ہے کہ اس کی قوتِ مدافعت اس شخص سے بڑھ جائے گی جو کبھی اس مرض کے قریب بھی نہیں گیا جب کہ مرض کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا ہو جانے کا امکان ایک فی صد ہے اور ہلاک ہو جانے کا خطرہ ننانوے فی صد اور یہ جسمانی مرض کی بات ہے۔ اس کے برعکس گناہ سے ایک بار رُک جانے سے دوبارہ گناہ نہ کرنے کی قوت پیدا نہیں ہوتی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر ایک بار بچ گیا تو پھر کبھی وہ اس میں مبتلا نہ ہو سکے گا۔ بنا بریں برائی سے محفوظ رہنے کی صورت یہی ہے کہ اس سے دور رہا جائے اس کے تمام راستے بند کر دیے جائیں، اور ایسے لوگوں سے کنارہ کش رہا جائے جو غلط کاموں سے رغبت رکھتے ہیں یا ان کی ترغیب دیتے ہیں۔ عربی کی ایک مثل ہے "الصاحب ساحبٌ" دوست اور ساتھی اپنے ساتھ گھسیٹنے والا ہوتا ہے اور انسان اپنے دوست کا مذہب اختیار کرتا ہے۔ ایک پرانا مقولہ ہے کہ "آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ آپ کے دوست اور رفیق کون لوگ ہیں۔ میں آپ کو بتا دوں گا کہ آپ کیا ہیں۔" چنانچہ نوجوانوں کو محتاط اور ہوشیار رہنا چاہیے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مدد و استعانت کی دعا کرنی چاہیے۔

○

ایمان بالیوم الآخر

○

اے ہمارے پروردگار ہماری آنکھیں کھول دے تاکہ
ہم ہر طرف بکھری ہُوئی ان حقیقتوں کو دیکھ سکیں جو تیرے
موجود ہونے کی دلیل ہیں۔
اور
ہمیں نورِ بصیرت عطا فرما کہ ہم وہ راستہ پہچان سکیں جو
تجھ تک پہنچاتا ہے۔ ہمیں تمام ظاہری اور باطنی فتنوں
سے محفوظ رکھ۔

○

روزِ جزا پر ایمان

انسان اور موت

موت کو محسوس کرنے کے سلسلے میں انسانوں کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ایک قسم وہ لوگ ہیں جو اس احمق شاعر کے ہم زبان ہو کر کہتے ہیں "ماضی ضائع ہو چکا ہے اور مستقبل نظروں سے اوجھل ہے۔ تیرے ہاتھ میں صرف وہ گھڑی باقی ہے جس میں تو اب زندہ ہے۔" (حال)

یہ شاعر نہ تو ماضی کے بارے میں سوچ بچار کا قائل ہے اور نہ مستقبل کو خاطر میں لاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کل (گزشتہ) فنا ہو چکا ہے اور کل (آئندہ) آئے گا ہی نہیں۔ (حالانکہ یہ جس ماضی کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ فنا ہو گیا۔ بخدا وہ فنا نہیں ہوا بلکہ اس ماضی نے تو ہمارے نیک و بد اعمال ایسی کتاب میں ضبط اور ثبت کر دیے ہیں جو کوئی چھوٹا یا بڑا عمل درج ہوئے بغیر نہیں رہنے دیتی۔ اور مستقبل اگر غائب ہے تو صرف ہمارے احساس سے۔ ایمان اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس موجود ہے۔ وہ یقیناً آئے گا۔ اس بات میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ یہ لوگ جو نہ موت کو یاد رکھتے ہیں اور نہ موت کے بارے میں سوچتے اور غور و فکر کرتے ہیں۔ تینوں قسموں میں سب سے بڑے لوگ ہیں۔

ایک اور قسم ان لوگوں کی ہے جو موت کو یاد تو رکھتے ہیں لیکن فارسی شاعر "عمر خیام" کی طرح جس نے اپنے افکارِ باطلہ سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔ "جب موت

ایک ناگزیر حقیقت ہے اور زندگی کے دن تھوڑے اور ختم ہونے والے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ان چند دنوں کو عیش و مستی میں بھرپور گزاریں۔ نیز زندگی کا خمیر رنج والم سے اٹھایا گیا ہے اس لیے ہمیں اس سے بھاگ کر جام شراب میں پناہ لینی چاہیے اور پوری زندگی شعر و موسیقی، سرمستی اور شہوت پرستی میں گزارنی چاہیے"۔

ایک اور قسم وہ لوگ ہیں جو موت کا ذکر شاعر ابوالعتاہیہ" کی طرح کرتے ہیں، جو ویسے تو موت کے ذکر میں رطبُ اللسان ہے اور اس کے کلام میں ہر جگہ موت کا بیان ملتا ہے لیکن مابعد الموت کے بارے میں بہت کم لب کشائی کرتا ہے۔ گویا وہ یا تو اس شخص کا ہم زبان ہے جو کہتا ہے کہ موت ذی حیات کی زندگی کی انتہا ہے یا اس شخص کا ہم نوا ہے جس کے خیال میں قبر کے بھاری پتھر کے زیرِ سایہ ایک طویل نیند ہے۔

ان سب کے برعکس اہلِ حق ہیں جو یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ موت انجام و انتہا نہیں۔ نئی زندگی کا آغاز ہے، خوابِ گراں نہیں خوابِ غفلت سے بیداری ہے۔ ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام : اَلنَّاسُ نِیَامٌ اِذَا مَاتُوْا اِسْتَیْقَظُوْا " لوگ سو رہے ہیں جب موت آئے گی تو بیدار ہوں گے"۔ میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا اس وقت انھیں معلوم ہو گا کہ موت کے بعد ایک بہت ہی طویل اور نہ ختم ہونے والی زندگی ان کا انتظار کر رہی ہے۔ جس میں یا تو ان کے لیے ابدی نعمتیں ہوں گی یا پھر حسبِ اعمال دردناک عذاب۔ یہ چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ہدایت یافتہ اور مومن ہیں۔

اُخروی زندگی

یہی زندگی دراصل حقیقی زندگی ہے۔ کوتاہ نظر لوگ اسے دیکھ نہیں سکتے اور ناقص عقل والے اس کے بارے میں دی گئی اطلاعات پر یقین نہیں کرتے لیکن دیدۂ بینا رکھنے والا اور عقل و ادراک کی دولت سے بہرہ یاب شخص اچھی طرح سمجھتا ہے کہ انسانی

زندگی کے کئی مراحل ہیں۔ایک وقت تھا کہ یہی انسان اپنے آپ میں سمٹا سکڑا بطنِ مادر میں پوشیدہ اور اسی چھوٹی سی دُنیا کی پناہ میں زندہ تھا۔وہ اگر اس وقت سوچ سکتا تو یہی محسوس کرتا کہ زندگی یہی ہے جو وہ گزار رہا ہے اور اس زندگی کو چھوڑنے اور تنگنائے بطنِ مادر سے باہر آنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتا اِلّا یہ کہ جبراً وہاں سے نکال دیا جائے اور اگر وہ بول سکتا تو اس نکالے جانے کو موت کے مترادف سمجھتا اور پاتال میں دفن ہونے سے تعبیر کرتا۔حالانکہ یہ اس کی ولادت ہے۔بطنِ مادر سے نکل کر بہت زیادہ آرام دہ دُنیا یعنی اس وسیع و عریض دنیا میں آتا ہے۔بعینہٖ اسی طرح جیسے ہم مرنے کو اس دُنیا سے نکالا جانا خیال کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت ہماری ایک نئی ولادت ہے اور ایک بہت ہی پُرآسائش دُنیا کی طرف یعنی عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہونا ہے۔عالمِ برزخ جو اس مادی اور فانی دُنیا اور اخروی ابدی جہان کے مابین ایک پڑاؤ ہے۔

موت کے لیے تیاری

انسانی زندگی کا خمیر آرزو کے تانے بانے سے اٹھایا گیا ہے۔آرزو اس کی گھٹی میں ہے ہر وقت اس کے ذہن میں طول طویل آرزوئیں اور خواہشات کلبلاتی رہتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ موت ہمارے حواس پر ہر وقت چھائی رہتی ہے لیکن شعوری اور فکری طور پر ہم اسے اپنے قریب نہیں آنے دیتے۔روزانہ مرنے والوں کی سواریاں ہمارے سامنے سے گزرتی ہیں مگر اپنے بارے میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم نہیں مریں گے۔جنازوں میں شریک ہوتے ہیں تو اس وقت بھی دنیا کے بارے میں سوچتے اور باتیں کرتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ قبرستان زمین کی وسعت کو اپنے اندر سمیٹے لے رہے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہم بھی کسی دن یہاں آ بسیں گے استغفراللہ! مَیں غلط کہہ گیا قبر میں ہم نہیں رہیں گے ہمارا جسم قبر میں رہے گا۔آپ جانتے ہیں یہ جسم کیا ہے؟ انسان کی قمیص جب میلی یا بوسیدہ ہو جاتی ہے تو اُسے

اُتار کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یا جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اس پر لپٹا ہوا خول (آنول) ہٹا کر ضائع کر دیا جاتا ہے اور بچہ نکل آتا ہے اسی طرح جب انسان مرتا ہے تو اس کا یہ مادی جسم اس سے جُدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ جسم ایک قمیص سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جسے پہنا جاتا ہے اور اُتار دیا جاتا ہے اور مٹی میں صرف جسم دفن ہوتا ہے۔

عام انسان موت کو اکثر فراموش کر دیتا ہے لیکن ایک مومن اسے ہمیشہ یاد رکھتا ہے اور ہر وقت اس کے استقبال کے لیے تیاری کرتا رہتا ہے۔ توبہ و استغفار کے ذریعے اور لوگوں کے حقوق ادا کر کے ہلکا پھلکا ہو کر موت کے لیے تیار رہتا ہے۔ صبح و شام اپنی ذات کا احتساب کرتا ہے۔ اگر کوئی نیک کام ہو گیا تو اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے نیکی کی توفیق عطا فرمائی۔ اور اگر کوئی بُرائی سرزد ہو گئی تو اپنے گناہ پر اللہ سے طلبِ مغفرت کرتا ہے۔ آخرت کو یاد رکھتا ہے اور اس دن سے خائف رہتا ہے جس دن چہرے اور آنکھیں پتھرا جائیں گے اور آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے اور اس دن ملنے والی جزا کی آرزو کرتا ہے اور اس سلسلے میں صبر و صلوٰۃ اور مخلصانہ نیکیوں سے مدد حاصل کرتا ہے اور جو کام بھی کرتا ہے اللہ کی رضا کی خاطر اور اس کے اجر و ثواب کو ہی سب سے اہم خیال کرتے ہوئے کرتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

میں نے کسی ملحد کا مضمون پڑھا تھا جس میں وہ ازراہِ تمسخر سوال کرتا ہے۔ کہ جب ایک ہی وقت میں ایک شخص امریکہ میں مرتا ہے اور دُوسرا چین میں تو ان دونوں کی رُوح بیک وقت ملک الموت کیسے قبض کرتا ہے؛

جواب یہ ہے کہ ایک تو کسی فرشتے کی حیثیت ہماری زمین کے مقابلے میں بالکل ایسی ہے جیسے ہم میں سے کوئی شخص چیونٹیوں کی کسی بستی پر جس میں ہزاروں

چیونٹیاں موجود ہوں جھک کر دیکھیے یا کسی ایسے گلاس میں جھانکیے جس میں کروڑوں جراثیم موجود ہوں بلکہ ایک فرشتہ اس سے بھی بڑا ہے جو حیثیت ہماری جراثیم کے مقابلے میں ہے۔ ہمارا یہ کرہ ارض فرشتے کی ہتھیلی میں کسی انسان کی ہتھیلی پر ایک دانہ گندم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

دوسرے۔ ملک الموت کے پاس رُوح قبض کرنے کے لیے بے شمار مددگار موجود ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ الانعام۔ "یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی مَوت کا وقت آجاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔"

قیامت کا دن

یوم آخرت (قیامت) پر ایمان لانا اسلامی عقاید کے ارکان میں سے دُوسرا رُکن ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں ایمان باللہ کا ذکر ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا موقع ہو کہ اس کے ساتھ ایمان بالآخرۃ کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

مومن اس دن کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے اسی وجہ سے وہ ثواب اُخروی کی خاطر زیادہ نیکیاں کرتا ہے اور اسی دن کے عذاب سے ڈر کر بُرائی سے حتی المقدور دُور رہتا ہے جب اس کے سامنے کوئی ایسا حرام کام یا چیز آتی ہے جس میں لطف و لذّت ہو تو اسے فوراً اس کے نتیجہ میں ملنے والا عذاب اُخروی یاد آجاتا ہے۔ اور اس سے باز آجاتا ہے اور لذیذ ہونے کے باوجود اس سے مُنہ موڑ لیتا ہے۔ اسی طرح اسے اگر کوئی مشکل فریضہ ادا کرنا پڑ جائے تو ثواب آخرت کا خیال کر کے وہ خود کو اسے پُورا کرنے پر آمادہ اور راغب کر لیتا ہے۔ مومنوں کے جسم آرام دہ بستروں سے دُور رہتے ہیں۔ تنگی اور فراخی دونوں حالتوں میں راہِ خدا میں مال خرچ کرتے ہیں۔

خواہ خود کتنے ہی ضرورت مند ہوں۔ دُوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے میں ایثار کرتے ہیں ہاکثر اللہ کے عذاب کی شدّت یاد کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے اللہ کا نام سُن کر ان کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے پھر جب انھیں اس کی رحمت کا خیال آتا ہے تو ان کے دل میں رقّت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ لوگ اللہ کے ذکر سے راحت حاصل کرتے ہیں۔

قیامت کا وقت معیّن

قرآن مجید میں یہ بات واضح طور پر بتا دی گئی ہے کہ قیامت کے لیے جو وقت مقرر ہے اس کا علم مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا۔ ارشاد ہے : وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا۔ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ط الاعراف (۱۸۷) " یہ لوگ تم سے پُوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہو گی؟ کہو اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔" دُوسرے یہ بات بھی بتا دی گئی ہے کہ قیامت اچانک آئے گی اور جو کچھ ہو گا پلک جھپکتے ہو جائے گا : كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ط النمل (۷۷) "بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔"

البتہ قرآن مجید میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے کئی عجیب و غریب حادثات دُنیا میں وقوع پذیر ہوں گے۔ مثلاً زمین سے ایک عجیب جانور نکلے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا یہ غیب کی ایک خبر صادق ہے جسے انسانی عقل نہیں سمجھ سکتی۔ اور ہم اس کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتے جتنا ہمیں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جانور کی قسم، نوعیّت اور ماہیّت نہیں بتائی۔ بنا بریں جو کچھ بتایا گیا ہے صرف اسی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور قرآن مجید یا حدیث صحیح کی مسلم الثبوت دلیل کے بغیر اس

موضوع پر گفتگو کرنا ممنوع ہے۔

ایک ایسا ہی حادثہ "یاجُوج ماجوج" کے بند ٹوٹ جانا اور ان کا نکلنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ یاجُوج ماجُوج کون ہیں، کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کا ملک کون سا ہے اور نہ یہ وضاحت فرمائی کہ یہ بند کہاں واقع ہے۔ اب اگر تلاش و تجسّس سے ان امور کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے اور یہ دریافت قرآن مجید کے کسی ارشاد کے خلاف نہ ہو تو اس کے مان لینے میں کوئی حرج نہ ہوگا ورنہ جتنا قرآن نے بتایا ہے ہم اسی پر ایمان لائیں گے اور اس پر اضافہ نہ کریں گے۔ قرآن مجید میں ہے: حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَمَاۡجُوۡجُ وَهُمۡ مِّنۡ کُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ ۞ وَاقۡتَرَبَ الۡوَعۡدُ الۡحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبۡصَارُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (الانبیاء ۹۷) "یہاں تک کہ جب یاجُوج وماجُوج کھول دیے جائیں گے اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں گے اور وعدہ برحق کے پورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا تو یکایک ان لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا۔"

علاوہ ازیں اس ضمن میں کچھ باتیں احادیثِ صحیحہ میں بھی وارد ہوئی ہیں جن کی قرآن مجید میں صراحت نہیں ہے مثلاً قیامت سے پہلے علم اُٹھ جائے گا، جہالت کا دَور دَورہ ہوگا۔ شراب عام پی جائے گی۔ علی الاعلان زنا کا ارتکاب ہوگا۔ مرد کم ہو جائیں گے، عورتوں کی کثرت ہوگی، امانت و دیانت نادر و نایاب ہو جائے گی، نظمِ اجتماعی کا توازن بگڑ جائے گا۔ کمینے لوگ برسرِ اقتدار آ جائیں گے اور معزز شرفاء ذلیل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد دجّال کا ظہور ہوگا اور حضرت عیسٰے علیہ السّلام نازل ہوں گے اور شریعتِ محمدیہ علٰے صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی حمایت و حفاظت فرمائیں گے۔

آغازِ قیامت

قرآن مجید[1] میں قیامت کے بارے میں جو آیات ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کی ابتدا ہولناک زلزلوں سے ہوگی۔ یہ زلزلے اُن زلزلوں سے مختلف ہوں گے جن سے ہم واقف ہیں۔ قیامت جس وقت آئے گی (اللہ بہتر جانتا ہے کب آئے گی) زمین میں انسانی زندگی پُوری طرح رواں دواں ہوگی اور نسلِ انسانی زندگی سے پُوری طرح بہرہ یاب ہوگی۔ سب سے پہلے انسانی آبادیاں اجتماعی خوف و ہراس کا شکار ہوں گی اور ہر طرف اتنی دہشت پھیل جائے گی کہ ماں اپنی فطری محبت اور مامتا کے باوجود اپنے دُودھ پیتے بچّے سے غافل اور بے نیاز ہو جائے گی۔ خوف اور دہشت کے اثر سے حاملہ عورتوں کے حمل ضائع ہو جائیں گے اور ایسا لگے گا کہ لوگ اپنی سُوجھ بُوجھ کھو بیٹھے ہیں۔ سب نشے میں مدہوش نظر آئیں گے۔ وَمَا هُم بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ۝ الحج :۲ "حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔

ان زلزلوں کے قیامت سے پہلے واقع ہونے کی تائید قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے: اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ الزلزال :۳ "جب زمین اپنی پُوری شدّت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے"۔ گویا انسان زمین پر موجود ہوگا اور ان زلزلوں

---

[1] کتاب کے ابتدائی حصے کے مباحث میں گفتگو کا عمومی انداز اختیار کیا گیا ہے جو مسلم اور غیر مسلم سب کے لیے ہے اور اس میں منقولہ دلائل سے زیادہ عقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں اور اب جب کہ ایمان کے مختلف شعبے بیان ہو رہے ہیں اور خطاب عام طور پر مومنوں سے ہے۔ ہم زیادہ تر دلائلِ منقولہ بالخصوص آیاتِ قرآنیہ بطورِ استشہاد پیش کر رہے ہیں۔ (مصنّف)

کا مشاہدہ خود کرے گا۔ ان کی وجوہ دریافت کرے گا اور اسباب تلاش[1] کرے گا۔

حوادثِ فلکیہ

قیامت کا دن۔ جو کچھ اس دن وقوع پذیر ہو گا اور جو کچھ اس کے بعد پیش آئے گا۔ یہ سب امور (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) غیب کی باتیں ہیں ہم ان کو اس انداز سے نہیں سمجھ سکتے جس انداز میں مادی چیزوں کو سمجھ لیتے ہیں اور نہ ہماری عقل ان کے متعلق اس طرح رائے قائم کر سکتی ہے جس طرح وہ دنیوی حادثات کے بارے میں رائے قائم کرتی ہے یہاں عقل کا کام صرف اتنا ہے کہ نصوصِ قرآنیہ کو سمجھے اور اس کے درست معانی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

قرآن مجید میں کئی واضح آیات موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات میں رائج قوانین و نوامیسِ فطرت جنہیں اصطلاحاً ہم "قوانینِ طبعیہ" کہتے ہیں۔ ان میں تغیر و تبدل واقع ہو جائے گا۔ گویا ان کا جاری رہنا اس دنیا میں حیاتِ انسانی کی بقا کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب انسانی زندگی کی مقررہ میعاد ختم ہو گی ان قوانین کی مدت بھی ختم ہو جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا جو ہمیں نظر آ رہی ہے اپنی اس زمین اور باقی سیاروں سمیت اور اپنی بے نظیر پختگی کے باوجود ایک عارضی تعمیر ہے۔ جو کسی مخصوص مقصد اور محدود مدت کے لیے بنائی گئی ہو۔

حوادثِ فلکیہ کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہو گی مثلاً زمین کی ہولناک لرزش کی وجہ سے پہاڑوں کی چٹانیں چٹخ جائیں گی اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی مانند ہو جائیں گے۔ عظیم کہسار کٹے پھٹے ٹیلوں اور ریگِ رواں کی صورت اختیار کر لیں گے۔ پھر ریت کے

---

[1] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ نقشہ نفخۂ ثانیہ کا ہے۔ جب انسان دوبارہ اٹھیں گے کیونکہ اس میں وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا بھی فرمایا گیا ہے۔ دونوں صورتوں کی گنجائش ہے۔ میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اللہ اعلم کہنا زیادہ مناسب ہے۔ (مصنف)

ذرّے بن کر اُڑنے لگیں گے اور بالآخر سراب ہو جائیں گے اور زمین ایک چٹیل میدان رہ جائے گی۔

یہ سب باتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ نیز یہ کہ سمندروں کا پانی بہہ نکلے گا۔ پھر بھاپ بن کر اُڑ جائے گا۔ سیاروں کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، ان کی رفتار تبدیل ہو جائے گی۔ چاند سورج یک جا کر دیے جائیں گے۔ آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا پھر بساطِ آسمان اس طرح لپیٹ دی جائے گی جس طرح کا غذات کسی بڑے فائل میں سمیٹ دیے جاتے ہیں۔ بالآخر انجام یہ ہوگا کہ زمین یہ زمین نہ رہے گی اور آسمان یہ آسمان نہ ہوگا (زمین و آسمان بدل جائیں گے) یہ اطلاعات قرآن مجید نے دی ہیں۔

نفخ صُور

ہمیں نہ تو یہ معلوم ہے کہ صور واقعتاً کیسا ہوگا اور نہ یہ جانتے ہیں کہ نفخ کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس کی تفصیلات اور کیفیات کے سلسلے میں جو کچھ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے جب تک ان باتوں کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی ثبوت موجود نہ ہو ان پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جو کچھ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے یہ ہے کہ جب پہلا صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان کے کُل باشندے گھبرا کر دہشت زدہ ہو جائیں گے۔ پھر دوسرا صُور پھونکا جائے گا تو سب ذی حیات مر کر گر جائیں گے۔ بظاہر انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو نفخے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے (اور یہی قابلِ ترجیح بھی ہے) کہ نفخۂ فزع (دہشت زدہ کرنے والا) اور نفخۂ صَعق ایک ہی ہو جس کے اثر سے زمین پر کوئی ذی حیات (اِلّا ماشاء اللہ) زندہ نہ رہے گا۔ پھر ایک زمانہ بیت جائے گا جس کی مُدت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور نہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے متعلق کچھ بتایا ہے۔ اس کے بعد پھر صُور پھونکا جائے گا۔ یہ دوبارہ اُٹھائے جانے کا صور ہوگا۔ اس کے اثر سے سب مرے ہوئے پھر جی اُٹھیں گے اور اپنی اپنی قبروں سے نکل کر دی گئی خبروں

کی سچائی کا) نظارہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے۔

دوبارہ زندہ ہونا اور میدانِ حشر

ہر مُردہ اسی حالت اور ہیئت میں اُٹھے گا جس میں اس کی موت واقع ہوئی تھی اور ایسا محسوس کرے گا گویا اس پر مدہوشی کی حالت ایک گھنٹے یا چند گھنٹوں سے زیادہ طاری نہیں رہی۔ جس طرح کوئی شخص خرید و فروخت یا باتوں میں مصروف ہو اور اسے کار ٹکر مار جائے اور وہ بے ہوش ہو جائے پھر تین دن تک بے ہوش رہنے کے بعد جب دوبارہ ہوش میں آئے تو اپنی ادھوری بات پوری کرے، یا خرید و فروخت کی تکمیل کرے اور اسے یہ احساس ہی نہ ہو کہ اس پر بے ہوشی کے تین دن بیت گئے ہیں۔ بعینہٖ دوبارہ اُٹھنے کے دن سب لوگوں کی یہی کیفیت ہوگی اسی لیے دین ہمیں تلقین کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے انجام بخیر ہونے کی دُعا مانگتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو قائل کرنے کے لیے مر کر جی اُٹھنے کے کئی واقعات جو اسی دُنیا میں پیش آ چکے ہیں۔ بطور مثال قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً اس شخص کا واقعہ جو ایک اُجڑے ہوئے کھنڈر کے پاس سے گزرا۔ اور: قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ کَمۡ لَبِثۡتَ ؕ قَالَ لَبِثۡتُ یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ ؕ قَالَ بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَةَ عَامٍ۔ البقرہ۔ (۲۵۹) "اس نے کہا کہ یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا۔ اس پر اللہ نے اس کی رُوح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مُردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پُوچھا بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ فرمایا: تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں"۔ اسی طرح اصحاب کہف تین سو نو سال تک سوتے رہے۔ پھر جب بیدار ہوئے تو انھیں ایسا محسوس ہوا گویا وہ صرف چند ساعت سوئے ہیں اور انھوں نے

بے خبری میں ایسے سکّوں سے جن کا رواج نہیں رہا تھا۔ سامانِ خورد و نوش خریدنے کے لیے آدمی بازار روانہ کر دیا۔ دوبارہ زندہ ہونے پر سب لوگوں کا یہی حال ہوگا۔ ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ وہ تھوڑی دیر سو گیا تھا اور اب بیدار ہُوا ہے۔ یہ لوگ مُردہ حالت میں رہنے کی مدت کے بارے میں باہم اختلاف رائے کریں گے۔ مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا لیکن اہلِ ایمان انہیں بتائیں گے کہ "اللہ کی کتاب (لوحِ محفوظ) کے مطابق ہم سب "یوم البعث" تک اسی حالت میں رہے ہیں اور آج "یوم البعث" ہے۔ مگر ان باتوں کو تم کیا جانو۔"

سب یہی محسوس کریں گے جیسے وہ ابھی دُنیا ہی میں ہیں۔ مگر وقت کی نزاکت، اور ہیبت کی وجہ سے ان کے آپس کے پہلے تمام رشتے اور تعلقات منقطع ہو چکے ہوں گے۔ لوگ اپنے پیارے دوستوں کو دیکھیں گے مگر نہ تو مزاج پُرسی کریں گے نہ کوئی اہمیت دیں گے ہر شخص کو صرف اپنی فکر ہوگی اپنے بھائی، ماں، باپ اور بیوی بچوں سے دُور بھاگے گا۔ بلکہ خود غرضی کی یہ حالت ہوگی کہ اگر کسی رشتہ دار کی قربانی اس کے کام آسکے تو ان سب کو قربان کر کے اپنی جان چھڑا لے۔ پھر ایک طویل عرصہ (جس کی مدت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اسی حالت میں گزر جائے گا اور سب لوگ ایک ہی مقام پر کھڑے باہم ٹکراتے بل کھاتے رہیں گے۔ پھر سب کو جمع کر کے یکبارگی میدانِ حشر کی طرف ہانک دیا جائے گا۔

تمام بنی نوع انسان حضرت آدم سے آخری آدمی تک خواہ وہ بستر پر مرا ہو یا سمندر میں ڈوب کر، اسے کسی درندے نے کھایا ہو یا طیارے سے گر کر ہلاک ہُوا ہو یا آگ میں جل کر اس کی راکھ ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو، سب کو وہی قادرِ مطلق جو انھیں کتمِ عدم سے عالم وجود میں لایا تھا دوبارہ زندگی عطا فرمائے گا۔ پھر سب یکجا کر کے میدانِ حشر کی طرف روانہ کر دیے جائیں گے اور سب ذی حیات انسان، جن اور وحشی جانور مُھطِعِین

إِلَى الدَّاعِ ط يَقُولُ الْكَافِرُونَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝ ۔القمر۔ "پکارنے والے کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے اور وہی منکرین (جو دنیا میں اس کا انکار کرتے تھے) اس وقت کہیں گے یہ دن تو بڑا کٹھن ہے۔"

پھر جناب باری تعالیٰ جہنم کو حکم دیں گے وہ سامنے آجائے گا اور دُور سے سب کو نظر آرہا ہوگا۔ اس وقت ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے: أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ج إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ط أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ۝ هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝ یٰسین۔ "آدم کے بچو! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو۔ یہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور میری ہی عبادت کرنا۔ یہ سیدھا راستہ ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے تم میں سے ایک گروہِ کثیر کو گمراہ کر دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے۔ یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا۔"

پھر ربِ جلیل حکم صادر فرمائیں گے اور مجرموں کو آگے بڑھایا جائے گا۔ وہ سب سے علیحدہ کر دیے جائیں گے اور سب انھیں پہچان لیں گے۔ اُس وقت ان کی حالت یہ ہوگی کہ ہر مجرم آرزو کرے گا۔ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا ۝ النبا۔ "کہ کاش میں (انسان کی بجائے) خاک ہوتا۔"

پھر تمام کافر اور ان کے ساتھ وہ سب جن اور شیاطین جہنم میں یک جا کر دیے جائیں گے جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پوجتے تھے اور انھیں خدا مانتے تھے اور ان کے لیے انھوں نے طرح طرح کے نام ایجاد کر رکھے تھے، حالانکہ ان کی کوئی حقیقت نہ تھی اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی سند بھی نہیں اُتاری تھی مگر ان لوگوں نے اپنے گمانِ باطل کی وجہ سے انھیں خدا مان لیا تھا۔ جس طرح یونانیوں نے "زیوس" اور "منروا" کو رومیوں نے "جوپیٹر" اور "افرودیت" کو ایرانیوں نے "ہرمز" اور "اہرمن" کو اور مصریوں نے "حابی" کو اور فینیقیوں نے "بعل" اور عربوں نے "لات" اور "عزّیٰ" کو اللہ تعالیٰ کا

شریک فرض کر لیا تھا۔ اس وقت ان سے ارشاد ہوگا: نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ ۔ الکہف (۵۲) "کہ پکارو اب ان ہستیوں کو جنھیں تم میرا شریک سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ ان کو پکاریں گے مگر وہ ان کی مدد کو نہ آئیں گے۔" تو باری تعالیٰ دریافت فرمائیں گے: مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۲۵۔ الصافات "کیا ہوگیا تمھیں اب کیوں ایک دُوسرے کی مدد نہیں کرتے۔" اسی موقع پر کمزور لوگ اپنے مغرور اور متکبر لوگوں کی طرف دیکھیں گے (جنھوں نے دُنیا میں خود کو ان کمزور لوگوں کا سردار اور قائد منوا رکھا تھا اور اپنے اثر و رسُوخ سے گمراہ کر کے انھیں کفر و شرک میں مُبتلا کر دیا تھا) اور مدد طلب کرتے ہوئے کہیں گے: إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ط ابراہیم (۲۱) "دُنیا میں ہم تمھارے تابع تھے۔ اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" تو وہ بے رُخی سے جواب دیں گے اور عذابِ الٰہی سے انھیں اور خود کو ذرا بھی بچا سکنے سے عاجز ہونے کا اعتراف کر لیں گے اور سب لوگ ربُّ العالمین کے حضور عاجز و درماندہ ہو کر جھکے ہُوئے ہوں گے۔ ساری مفروضہ خدائیاں ختم ہو چکی ہوں گی اور جھوٹ بول کر کیے گئے تمام باطل دعاوی نابُود ہو چکے ہوں گے۔ مخلوق خداؤں اور ان کے پُجاری کافروں کے درمیان جو ذیبل مُعاہدہ تھا اس کی حقیقت بھی کھُل کر سامنے آجائے گی۔ ہر چھوٹا معبُود اپنے پرستاروں سے بیزاری کا اظہار کرے گا۔ حتیٰ کہ شیطان بھی اپنے ماننے والوں کے آگے اپنے جھُوٹے ہونے کا اعتراف کرے گا۔ اور جب سارے معاملے کا فیصلہ ہو چکا ہوگا تو شیطان کہے گا: إِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ط ابراہیم (۲۲) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے تھے ان میں سے کوئی بھی پُورا نہ کیا۔" اپنی ذمّہ داری سے بچنے کے لیے حیلے بہانے تلاش کرے گا۔ اور دُنیا میں اپنے عاجز اور کمزور ہونے کا اقرار کرتے

ہوئے ساری ذمہ داری اپنے پیروکاروں کے سر ڈال دے گا اور کہے گا کہ میرے اختیار میں تو صرف دل میں وسوسے ڈالنا اور گمراہ کرنا تھا۔ میرے پاس نہ تو کسی کو بنانے بگاڑنے کی طاقت تھی اور نہ نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت : مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ۔ ابراہیم (۲۲) "میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔" إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ٥۔ النساء "اور یقین جانو شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔"[1]

حساب واحتساب

پھر حساب کتاب کے لیے پیشی ہوگی اور عدلِ مطلق کی میزان نصب کر دی جائے گی۔ یہ ترازو انسانی اعمال میں سے رائی کے دانے یا غبار کے ذرّے کے برابر کوئی عمل بلکہ ایٹم کی فضا میں گردش کرنے والے الیکٹرون یا ان سے بھی کم وزن کوئی کارنامہ ایسا باقی نہ چھوڑے گی جس کا پوری طرح احاطہ کر کے کرنے والے کے سامنے نہ پیش کر دے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ترازو عمل کا موقع و محل اور کرنے والے کی نیت خیر اور اس کے دلی خلوص کو بھی ظاہر کر دے گی جس کی وجہ سے ترازو کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور جس کے دل میں عمل کرتے وقت نفاق ہوگا یا ریا کے لیے عمل کیا ہوگا اس کا بدی کا

---

[1] اس آیۂ مبارکہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جھوٹے پیر اور عامل قسم کے لوگ جو دعوی کرتے ہیں کہ وہ شیاطین اور جنوں کو قبضے میں کر کے جسے چاہیں فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں یا جن لوگوں کو مرگی کی قسم کے دورے پڑتے ہیں ان کے جسم سے وہ جن نکال سکتے ہیں، یہ تمام دعوے غلط ہیں۔ شیطان کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ (مصنف)

پلڑا بھاری ہو جائے گا۔[1]

یہاں مقدمہ کی کارروائی (محاکمہ) پوری طرح عدل و انصاف پر مبنی ہو گی۔ جس میں انسان کو اس کے کمائے ہوئے نیک اعمال کے سوا یا ربِ کریم کی رحمت و رأفت کے علاوہ (جس کی وہ اپنے رب سے توقع اور آرزو کرتا رہتا تھا) کوئی چیز فائدہ نہ پہنچائے گی دُنیا کے مال و دولت میں سے صرف وہ اس کے کام آئے گا جو وہ اللہ واسطے اور خدا کی راہ میں خرچ کر چکا ہو گا۔ باقی مال و دولت اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ دنیا میں جو اقتدار اور منزلت اسے حاصل تھی وہ بھی اس کے کسی کام نہ آئے گی اِلّا یہ کہ اس نے اپنا جاہ و مرتبہ اور اقتدار و اختیار احکامِ الٰہی کی بجا آوری میں استعمال کیا ہو۔ نہ کوئی شخص کسی دُوسرے کو کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکے گا اور نہ کسی کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں ہو گا۔ نہ وہاں کسی کو کوئی ایسا سفارش کرنے والا ملے گا جو ان کی مدد کر سکے۔ سوائے اس صُورت کے کہ خُدائے ذوالجلال خود کسی کو شفاعت کی اجازت مرحمت فرمائے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ عالمِ آخرت کی شفاعت دُنیوی سفارش کی مانند نہیں ہو گی۔ یہاں دُنیا میں تو سفارش کرنے والا کسی حاکم کے پاس جا کر اس سے اپنی محبّت اور تعلقات جتاتا ہے یا اس کے سامنے اپنی دولت و وجاہت کا اظہار کرتا ہے۔ اور حاکم چاہے نہ چاہے اس پر سفارش ٹھونس دیتا ہے اور اپنی سفارش سے یا تو کسی مُلازم کو قصور وار ٹھہرا دیتا ہے۔ یا کسی ملزم کو بری کرا لیتا ہے۔ عالمِ آخرت کی شفاعت صرف اس صورت میں بروئے کار آئے گی جب ربِ کریم اپنی رحمتِ خاص سے

---

[1] میزان کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر مزید یہ تبصرہ ضروری ہے کہ لوگوں نے میزان اور اس کی وضع قطع کے بارے میں جو مَن گھڑت باتیں بنا رکھی ہیں۔ ان کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی سند نہیں ہے۔ (مصنّف)

اپنے کسی گنہگار بندے کو معاف فرمانا چاہیں گے تو اپنی کسی مقبولِ بارگاہ ہستی کو اپنی عنایتِ خاص سے نوازنے کے لیے اس گناہ گار کی سفارش کی اجازت دے دیں گے اور گنہگار کی بخشش کا سببِ ظاہری بنا دیں گے۔

گواہ اور ثبوت

اس دُنیا کی عدالتیں جن میں جج انسان ہوتے ہیں ان میں انصاف کا معیار انسان کی محدود صلاحیت اور بساط کے مُطابق ہوتا ہے۔ ان عدالتوں میں اثباتِ جُرم کے وسائل بھی لگے بندھے اور سطحی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس آخرت کی عدالتیں جن میں فیصلہ دینے والا ربّ الارباب ہوگا۔ ان میں انصاف اتنا آزاد اور بے لاگ ہوگا جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور ثبوت کے لیے انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسلام کی شہادت اور ان ملائکہ کی گواہی پیش کی جائے گی جو دنیا میں انسانوں کے نیک وبد اعمال کا پُورا پُورا حساب رکھتے تھے اور وہ کھاتے پیش کیے جائیں گے جن میں ملزم کے اعمال بہ تفصیل درج ہوں گے۔ علاوہ ازیں گناہ گاروں کے اپنے اقبالِ جرم کے اعترافات اور ان کے اعضا وجوارح کی شہادتیں پیش ہوں گی۔

انبیاء علیہم السّلام کی گواہی

حساب کے وقت عرصہ محشر میں انبیاء علیہم السّلام کو بلایا جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِائَىءَ بِالنَّبِيِّيْنَ وَالشُّهَدَآءِ (الزمر ۶۹) "کتابِ اعمال[1] لاکر رکھ دی جائے گی۔ انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے۔" ہر اُمت کا مقدمہ ان کے نبی کی موجودگی میں ان کی شریعت کے مطابق فیصل ہوگا: وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰى اِلٰى كِتَابِهَا (الجاثیہ ۲۸) "اس وقت تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامۂ اعمال دیکھے"۔ اور: فَكَيْفَ اِذَا

---

[1] آیۂ مبارکہ میں لفظ کتاب آیا ہے جس سے مصنّفِ محترم شریعت مُراد لے رہے ہیں جبکہ اکثر مترجمین نے کتاب کا ترجمہ نامۂ اعمال کیا ہے۔ (مترجم)

جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ شَهِيۡدًا ؕ۔ النساء" پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔"

نامۂ اعمال اور روزنامچے

یہ روزنامچے جن میں ہمارے اس دُنیا کے تمام کارنامے لکھے جاتے ہیں اتنے محفوظ اور خفیہ رکھے جاتے ہیں کہ ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص ان میں درج شدہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کر لے تو اندراج حذف کر دیا جاتا ہے ورنہ بدستور موجود رہتا ہے۔ جب یوم حساب آئے گا تو ان دفتروں کو کھولا جائے گا اور نشر کر دیا جائے گا۔ جس طرح امتحانات کے نتائج نشر کیے جاتے ہیں۔ پہلے یہ رازدارانہ طور پر صرف مُمتحن کے پاس محفوظ ہوتے ہیں کسی کے فیل ہونے کا علم اُس کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا لیکن جب نتائج کا اعلان کیا جاتا ہے تو سب کو معلوم ہو جاتا ہے اور فیل ہونے والا اپنے دوستوں اور گھر والوں کی نظر میں رُسوا ہو جاتا ہے میدانِ حشر میں جو رُسوائی ہو گی پوری دُنیا کے سامنے ہو گی اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔ دُنیا میں تو امتحان میں فیل ہونے والا صرف اپنی کلاس سے پیچھے رہ جاتا ہے یا عمر میں سے ایک سال ضائع ہونے کا نقصان اُٹھاتا ہے لیکن آخرت میں ناکام ہو جانے والا جہنّم میں ڈال دیا جائے گا اور اگر کافر ہو گا تو نجات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جانے اور ابدُالآباد تک عذاب میں رہنے کا نقصان اٹھائے گا۔

جب نامہ ہائے اعمال نشر اور تقسیم کیے جائیں گے تو ہر شخص اس میں اپنے کارنامے واضح طور پر لکھے ہُوئے پائے گا۔ اس سے کہا جائے گا: اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ؕ۔ الاسرا "پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔" جس شخص کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اور جن کا کھاتہ ملک الیمین

(داہنے طرف کا فرشتہ) نے مرتب کیا ہوگا اسے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا،
یہ گویا اس کے لیے اس بات کی بشارت ہوگی کہ محاسبہ سہل اور مختصر ہوگا۔ اور جب یہ شخص
اس کے اندراجات دیکھے گا تو خوشی سے کھل اٹھے گا۔ اور جس طرح ایک کامیاب طالب علم
اپنے امتحان کا نتیجہ دیکھ کر چاہتا ہے کہ اپنی کامیابی کی خبر اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کو دے
یہ شخص بھی لوگوں سے کہے گا: هَآؤُمُ اقْرَءُوا كِتٰبِيَهْ ۝۱۹ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ
حِسَابِيَهْ ۝۲۰ الحاقۃ۔ "لو دیکھو، پڑھو میرا نامۂ اعمال میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب
ملنے والا ہے۔" اور جس کی بدکاریاں (جنھیں بائیں طرف کے فرشتے نے مدوّن کیا ہوگا)
زیادہ ہوں گی، اسے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ جسے دیکھ کر اسے اپنی
حالت پر رونا آجائے گا اور اپنی ہلاکت کا یقین ہو جائے گا اور کہے گا: يٰلَيْتَنِیْ
لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝۲۵ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝۲۶ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝۲۷
مَآ اَغْنٰى عَنِّیْ مَالِيَهْ ۝۲۸ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِيَهْ ۝۲۹ الحاقۃ۔ "کاش میرا نامۂ اعمال
مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے کاش میری وہی موت (جو دنیا میں
آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہوگیا۔"
دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے: وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝۱۰ فَسَوْفَ
يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝۱۱ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝۱۲ الانشقاق۔ "رہا وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس
کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے
گا۔" مجرم جب اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے۔ تو اس میں انھیں ہر چھوٹا بڑا عمل جو انھوں نے
دنیا میں کیا ہوگا، لکھا ہوا ملے گا: اَحْصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ المجادلہ (۶) "وہ بھول
گئے ہیں مگر اللہ نے ان کا سب کیا دھرا گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے۔" اور حیران ہوتے
ہوئے کہیں گے: يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً
اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ الکہف (۴۹) "کہ ہائے ہماری کم بختی،

یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہو گئی ہو جو جو کچھ انھوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے۔" پھر انھیں یقین آجائے گا کہ انھوں نے خود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا تھا: وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝ ۴۹ الکہف "اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا۔" اس وقت وہ اپنی ان بےاعتدالیوں پر نادم ہوں گے جو انھوں نے شیطان اور نفسِ امّارہ کا اتّباع کر کے کی تھیں اور اپنے آپ کو کوسیں گے کہ اچانک یہ آواز سنائی دے گی: لَمَقْتُ اللّٰهِ أَكْبَرُ مِن مَّقْتِكُمْ أَنفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ۝ المومن "آج تمھیں جتنا شدید غصہ اپنے اُوپر آرہا ہے اللہ تم پر اس سے زیادہ غضب ناک اس وقت ہوتا تھا جب تمھیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے۔"

دفاع اور اقرارِ جرم

کافر جب حساب کے لیے پیش ہوں گے تو پہلے انکارِ جرم کی کوشش کریں گے اور اپنے بے گناہ ہونے پر قسمیں کھائیں گے۔ گویا وہ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ کسی دنیوی حاکم کی پیشی میں ہیں جو کسی معاملے کی صرف ظاہری حالت دیکھ سکتا ہے۔ اور یہ بات بھول گئے ہوں گے کہ وہ اس وقت ربّ العالمین اور احکم الحاکمین کے حضور میں حاضر ہیں جو دلوں کا حال جانتا ہے اور ذہن کے وسوسوں سے بھی باخبر ہے: فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ ۝ المجادلہ (۱۸) وہ اس کے سامنے بھی اسی طرح قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے کھاتے ہیں۔" اور کہیں گے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ ۲۳ الانعام "اے ہمارے آقا! تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔"

اس جھوٹ کی وجہ سے ان کی زبان بند کر دی جائے گی اور بول نہیں سکیں گے پھر اُن کے اعضا کو جو حرام کاموں کا ارتکاب کرتے رہے تھے بولنے کا حکم دیا جائے گا اور وہ اپنے کارناموں کا اقرار کریں گے۔ ہاتھ خود بتائیں گے کہ انھوں نے کتنے حرام

کام کیے تھے اور پاؤں اعتراف کریں گے کہ کتنے ناجائز کاموں کے لیے چلے تھے:
اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ یٰسین۔ آج ہم ان کے مُنہ بند کیے دیتے ہیں، ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دُنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں"۔ یہ لوگ جب اپنے اعضا کے اقرار و اعتراف کی وجہ سے پھنس جائیں گے اور ان پر جُرم ثابت ہو جائے گا تو اپنے خلاف گواہی دینے والے اعضاء پر جھنجلاہٹ نکالیں گے: وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔ حٰم سجدہ (۲۱) "اور وہ اپنے جسم کے اعضاء سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی۔ وہ جواب دیں گے ہمیں اسی خُدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے"۔

یہ لوگ دُنیا میں چھُپ چھُپ کر بدکاریاں کیا کرتے تھے۔ جب کہ آج ٹیلی ویژن میں بولنے والا ایک ہر طرف سے بند اور سپاٹ دیواروں والے کمرے میں بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود باہر کے لاکھوں افراد اُسے دیکھتے اور اس کی باتیں سُنتے ہیں اور اس کی حرکات اور گفتگو کی گواہی دیتے ہیں۔ اگر اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی توفیق عطا فرما دی ہے تو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے احتساب کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ اسی لامحدود علم و قدرت کی بنا پر اللہ تعالیٰ مجرموں سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ ۝ حٰم سجدہ۔ "دُنیا میں جرائم کرتے وقت جب تم چھُپتے تھے تو تمھیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمھارے اپنے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی"۔ آخر کوئی شخص اپنی کھال اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں سے کس طرح فرار اختیار کر سکتا ہے جب کہ یہ چیزیں ہر وقت اس کے ساتھ لگی رہتی ہیں: وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ

اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ۲۳ حٰم سجدہ "بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمھارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمھارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا، تمھیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے"۔

دراصل یہی انجام ہے ہر اُس شخص کا جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کا منکر ہے۔ یہ لوگ چونکہ اس دُنیا سے آگے نہیں دیکھ سکتے اس لیے آخرت کا انکار کرتے ہیں جب کہ وہ بلا شبہ آکر رہے گی۔ اور اپنے جرائم کو اللہ تعالیٰ سے چھپانا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انھیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ پھر ان کے اعضا جن کے ذریعہ انھوں نے یہ گناہ سرانجام دیے تھے خود ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ آخر کوئی شخص ایسے گواہ سے جو ہر وقت ساتھ لگا ہُوا ہو اور جس سے جُدا ہونا ممکن نہ ہو کس طرح چھُپ سکتا ہے۔ الٰہ العالمین! ہم تجھ سے عفو و مغفرت کے طلب گار ہیں۔ آخرت میں بھی تو ہمارے گناہوں کی اسی طرح پردہ پوشی فرمایو جس طرح تُو نے ہمیں دُنیا میں رُسوائی سے بچایا ہے۔ تُو بہت ہی بخشش فرمانے والا اور بہت ہی پردہ پوشی فرمانے والا ہے۔

ایک بے معنی اعتراض

جب ہم چھوٹے تھے تو کچھ لوگ ہم سے ازراہِ تمسخر کہا کرتے تھے کہ ہاتھ پاؤں آخر کیسے باتیں کریں گے نہ ان کی زبان ہے اور نہ وہ بول سکتے ہیں پھر یہ ٹیپ ریکارڈر اور ٹاکی فلمیں ایجاد ہو گئیں۔ کاروباری مراکز میں ایسے آلات لگائے جانے لگے جو خفیہ طریقہ سے غیر مرئی شعاعوں[1] کے ذریعہ تصویر اُتار لیتے ہیں۔ اور محض کسی شخص کا سامنے سے گزر جانا کیمروں کو حرکت میں لے آتا ہے۔ اور چور کے پکڑے جانے پر اگر وہ جرم

[1] غیر مرئی شعاعیں: نظر نہ آنے والی "تحت الحمرا" (انفرا ریڈ) شعاعیں ہیں۔ ان کے ذریعہ اندھیرے میں تصویر اُتاری جا سکتی ہے۔ (مصنف)

سے انکار کرتا ہے تو اُسے وہ فلم چلا کر دکھاتے ہیں جس میں اس کی تمام حرکات و سکنات اور وہ سرگوشیاں بھی جو اس نے خود سے یا اپنے ساتھی کے ساتھ کی تھیں، ریکارڈ ہوتی ہیں۔ یہ ایجادات ان سب لوگوں کے لیے مسکت جواب کی حیثیت رکھتی ہیں جو خود کو عالم کہتے ہیں لیکن درحقیقت جاہل ہیں۔ یہ ایجادات بزبانِ حال ان لوگوں سے کہہ رہی ہیں کہ بدبختو جس قادرِ مطلق نے اس دُنیا میں ٹیپ کو زبان عطا فرما دی اور فلم میں چور کی تمام حرکتوں اور گفتگو کو جو وہ چوری کے وقت خفیہ طور پر کرتا ہے۔ ریکارڈ کر لینے کی صلاحیت اور توفیق انسان کو عطا فرما دی تاکہ چور کے انکار کی صُورت میں فلم اس کے سامنے چلا کر اسے اعترافِ جُرم پر مجبور کر دیا جائے۔ کیا اس ربِّ جلیل میں یہ قدرت و اختیار نہیں کہ آخرت میں انسانوں کے ہاتھ پاؤں کو گویائی عطا کر دے؟

حساب اور نتیجہ

میدانِ حشر میں حساب کئی قسم کا ہوگا جن لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا ان سے پُرسش مختصر اور آسان ہوگی اور جس قوم نے دنیا میں اپنے ربّ کے احکام سے سرکشی اور رُوگردانی اختیار کی تھی ان سے سخت باز پُرس ہوگی۔ حساب و کتاب کی اس کڑی آزمائش کے بعد انسانوں کی درجہ بندی کی جائے گی۔ مثلاً کچھ بخت بلند "سابقون المقربون" قرار دیے جائیں گے۔ کچھ خوش نصیب "اصحاب المیمنہ" اور کچھ بدبخت "اصحاب المشئمہ"۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ ۸۸ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ ۝ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ۝ ۸۹ وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنْ أَصْحَٰبِ الْيَمِينِ ۝ ۹۰ فَسَلَٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَٰبِ الْيَمِينِ ۝ ۹۱ وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّآلِّينَ ۝ ۹۲ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ۝ ۹۳ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ ۝ ۹۴ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ۝ ۹۵ فَسَبِّحْ بِٱسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝ ۹۶ الواقعہ "پھر وہ مرنے والا اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لیے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنت

ہے۔ اور اگر وہ اصحابِ یمین میں سے ہو تو اس کا استقبال یُوں ہوتا ہے کہ سلام ہے تجھے، تو اصحاب الیمین میں سے ہے۔ اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو تو اس کی تواضع کے لیے کھولتا ہُوا پانی ہے اور جہنم میں جھونکا جانا۔ یہ سب کچھ قطعی حق ہے۔ پس اے نبی اپنے ربِ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔"

جہنم پر گزر

سب انسان جہنم کے اُوپر بنے ہُوئے ایک صراط "(راستہ یا پُل) پر سے گزریں گے اس راستے پر سے گزرنے والا ہر شخص اتنی ہی تیزی سے گزرے گا جتنا زیادہ اُسے قربِ الٰہی حاصل ہو گا۔ اور جتنی زیادہ اس کی نیکیاں ہوں گی۔ نیک اور متقی لوگ تو پار اُتر جائیں گے اور ظالم لوگ جہنم میں گر جائیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝ مریم۔ "تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پُورا کرنا تیرے رب کا ذمّہ ہے۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو (دُنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اسی میں گرا ہُوا چھوڑ دیں گے اور سورۂ تکاثر میں جو ارشاد ہے کہ: لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ "تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر (سُن لو) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے۔" یہ پہلا دیکھنا میرے خیال میں (اللہ بہتر جانتا ہے) نیک لوگوں کا جہنم پر سے گزرنا اور نجات پا جانا ہے۔ اور رویت ثانیہ۔ ظالموں کا جہنم پر سے گزرنا اور اس میں گرنا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ رویت اُولیٰ سے مُراد وہ موقع ہو جب میدانِ حشر میں جہنم کو حاضرین کے سامنے لایا جائے گا اور سب اسے دیکھیں گے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

جنّت اور جہنّم

جنّت کے وہ کوائف و حالات جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ

وہ ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی یا یہ کہ جنّتیوں کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، ان کا لباس ریشم کا ہوگا یا وہاں دُودھ، شراب اور شہد کی نہریں ہوں گی یا یہ کہ جنّت میں حُور اور غلمان ہوں گے۔

یہ باتیں ہمیں ایک سمجھ میں نہ آسکنے والی حقیقت کا تصوّر دلانے کے لیے ہیں، اس لیے کہ انسانی لغت صرف اس زمین کی چیزوں اور ان چیزوں ہی کی کیفیتیں بیان کرنے کے لیے بنائی گئی ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ جنّت کی نہریں ہماری اس دُنیا کی نہروں کی مانند نہیں ہونگی اور نہ جنّت کا دُودھ، شہد اور شراب اس دُنیا کے دُودھ، شہد اور شراب کی طرح کا ہوگا۔ اور نہ حُوریں زمین کی عورتوں جیسی اور نہ غلمان دُنیا کے لڑکوں کی مثل ہوں گے۔ ہم نے کتاب کے شروع میں عقاید کے جو قواعد بیان کیے ہیں ان میں یہ بات پوری طرح وضاحت سے بتا دی گئی ہے کہ انسانی ذہن عالمِ آخرت کی چیزوں کا احاطہ کرنے یا اُس دُنیا کی حقیقتوں کی مثال تلاش کرنے اور پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہے۔ ہمارے بعض مفسّرین نے جنّت کی کیفیتوں سے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں اس کے لیے کوئی مستند ثبوت پیش نہیں کیا اور ان کی تمام تر کوشش اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے عالمِ آخرت کو اس دُنیا پر قیاس کر لیا تھا۔ جس طرح علماءِ علم کلام نے اللہ تعالیٰ کے عدل اور دیگر صفات کو اپنے جانے پہچانے انسانی عدل و انصاف پر قیاس کر لیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ بھُول بھلیّوں اور گمراہ کُن بحثوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ ان لوگوں کے لیے ان سب الجھنوں سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ دور از کار ابحاث میں پڑنے کی بجائے صرف قرآن و حدیث کی مقرر کردہ حدوں پر رُک جاتے اور سلف صالحین کا مسلک اختیار کرتے ہوئے یہ اعتراف کر لیتے کہ عقل ان امُور کو سمجھنے سے قاصر ہے اور انسانی تخیّل ان کا تصوّر نہیں کر سکتا۔

اسی قسم کے بیمار ذہن کی پیداوار اور بے نتیجہ وہ خیال آرائی ہے جو حُور کے بارے

میں بعض لوگوں نے کی ہے کہ گویا مرد جنّت میں حُور سے اسی طرح محظوظ ہوں گے جس طرح اس دُنیا میں عورتوں سے ہوتے ہیں. اور یہ بات بھول گئے کہ یہاں دُنیا میں مرد و عورت کے ایک دُوسرے سے محظوظ ہونے کا جو معروف طریقہ ہے اس کا نتیجہ بالآخر حمل اور بقاءِ نسل کی صُورت میں برآمد ہوتا ہے اور آخرت میں بھلا اس کی کیا ضرورت ہے۔ بنابریں درست اور راست طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ قرآن مجید میں بیان ہُوا ہے ہم بعینہٖ اس پر ایمان لے آئیں اور ایسی غیر ضروری تفصیلات پر بحث و مناظرہ کرنے کی بجائے جن سے قرآن مجید نے صرفِ نظر کیا ہے مومن بن کر نیک عمل کمائیں جو ہمیں جنّت میں پہنچائیں۔

جنّت میں داخلہ

کوئی شخص محض اپنی خواہش یا آرزو کی بنا پر جنّت میں نہیں چلا جائے گا بلکہ اس کے لیے ایمانِ کامل اور احکام کی بجا آوری ضروری ہے. ارشاد ہے: لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ط مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (النساء۔ ۱۲۳) "انجامِ کار نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی بُرائی کرے گا اس کا پھل پائے گا۔" دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۴۲) آلِ عمران۔ "کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُونہی جنّت میں چلے جاؤ گے. حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔" چنانچہ وہ مومن جنّت میں جائے گا جو یا تو نیک کام کرنے والا، اللہ کی طرف دُوسروں کو دعوت دینے والا، حق کو دُنیا میں سربلند دیکھنے کے لیے اپنی جان، مال اور زبان سے جدوجہد کرنے والا ہو، یہ تو زمرہ: اَلَّذِيْنَ جَاهَدُوْا" میں داخل ہو جائے گا۔ اور اگر یہ سب نہ کر سکے تو کم از کم مومن کو ایسا تو ضرور

ہونا چاہیے کہ شر کا اثر نہ قبول کرے اور بدی کی دعوت پر لبّیک نہ کہے۔ خود کو اور اپنے اہل و عیال کو بُرائی سے بچائے اور اپنی اس دینداری کے صلہ میں اسے جو مصائب و تکالیف برداشت کرنی پڑیں ان پر صبر کرے۔ تو یہ زمرہ "الصابرین"[1] میں شامل ہوگا۔

جب حساب و کتاب ختم ہو جائے گا اور اہلِ ایمان "پل صراط" سے صاف گزر جائیں گے تو گویا انھیں حقیقی نجات حاصل ہوگی : وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۝ ٧٣ " الزمر۔ "اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انھیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے "سلام ہو تم پر بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے"۔ اس وقت یہ لوگ کہیں گے : الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝ " الزمر۔ "شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں، پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے"۔

جنّت کے کوائف

جنّت کی وُسعت کا عالم یہ ہے کہ اس کا عرض زمین اور آسمان دونوں کی پہنائی کے برابر ہے۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں کیونکہ عالمِ آخرت کی اس دنیا کے مقابلے میں وہی حیثیت ہے جو اس زمین کی بطنِ مادر کے مقابلے میں کیا ایک جنین ماں کے پیٹ

---

[1] آیۂ مذکورہ بالا میں دو گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ اور دوسرا "الصَّابِرِينَ" ۔ (مترجم)

کو بھی پوری دُنیا خیال نہیں کرتا جب کہ اس دُنیا کا کوئی ایک گھر بھی بطنِ مادر کے مقابلہ میں لاکھوں گُنا بڑا ہے۔

ایسی ہی جنّت متقی لوگوں کو ملے گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ متقی لوگ جن کے لیے جنّت بنائی گئی ہے، کون ہیں؛ وہ کیا عمل کرتے ہیں؟ تاکہ ہم بھی ان کے سے عمل کرکے ان میں شامل ہوسکیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ متقی لوگ وہ ہیں: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط ..... وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ص آلِ عمران (۱۳۵) "جو ہر حال میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور دُوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں..... اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔" یہ متقی لوگوں کی چند صفات ہیں جو شخص عقیدے کی درستگی اور سچی توحید اختیار کرنے کے بعد خود میں یہ اوصاف پیدا کر لے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی عنایتِ خاص اور اپنے فضل و کرم سے اسے اس جنّت میں داخل کرے گا جو متقیوں کے لیے بنائی گئی ہے۔

جنّت کے مختلف درجے ہیں ان میں سے ایک درجہ "جنّت النعیم" ہے۔ یہ بہت بلند مرتبہ مقام ہے۔ ہر شخص اس تک نہیں پہنچ سکتا: اَیَطْمَعُ کُلُّ امْرِءٍ مِّنْھُمْ اَنْ یُّدْخَلَ جَنَّۃَ نَعِیْمٍ ۳۸ۙ۔ المعارج۔ "کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنّت میں داخل کر دیا جائے گا۔" یہ مقام بلند صرف نیکیوں میں سبقت لے جانے والے "السابقون السابقون" کے لیے مخصوص ہے اور: اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۱۱ۚ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۱۲ الواقعہ۔ "وہی تو مقرب لوگ ہیں جو نعمت بھری جنّتوں میں

رہیں گے۔"

ایک اور جنت جس کا نام "غرفہ" ہے۔ اس جنت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں سے کیا ہے جن کا ذکر سورۂ "فرقان" میں اس انداز سے کیا گیا ہے۔ یہ اللہ کے وہ بندے ہیں جو عقاید کی درستگی اور عمل میں استقامت کے ساتھ عبادت گزار اور بلند اخلاق کے حامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غرفہ بھی جنت میں ایک بلند درجہ ہے جو اُن باکمال افراد کے لیے مخصوص ہے جو ان صفاتِ عالیہ کے حصول کے بعد انھیں باقی رکھنے کے لیے ہر مشقت اور تکلیف برداشت کرتے ہیں اور ترغیبات کے زیرِ اثر خود کو اس مقامِ بلند سے گرنے نہیں دیتے[۱]۔

نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ جنت میں: جَنّٰتٍ[۲] مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ۔ الانعام (۱۴۱) "طرح طرح کے باغ اور تاکستان" ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مقام کا نام "جنت الماویٰ" ہے اور ایک مقام کو "جنت عدن" کہا گیا ہے۔ اور: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ۚ الرحمٰن ۴۶ "ہر اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو دو باغ ہیں" صرف ایک نہیں۔ اسی طرح ایک مقام کا نام علّیّین ہے۔ قرآن مجید کے اس اندازِ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتوں کے کئی درجے ہیں اور اہلِ جنت کے مقامات و منازل مختلف و متفاوت ہیں۔

---

[۱] سورۃ الفرقان میں آیت ۱، سے ۴، تک ان نیک لوگوں کے اوصاف بیان ہوتے ہیں اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے صبر کا پھل منزلِ بلند (غرفہ) کی شکل میں پائیں گے۔" (مترجم)

[۲] اس سلسلے میں غالباً مصنف محترم کو کچھ غلط فہمی ہے۔ سیاق و سباق کے مطابق قرآن مجید میں ان سے اس دنیا کے باغات اور تاکستان مُراد ہیں۔ (مترجم)

اہلِ جنّت اور اُن کے ساتھ سلوک

جنت میں جنتیوں کے ساتھ ان کے اہل وعیال اور بھائیوں کو یکجا کر دیا جائیگا ارشاد ہے: اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝ الزخرف "داخل ہو جاؤ جنّت میں تم اور تمھاری بیویاں، تمھیں خوش کر دیا جائے گا"۔ دُوسری جگہ فرمایا گیا ہے: هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ۝ ۵۶ یٰسین "وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں مسندوں پر تکیے لگائے ہُوئے"۔ نیز ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ الطور (۲۱) "جولوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجۂ ایمان میں ان کے نقشِ قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم (جنّت میں) ان کے ساتھ ملا دیں گے"۔ اور یہ سب محبّت وخلوص کے ساتھ جنّت میں یک جا رہیں گے: وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ الاعراف (۴۳) ان کے دلوں میں ایک دُوسرے کے خلاف جو کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے"۔ افرادِ خاندان اردگرد صف بستہ اور مسندوں پر ان کی مجلسیں منعقد ہوں گی۔ اور یہ لوگ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ج الطور (۲۰) "آمنے سامنے بچھے ہُوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے"۔ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ ۴۷ الحجر۔ "وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے"۔ ان مسندوں پر فرش بچھا ہوگا جس کا اُستر ایک نفیس کپڑے کا ہوگا جسے "استبرق" کا نام دیا گیا ہے اور ان کے اردگرد گھنے درختوں والے باغات ہوں گے۔ ان درختوں کے پھل اتنے قریب ہوں گے کہ ہاتھ بڑھا کر لے سکیں گے۔

علاوہ ازیں جنّت میں جنتیوں کی خدمت کے لیے نوعمر خادم ہونگے: غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ۝ ۲۴ الطور۔ "ان کی خدمت میں وہ لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو انہی کے لیے مخصوص ہوں گے۔ ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہُوئے موتی"۔

يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِينَ ۝۵۵ الدخان۔ "وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے۔" يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۝۴۵ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِينَ ۝۴۶ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ۝۴۷ الصّٰفّٰت۔ "شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے۔ چمکتی ہوئی شراب جو پینے والوں کے لیے لذّت ہو گی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہو گا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہو گی۔" اور کھانا اُن کے آگے گردش کرایا جائے گا۔ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ۔ الزخرف (۱۷) "سونے کے تھال میں" = اور شراب لائی جائے گی۔ بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيقَ ۝۱۸ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۝۱۸ الواقعہ "پیالوں۔ کنٹروں اور ایسے جام میں جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا۔" وہاں انھیں دل پسند کھانے پینے کی چیزیں ملتی رہیں گی۔ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ۝۲۰ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۝۲۱ الواقعہ "اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چُن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں۔" نیز۔ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۝۲۸ وَّطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۝۲۹ وَّظِلٍّ مَّمْدُودٍ ۝۳۰ وَّمَآءٍ مَّسْكُوبٍ ۝۳۱ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۝۳۲ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ ۝۳۳ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ ۝۳۴ الواقعہ۔ وہ بے خار بیریوں اور تہ بہ تہ چڑھے ہوئے کیلوں اور دُور دُور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں اور اُونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔" لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا ۝۱۳ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ۝۱۴ الدھر۔ "نہ انھیں دھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر۔ جنّت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہو گی۔ اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے۔" تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝۲۴ المطففین۔ "ان کے چہروں

پر تم خوش حالی کی رونق محسوس کرو گے۔" تو ان کے چہرے نَاعِمَةٌ ۝ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝ الغاشیہ۔ "با رونق ہوں گے اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے۔" انھیں جنّت میں ہر طرف جانے کی پُوری آزادی ہوگی۔ ایک دوسرے سے مُلاقات کریں گے اور باہم گفتگو کریں گے۔ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۝ ابراہیم۔ "وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارک باد سے ہوگا"۔ صرف اچھی باتیں ہی مُنھ سے نکالیں گے۔ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ الحج (۲۴) "اور ان کو پاکیزہ بات کہنے اور قبول کرنے کی ہدایت بخشی گئی"۔ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۝ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ ۝ الطور "یہ لوگ آپس میں ایک دُوسرے سے (دُنیا میں گزرے ہُوئے) حالات پُوچھیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہُوئے زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جُھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا"۔ اور یہ جو کچھ ہمیں ملا ہے دُعا اور استغفار کا نتیجہ ہے۔ إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ۝ الطور۔ "ہم پچھلی زندگی میں اسی سے دُعائیں مانگتے تھے، وہ واقعی بڑا محسن اور رحیم ہے"۔ یہ لوگ جب آپس میں باتیں کریں گے۔ تو اس دُنیا اور دُنیا والوں کا تذکرہ کیا کریں گے اور دُنیا میں اپنی حالت اور کیفیت اور آخرت میں جو کچھ ملا ہے اس کے بارے میں ایک دوسرے کو بتایا کریں گے: قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ۝ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَدِينُونَ ۝ قَالَ هَلْ أَنتُم مُّطَّلِعُونَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ قَالَ تَاللَّهِ إِن كِدتَّ لَتُرْدِينِ ۝ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ۝ الصّٰفّٰت۔ "ان میں سے ایک کہے گا، دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے (ازراہِ تمسخر و عناد) کہا کرتا تھا کیا تم بھی تصدیق

کرنے والوں میں ہو۔ کیا واقعی جب ہم مر چکے ہوں گے اور مٹی ہو جائیں گے۔ اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟ اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں؟ یہ کہہ کر جونہی وہ جھکے گا تو جہنم کی گہرائی میں اس کو دیکھ لے گا اور اس سے خطاب کر کے کہے گا۔ خُدا کی قسم تُو تو مجھے تباہ ہی کر دینے والا تھا۔ میرے رب کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو آج میں اُن لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہُوئے آئے ہیں۔" ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنّتی نہ صرف دوزخیوں کی حالت اور کیفیت سے مطلع ہو سکیں گے بلکہ جنتی اور دوزخی باہم گفتگو بھی کر سکیں گے۔

ربِ کریم جنتیوں کو بطورِ انعام و اکرام "حُورالعین" بھی عطا فرمائیں گے۔ یعنی یہ حُوریں اُن کی بیویاں ہوں گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ ۝ ۲۰ الطور۔ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۝ ۲۳ الواقعہ۔" اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حُوریں ان سے بیاہ دیں گے"۔ "ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی"۔ اللہ تعالیٰ ان حوروں کو خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انھیں: أَبْكَارًا ۝ ۳۶ عُرُبًا أَتْرَابًا ۝ ۳۷ الواقعہ "باکرہ بنا دیں گے اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن"۔ جو قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ ۵۶ الرحمٰن۔" شرمیلی نگاہوں والی ہوں گی جنھیں ان جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھُوا نہ ہوگا"۔

جنّت میں: دَعْوَاهُمْ فِيهَا = اِن لوگوں کی صدا = سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ = پاک ہے تُو اے خُدا" ہوگی = وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ " اور ان کا باہمی سلام ہوگا" السلام علیکم"۔ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ یونس" اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس بات پر ہوگا۔ کہ ساری تعریف اللہ ربّ العٰلمین ہی کے لیے ہے"۔ اور کہیں گے: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا قف وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ج

لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ ۴۳ الاعراف "تعریف خدا ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا۔ ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے۔ اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا، ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق لے کر آئے تھے۔ اس وقت ندا آئے گی کہ یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہیں ان اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے ہو"۔: لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُم مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ۝ ۴۸ الحجر۔ "اور انھیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑے گا اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے"۔ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ الدخان (۵۶) "وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے۔ بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی"۔ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ ۝ ۲۳۔ الرعد اور "ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور مبارک باد دیتے ہوئے ان سے کہیں گے": سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ ۲۴ الدہر "تم پر سلامتی ہے تم نے دُنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہو بس کیا ہی خُوب ہے یہ آخرت کا گھر"۔ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ۔ الزخرف (۷۱) "ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذّت دینے والی چیز وہاں موجود ہو گی": إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ ۶۰ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ۝ ۶۱ الصّٰفّٰت۔ "یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے" وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝ ۲۶ المطففین۔ "جو لوگ دُوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں"

اے ربِ کریم! اپنی رحمت سے جو پُوری کائنات کو محیط ہے اور اپنے عفو و مغفرت سے کہ تو بہت ہی معاف فرمانے والا اور بخشش کرنے والا ہے، ہمیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھیو اور سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل کیجیو۔

جہنّم

جہنم کی آگ کا تصوّر کرتے وقت عام طور پر جو خیال فوراً ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ وہ بھی ہماری دُنیا کی آگ ہی کی مانند کوئی آگ ہوگی جو اس سے بہت زیادہ تیز اور شدید ہوگی بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی شدّت کی کوئی حد نہیں۔ دونوں میں اگر کوئی مماثلت ہے تو صرف یہ کہ دونوں آگ ہیں لیکن اس کے سلسلے میں جو کچھ قرآن مجید میں وارد ہُوا ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ آگ کوئی اور ہی قسم کی آگ ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ دُنیاوی آگ کی قسم سے ہی کوئی چیز ہوتی تو وہ بھی ہر چیز کو جلا کر کوئلہ بنا دیتی۔ جب کہ جہنم میں درخت بھی ہیں پانی بھی ہے اور سایہ بھی۔ یہ دُوسری بات کہ وہاں یہ سب چیزیں خود عذاب کا سامان ہیں آرام پہنچانے کے لیے نہیں ہیں۔ پھر دُنیا کی آگ میں تو اگر کسی کو ڈالا جائے تو وہ اسے جلا کر ہلاک کر دیتی ہے اور وہ درد و تکلیف سے نجات پا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جہنم کی آگ۔ پناہ بخدا! اس کا درد والم ابدی ہے: لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا فاطر (۳۶) نہ ان کا قصہ پاک کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ ان کے لیے جہنم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی"۔ یہ آگ مجرموں کی کھالوں کو جلا کر فنا نہیں کر دے گی بلکہ گلا دے گی۔ وَكُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ط النساء (۵۶) اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دُوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خُوب عذاب کا مزا چکھیں"۔ پھر یہ جہنم کے باسی زندہ ہوں گے سوچیں گے، دنیوی زندگی کا تذکرہ کریں گے اور باہم جھگڑیں گے۔ نیز جہنم میں درخت بھی ہوں گے مگر یہ زقوم (تھوہر) کا درخت ہوگا۔ جو: تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۙ۶۴ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۶۵ الصّٰفّٰت۔ " جہنم کی تہہ سے نکلتا ہے اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر"۔ جہنم میں اہلِ جہنم کے لیے خوراک بھی ہوگی۔ مگر

خوراک کے طور پر یہی خبیث درخت کھانا پڑے گا: فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ۝ الصّٰفّٰت ۶۶ "اور اسی سے پیٹ بھریں گے"۔ اور دُوسری جگہ فرمایا گیا ہے: اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ ۴۳ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ ۴۴ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ ۴۵ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝ ۴۶ الدخان "زقوم کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا۔ تیل کی تلچھٹ جیسا پیٹ میں اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہُوا پانی جوش کھاتا ہے"۔ جہنم میں پانی بھی ملے گا لیکن یہ پانی کچھ لہو ہوگا۔ جو کافروں کو پلایا جائے گا: يَتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ۔ ابراہیم (۱۷) "جسے وہ زبردستی حلق سے اُتارنے کی کوشش کرے گا اور مشکل ہی سے اُتار سکے گا"۔ جب جہنم میں کافر درخت زقوم کھائیں گے تو پینے کو انھیں وہ انتہائی گرم پانی (الحمیم) ملے گا، جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے، اور پیاس کی شدت کی وجہ سے یہ پانی پیاس سے تونسے ہوئے اُونٹ کی طرح پیئیں گے۔ پھر یہی کھولتا ہُوا پانی ان کے سروں پر ڈالا جائے گا: يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝ ۲۰ الحج۔ "جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصّے تک گل جائیں گے"۔

جہنم میں لباس بھی ملے گا لیکن آگ کا بنا ہُوا: فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ الحج (۱۹) "وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں"۔ نیز جہنم میں سایہ اور سائبان بھی ہوں گے مگر یہ بھی آگ کے ہوں گے: لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ الزمر (۱۶) "ان پر آگ کی چھتریاں اُوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی"۔ اور یہ سایہ: ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ ۴۳ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ ۴۴ الواقعہ "کالے دُھوئیں کا سایہ ہوگا جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ"۔ یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنھوں نے آخرت کے مقابلے میں دُنیا کو انتخاب کر لیا اور یہاں عیش و عشرت کی زندگی گزاری۔ کفر پر اصرار اور آخرت کا انکار کرتے رہے: اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ ۴۵ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ

عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۝ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ الواقعہ۔ "یہ وہ لوگ ہونگے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے کیا جب ہم مرکر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجرہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے"؟ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ھود۔ "دوزخ میں وہ ہانپیں گے اور پھنکار ماریں گے اور ہمیشہ وہ اسی حالت میں رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے"۔

جہنم میں داخلہ

جب حساب و کتاب ختم ہو جائے گا اور کافروں کے لیے عذاب کا فیصلہ صادر کر دیا جائے گا تو سب کو اجتماعی طور پر جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ جہنم انھیں دیکھ کر انکی سرکشی، کفر اور اللہ کے رسولوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے شدید غیظ و غضب کا اظہار کرے گا اور جہنم کے محافظ فرشتے ان کی حماقت اور اپنی ذات سے دشمنی پر سخت حیراں ہوں گے اور ان سے بارہا اس ناعاقبت اندیشی کا سبب دریافت کریں گے: تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ الملك۔ "جہنم کی آگ شدت غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا اس کے کارندے ان لوگوں سے پوچھیں گے، کیا تمھارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا"۔ اس وقت ان کے پاس اعتراف گناہ کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا اور جواب دیں گے: بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ج الملك (۹) "ہاں، خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا، مگر ہم نے اسے جھٹلایا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے"۔ اس پر ملائکہ جہنم کہیں گے:

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ ۝ الملک "تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو" اور وہ یہ اقرار کریں گے کہ ہم واقعی بہرے اور بے عقل ہو گئے تھے انبیاء کی کوئی بات نہ سنتے تھے اور نہ سمجھ بوجھ سے کام لیتے تھے۔ کاش ہم نے ان کی نصیحت سُنی ہوتی یا اپنی ذات پر اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات پر ہی غور کیا ہوتا تو یقیناً ہم خالق حقیقی پر ایمان لے آتے اور اس کے رسولوں کا کہنا مان لیتے تو آج جہنم میں نہ جاتے: وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ الملک "اور وہ کہیں گے، کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کریں گے۔ لعنت ہے ان دوزخیوں پر"

جہنم کا قید خانہ

جہنم دراصل ایک بندی خانہ ہے جس کے سات دروازے ہیں۔ مجرموں کو اندر داخل کر کے یہ دروازے بند کر دیے جائیں گے اور: لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝٤٤ الحجر "ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک حصّہ مخصوص کر دیا گیا ہے" اور ان دروازوں کو موٹے موٹے ستونوں کی مانند بڑے بڑے کُنڈے لگا کر بند کر دیا جائے گا: اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝ الھمزہ "وہ آگ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے)"۔ اور یہ سب بدنصیب لوگ اس قید خانے میں انتہائی تنگ جگہ میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اور باندھ کر ڈال دیے جائیں گے اور اللہ تعالےٰ نے ان کے لیے: سَلٰسِلَاْ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝٤ الدھر "زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ" مہیا کر رکھی ہے۔

جہنم سے نکلنے کی کوشش

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دُنیا میں زندگی کی مہلت دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے عقل عطا فرمائی ہے کہ اپنے لیے جو راہ چاہے انتخاب کر لے۔ پھر اسے قوتِ ارادی ارزانی فرمائی ہے جس کی مدد سے اپنی پسندیدہ راہ پر چل سکے۔ اب بعض لوگوں نے جہنم کی طرف جانا پسند کیا اور ایسے کام کیے جو انھیں جہنم میں پہنچا دیں لیکن جب وہاں پہنچ جائیں گے تو اس میں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ وہ اس کے لیے تیار ہوں گے۔ اگر ایک بار انھیں دُنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تو ایمان لے آئیں گے اور نیک کام کریں گے۔ گویا وہ سارے معاملہ کو دنیا کے امتحانات پر قیاس کریں گے کہ اگر ایک بار امتحان میں رہ گئے تو دوبارہ امتحان دے کر کامیابی حاصل کریں گے اس وقت انھیں یہ خیال نہ رہے گا کہ یہ معاملہ دُنیا کے امتحانات کی مانند نہیں ہے۔ دنیا سے جو ایک دفعہ نکل گیا اسے دوبارہ وہاں جانے کا موقع نہیں ملے گا۔ اور جو ایک بار آگ میں ڈال دیا گیا پھر اس میں سے نہیں نکل سکے گا۔ اب تو ان پر اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاداتِ برحق پورے ہو کر رہیں گے: وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ الاعراف (۵۳) "ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ اب کیا یہ لوگ اس بات کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ انجام سامنے آجائے جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے؟ جس روز وہ انجام سامنے آگیا تو وہی لوگ جنھوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا، کہیں گے کہ واقعی ہمارے ربّ کے رسول حق لے کر آئے تھے پھر کیا اب ہمیں کچھ

سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں۔" (۲) وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ الشوریٰ "تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟" (۳) وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں اُن اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے۔" تو انھیں مسکت جواب دیا جائے گا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝ فاطر۔ "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو لے سکتا تھا اور تمھارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آچکا تھا۔ اب مزا چکھو۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے۔"

اس کے بعد یہ لوگ جہنم کے محافظوں سے فریاد کریں گے۔ جس طرح قیدی قید خانے کے پہرہ دار سے التجا کر کے مدد کا طالب ہوتا ہے۔ اس خیال سے کہ شاید یہ کوئی فائدہ پہنچا سکے یا کم از کم تکلیف میں کچھ کمی کرا سکے۔ یہ لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ المؤمن "اپنے رب سے دُعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے۔ وہ پوچھیں گے۔ کیا تمھارے پاس تمھارے رسول بیّنات لے کر نہیں آتے رہے تھے۔ وہ کہیں گے "ہاں"۔ جہنم کے اہل کار بولیں گے پھر تو تم ہی دُعا کرو، اور کافروں کی دُعا اکارت ہی جانے والی ہے۔"

پھر جب ان سے بھی مایوس ہو جائیں گے تو "مالک" (داروغۂ جہنم) سے رجوع کریں گے: وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ط "اور پکاریں گے اے "مالک" تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے تو اچھا ہے"۔ تو مالک انھیں منھ توڑ جواب دے گا: اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ؁ الزخرف "تم یونہی پڑے رہو گے"۔ پھر وہ سوچیں گے کہ کسی طرح مال بطور فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لیں جیسے دنیا میں کیا کرتے تھے لیکن افسوس! اب ایسا نہیں ہو سکتا: وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ؁ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ؁ الزمر۔ "اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو اور اتنی ہی اور بھی، تو یہ روزِ قیامت کے بُرے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انھوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے بُرے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔ مگر یہ تمام کوششیں اب انھیں ذرا بھی فائدہ نہ پہنچا سکیں گی۔ اور وہ جہنم میں ہی پڑے رہیں گے: وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ؁ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا: "اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے"۔ اور ان سے کہا جائے گا: وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ؁ الحج "کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزا"۔

اہلِ جہنم کی گفتگو اور اختلاف باہم

اہلِ جنت تو بھائیوں کی طرح ایک دُوسرے کے سامنے مسندوں پر بیٹھے ہوں گے۔ اللہ نے ان کے دل ہر قسم کی کدورت اور رنج وغم سے پاک کر دیے ہوں گے اور ایک دُوسرے سے پاکیزہ باتیں کریں گے اور سُنیں گے۔ ان کی باہم گفتگو میں کوئی لغو، جھوٹی اور گناہ کی بات شامل نہ ہوگی۔ اس کے برعکس جہنم والے ہر وقت ایک دُوسرے سے لڑنے جھگڑنے میں مصروف رہیں گے: كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾ الاعراف۔

ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہُوا داخل ہوگا۔ حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد میں آنے والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب! یہ لوگ تھے جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا۔ لہٰذا انھیں دُہرا عذاب دے۔ جواب میں ارشاد ہوگا ہر ایک کے لیے دُہرا ہی عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔ اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ (اگر ہم قابلِ الزام تھے) تو تمھی کو ہم پر کون سی فضیلت حاصل تھی۔ اب اپنی کمائی کے نتیجہ میں عذاب کا مزا چکھو۔" اسی کیفیت کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

هَٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۖ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۚ إِنَّهُمْ صَالُو النَّارِ ﴿٥٩﴾ قَالُوا بَلْ أَنتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۖ أَنتُمْ قَدَّمْتُمُوهُ لَنَا ۖ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٦٠﴾ قَالُوا رَبَّنَا مَن قَدَّمَ لَنَا هَٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾ وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَىٰ رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُم مِّنَ الْأَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ أَتَّخَذْنَاهُمْ سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْأَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ إِنَّ ذَٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾ ص "(وہ جہنم

کی طرف اپنے پیرووں کو آتے دیکھ کر آپس میں کہیں گے "یہ ایک لشکر تمھارے پاس گھسا چلا آرہا ہے۔ کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے۔ یہ آگ میں جھلسنے والے ہیں۔ وہ ان کو جواب دیں گے۔ نہیں بلکہ تم ہی جھلسے جارہے ہو۔ کوئی خیر مقدم تمھارے لیے نہیں۔ تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو۔ کیسی بری ہے یہ جائے قرار، پھر وہ کہیں گے۔ اے ہمارے رب جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا، اس کو دوزخ کا دہرا عذاب دے اور وہ آپس میں کہیں گے کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جنھیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے۔ ہم نے یونہی ان کا مذاق بنا لیا تھا، یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟ بے شک یہ سچی بات ہے اہلِ دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں"۔ ایک اور جگہ مذکور ہے: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝۲۹ حٰم سجدہ۔ "وہاں یہ کافر کہیں گے اے ہمارے رب ذرا ہمیں دکھا دے اُن جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ ہم انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں"۔

اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ کی باہم گفتگو

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اہلِ جنّت جہنم والوں کے حالات جاننے پر قادر ہوں گے۔ نیز قرآن مجید میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو آوازیں دیں گے اور باہم باتیں کریں گے: وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۴ الاعراف۔ "پھر یہ جنّت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے، ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پا لیا جو ہمارے ربّ نے ہم سے کیے تھے۔ کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمھارے ربّ نے کیے

تھے؟ وہ جواب دیں گے "ہاں"۔ تب ایک پکارنے والا اُن کے درمیان پکارے گا کہ خدا کی لعنت ہو ظالموں پر"۔ وَنَادٰۤی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۚ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ - الاعراف (۵۱)" اور دوزخ کے لوگ جنّت والوں کو پکاریں گے کہ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو، یا جو رزق اللہ نے تمھیں دیا ہے اسی میں سے کچھ پھینک دو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں اُن منکرینِ حق پر حرام کر دی ہیں جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا تھا اور جنھیں دُنیا کی زندگی نے فریب میں مُبتلا کر رکھا تھا"۔

اعراف

اس سلسلے میں قرآن مجید سے جو بات سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ اعراف جنّت اور دوزخ کے درمیان ایک مقام ہے جہاں ان لوگوں کو ایک مدت تک رکھا جائے گا جو اپنی نیکیوں کی کمی کی وجہ سے جنت میں داخل ہونے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔ اور ان کے گناہ بھی اتنے زیادہ نہ ہوں گے کہ وہ جہنم میں جائیں۔ اس مقام سے یہ لوگ ایک طرف جنّت کو دیکھ کر اس میں جانے کی آرزو کریں گے اور دُوسری طرف جہنم کو دیکھ کر اس سے پناہ مانگیں گے اور یہ لوگ اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ سے گفتگو بھی کریں گے۔ نیز اہلِ جنّت اور دوزخیوں کے مابین ایک حجاب حائل ہو گا: وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ الاعراف۔ "جن کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔ یہ جنت میں داخل تو نہ ہوں گے مگر اس کے اُمیدوار ہیں۔ یہ

ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے۔ جنّت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے، اے رب! ہمیں ان ظالم لوگوں میں نہ شامل کیجیو۔"

یہ اہلِ اعراف جہنم میں کچھ ایسے لوگوں کو دیکھیں گے جنھیں یہ دُنیا میں جانتے تھے یہاں دنیا میں یہ لوگ بڑے زور دار تھے اور اپنے جتھوں، پیروکاروں اور عوام کی وجہ سے جو اُن کا ساتھ دیتے تھے۔ بڑے مغرور اور سرکش ہو گئے تھے۔ اہلِ اعراف انھیں آواز دے کر کہیں گے: مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۴۸ الاعراف۔ دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمھارے جتھے تمھارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے"۔

کافروں کو آج معلوم ہو گا کہ انھیں دُنیا کی کسی چیز نے آج کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور نہ ان کے ساتھیوں نے ان کے عذاب میں کوئی کمی کروائی۔ یہ لوگ سب کچھ دُنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ آتے ہیں اور سب ان سے مُنہ موڑ گئے ہیں۔ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی دوست، کوئی ساتھی، کوئی شریک یا پیارا، کوئی لشکر یا مددگار، کوئی بھی قبر میں نہیں اترتا، سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور پیٹھ پھیر جاتے ہیں۔ قبر میں انسان اکیلا اُترتا ہے اور تنہا ہی اٹھے گا۔ حساب کے وقت بھی اس کے ساتھ کوئی نہ ہو گا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جو روزانہ ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو دیکھنے کیلیے ہماری آنکھوں میں بینائی اور اس صداقت کو سمجھنے کے لیے ہماری عقل میں دانائی باقی نہیں رہی۔

اے ربِ کریم! ہماری آنکھیں کھول دے تاکہ ہم ان حقیقتوں کو دیکھ سکیں جو تیرے وجود کی دلیل ہیں اور ہمیں روشنی عطا فرما کہ ہم وہ راستہ پہچان سکیں جو تجھ تک پہنچاتا ہے

اور ہر ظاہری اور باطنی فتنے سے ہمیں محفوظ رکھ۔ اپنی رضا اور جنّت کا مستحق بنا اور اپنے غضب اور جہنم کی آگ سے بچا اے غفور و رحیم!

ایمان بالقدر

○
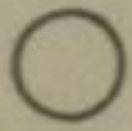
عقیدۂ تقدیر بلکہ تمام عقاید کے سلسلے میں
سلامتی کا راستہ یہ ہے
کہ ہم اصلی اور بنیادی ماخذ کی طرف رجوع کریں
اور وہ قرآن حکیم ہے۔
اور سلفِ صالحین یعنی صحابہ کرام
اور تابعینِ عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا
اتباع کریں۔

○
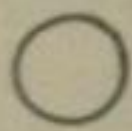
تقدیر پر ایمان

قضا اور قدر کے معنی

قرآن حکیم کی جن آیات میں تقدیر کا ذکر آیا ہے مثلاً: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱ الحجر﴾ "کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں"۔ یا یہ آیۂ کریمہ: اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹ القمر﴾ "ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے"۔ یا جس طرح زمین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ: بٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَآ اَقْوَاتَهَا ﴿حٰمٓ سجدہ ۱۰﴾ "اس کے اندر برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا"۔ یا جس طرح چاند کے متعلق فرمایا گیا ہے: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ۔ یٰسٓ (۳۹) "اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں"۔ یا یہ ارشاد کہ: وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ﴿۲ الفرقان﴾ "ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی"۔ یا یہ فرمان: وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴿۸ الرعد﴾ "ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے"۔

ان پر غور کرنے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ "قدر" (تقدیر) اس کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ طریقے، قاعدے اور نظام تدبیر ہے جس کی بنیاد پر اس کائنات کا سارا انتظام چل رہا ہے، نیز وہ قوانین طبعیہ ہیں جو یہاں جاری و ساری ہیں گویا یہاں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے ایک مقرر اور معین اندازے کے مطابق پیدا کیا گیا ہے اور ہر چیز کا ایک خاص تناسب ہے۔ بنا بریں جو چیز بھی یہاں موجود ہے اس کے

وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کی مقدار اس کے ذرات (ایٹمز) کی تعداد اور وہ عناصر جن سے وہ مرکب ہے ان کی نوعیت اور کمیت طے کر دی گئی تھی۔ نیز یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ کسی عنصر کے دوسرے عنصر سے ملنے کی صورت میں کیا چیز وجود میں آئے گی۔ اور علیحدہ ہونے کی صورت میں کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ نیز اس پر طاری ہونے والی حرکت و سکون کی کیفیتوں کا انداز بھی ازل ہی سے متعین اور مقرر کر دیا گیا تھا۔

میں یہاں قضا و قدر کا فرق ایک مثال کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں "وللہ المثل الاعلیٰ"۔ موجودہ دور میں جو عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں ان پر ایک تحریر آویزاں کر دی جاتی ہے کہ اس کا نقشہ اور اسکیم فلاں انجینئر کی تیار کردہ ہے، اور تعمیراتی کام کا اہتمام اور تیاری کی نگرانی فلاں ٹھیکیدار نے کی ہے۔ گویا انجینئر نقشہ تیار کرتا ہے، تعمیر کی بلندی متعین کرتا ہے، دیواروں کا حجم اور اس میں جتنا لوہا اور سیمنٹ یا اینٹ وغیرہ استعمال ہوگا نیز ان کا باہمی تناسب مقرر کرتا ہے، اس میں جتنی کھڑکیاں اور دروازے، روشن دان ہونے چاہئیں ان کی تحدید و تعیین کرتا ہے یہ تو گویا تقدیر ہے اور ٹھیکیدار، انجینئر کی مقرر کردہ مقداروں اور معین کردہ اعداد و شمار کو عملی شکل دیتا ہے۔ یہ قضا کی مثال ہے۔ کائنات کے معاملہ میں یہ دونوں امور یعنی قضا اور قدر محض جناب باری تعالیٰ کے اختیار اور قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اب جس طرح ایک انجینئر کو اختیار ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تعمیر کی بعض تفصیلات میں بعض جزوی ترامیم کر سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ شاملہ سے دعا[1] اور صدقہ وغیرہ

---

[1] اگر انسان کے تمام افعال و اعمال ازل سے طے شدہ اور لکھے ہوئے ہیں جن میں نہ نظر ثانی کی گنجائش ہے نہ تبدیلی کی۔ تو نہ تو انبیاء علیہم السلام کے آنے کا کوئی فائدہ ہے اور نہ کافروں سے جنگ و جہاد کا کوئی نتیجہ۔ اور نہ دعا کچھ کر سکتی ہے۔ جب کہ انبیاء علیہم السلام اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور صلحائے امت نے شر کو دور کرنے اور خیر کے حصول کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اس مسئلے پر میں نے حجاز کی ایک سرآوردہ شخصیت شیخ جلیل جناب محمد نصیف کے پاس امام شوکانی کا تصنیف کیا ہوا ایک قلمی نسخہ دیکھا تھا جو اس موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ میرے خیال میں اس سے عمدہ کتاب اس مسئلہ پر اور کوئی نہ ہوگی۔ (مصنف)

کو بعض مقدارات میں رد و بدل کا ذریعہ بنا دیا ہے لیکن مقدر کرنے کا اختیارِ کامل بھی صرف اسی کو ہے اور صدقہ و دعا کے ذریعہ اس میں تغیّر و تبدل کی قدرت بھی محض اسی کی مشیّتِ مطلقہ کو حاصل ہے۔

ثواب اور عذاب

یہ جو اُوپر بیان ہوا تقدیر کے وہ معنیٰ ہیں جو عام طور پر مُراد لیے جاتے ہیں اور ان معانی کا اطلاق تمام موجودات پر ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے موجودات میں سے ہر چیز کی مقداریں اور ان سے متعلق تمام حالات و ظروف کو پہلے سے مقدّر فرما دیا ہے اور اسے یہ معلوم ہے کہ ان سب کو کیا حالات پیش آئیں گے اور وہ کیا کچھ کریں گے چونکہ اللہ تعالےٰ کی انہی مخلوقات میں سے جو اس نے پیدا فرمائی ہیں، ایک مخلوق انسان بھی ہے اور اسی حضرتِ انسان کی وجہ سے یہ مسئلہ تقدیر کچھ الجھ سا جاتا ہے — دراصل وہ مسئلہ جس پر سارا جھگڑا پیدا ہوتا ہے، انسان کے ثواب و عذاب کا مسئلہ ہے۔ اسی پر طرح طرح کی بحثوں اور مناظروں کے دروازے کھُل گئے تھے اور لوگوں نے بال کی کھال اُتارنے کی کوشش کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب ہر وقوع میں آنے والا واقعہ پہلے سے لکھا ہُوا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کی سُنّت بدل نہیں سکتی تو پھر ثواب و عذاب کے کیا معنیٰ؟

اجمالی جواب

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے بنیادی بات جسے پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ انسان کی موجودہ مادی وضعِ مخصوص یعنی جیسا کہ وہ ہے، اس کی قدرت و اختیار اور اس کی حیثیت و وسعت میں اور اللہ تعالیٰ کے افعال و اعمال اور اسکی صفات، "قدرت"، "علم"، "عدل" وغیرہ میں فرق ہے اور اس فرق و امتیاز کو بہر حال ملحوظ رکھنا

ضروری ہے۔ انسانی ممکنات کی حدود ہمیں معلوم ہیں جب کہ جناب باری تعالیٰ کے صفات و اعمال امورِ غیبیہ میں سے ہیں۔ انسانی عقل نہ تو ان کو سمجھ سکتی ہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتی ہے ان کے متعلق ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہے جو بذریعہ وحی بتا دیا گیا ہے۔

انسان کا جبر و اختیار

میں پہلے انسانی حدودِ ممکنات یعنی جو کچھ وہ ہے، جو کچھ وہ کر سکتا ہے یا جیسا کہ ہمیں نظر آتا ہے، کی بات کروں گا اس کے بعد اس موضوع پر نصوص یعنی قرآن و حدیث کے دلائل پیش کروں گا۔ انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان آزاد اور خود مختار ہے۔ انسان کے پاس عقل ہے جس کی مدد سے وہ مادی معاملات کے بارے میں فیصلے کرتا ہے۔ خیر و شر اور صحیح و غلط میں امتیاز کرتا ہے۔ پھر اسے قوتِ ارادی دی گئی ہے جس کی بنا پر اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ خیر یا شر میں سے جس پر چاہے عمل کرے۔ ہر صاحبِ عقل انسان یہ ادراک رکھتا ہے کہ نماز نیک کام ہے اور زنا بدکاری ہے اور انسان میں یہ بھی قدرت ہے کہ اپنے گھر سے نکل کر چاہے تو دائیں جانب یعنی مسجد کی طرف چلا جائے اور نماز ادا کرے یا بائیں سمت بدکاری کے اڈے کی طرف چلا جائے اور زنا کا ارتکاب کرے۔ کیا یہ واقعہ نہیں؟ اس میں کوئی شک کر سکتا ہے؟ اسی طرح اگر میرے ہاتھ صحیح و سالم ہوں تو میں انہیں اُٹھا سکتا ہوں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اب ان صحیح و سالم ہاتھوں کو اُٹھا کر میں کسی فقیر کو خیرات کے طور پر روپے بھی دے سکتا ہوں اور انہی ہاتھوں سے کسی بے گناہ کو ڈنڈا بھی مار سکتا ہوں۔ کیا یہ بھی ایک واقعہ نہیں؟

فقیر کو خیرات دینا ایک نیکی ہے جس کی وجہ سے انسان ثواب کا مستحق ہوگا اور دُوسرا عمل یعنی بے گناہ کو مارنا ایک بُرا کام ہے جو باعثِ سزا و عذاب ہے۔

اسی طرح ایک طالب علم اگر چاہے تو اپنی راتیں کھیل و تفریح میں گزار دے اور چاہے تو کتابوں کا مطالعہ اور امتحان کی تیاری کرے۔ اگر یہ بات درست ہے تو کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ کھیل کود میں وقت ضائع کرنے والے طالب علم کا فیل ہونا ظلم ہے۔ یا محنت کرنے والے طالب علم کی کامیابی ناانصافی ہے۔ یہ تو ہے انسان کے اختیار کا پہلو

انسان مجبور ہے

اب دوسرا پہلو۔ میں اپنے ہاتھ کو اس لیے حرکت میں لا سکتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے اس کے عضلات ایسے بنائے ہیں کہ وہ میرے ارادے کے تابع ہیں۔ جس طرف چاہوں حرکت دے سکتا ہوں۔ لیکن کیا انسان اپنے دل و دماغ یا معدے کے عضلات پر بھی اپنا حکم چلا سکتا ہے۔ ایک طالب علم ذہین ہوتا ہے سبق کو ایک بار پڑھتا ہے اور وہ اسے حفظ ہو جاتا ہے اس کے بعد وہ کھیل اور تفریح میں مصروف رہتا ہے اور دوسرا غبی ہوتا ہے دن رات پڑھتا ہے لیکن نہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا ہے اور نہ یاد رہتا ہے یا ایک طالب علم کا گھر تو شکستہ ہے لیکن اس کا باپ عالم ہے اور اسے پڑھنے میں ہر طرح مدد دیتا ہے اور دوسرا ایک عالی شان محل میں رہتا ہے لیکن اس کا باپ جاہل اور تند مزاج ہے جو اسے پڑھنے میں مدد نہیں دے سکتا۔ ان صورتوں میں نہ تو غبی طالب علم خود کو ذہین بنا سکتا ہے اور نہ دوسرا طالب علم اپنے باپ کو بدل سکتا ہے نہ کوئی شخص اپنے پیدا ہونے کے لیے زمانے کا انتخاب کر سکتا ہے اور نہ اپنے دورِ طفولیت کے لیے بہتر ماحول کا خود انتظام کر سکتا ہے۔ یہ تمام ایسے امور ہیں جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ بعینہ اسی طرح جیسے کوئی شخص اس پر قادر نہیں کہ اپنی ناک خوبصورت بنا لے یا اپنا قد لمبا کر لے لیکن کیا ان باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے؟ نہیں! یہ بات نہیں ہے انسان مجبور محض بھی نہیں ہے بلکہ :

انسان ان تمام معاملات میں جو بشری طاقت کی حدود کے اندر ہیں آزاد اور خود مختار ہے۔

اور انسان اگر بعض حالات یا اُمور میں مجبور ہے تو اس سے اس کی صفتِ اختیار کی نفی نہیں ہوتی جس طرح کار اور پتھر کے درمیان یہ فرق ہے کہ کار کے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ چل نہیں سکتی مگر اس کا چلنا انجن کی قوت اور طاقتِ برداشت کے مطابق ہوگا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سیڑھیوں پر چڑھ جائے، یا دیوار پھاڑ دے۔ وہ صرف سڑک پر چل سکتی ہے۔ اب اگر اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ آجائے جس سے وہ آگے چل نہ سکے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں چلنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور یہ پتھر ہے۔ کار کار ہی رہے گی۔ نہ چلنے کے وجوہ عارضی اور خارجی ہیں۔ اسی طرح انسان کو زندگی میں ایسے کئی عوارض لاحق ہو جاتے ہیں جو اُس کی قوتِ ارادہ کو معطل کر دیتے ہیں۔ یا ایسی رکاوٹیں پیش آجاتی ہیں جو اس کی سمت موڑ دیتی ہیں یا ایسے موانع اثر انداز ہوتے ہیں جن کو دُور کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ آزاد اور خود مختار نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ انسان ہے اور اپنی حدودِ بشری کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنے اختیار کو استعمال کر سکتا ہے خدا نہیں ہے کہ جو چاہے کر سکے۔

ثواب یا عذاب اختیار کے ساتھ وابستہ ہے

اگر انسان سے واقعی اس کا اختیار چھن جائے تو وہ مستحق سزا و عذاب نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جو شخص کسی جرم پر مجبور کر دیا جائے اسے سزا نہیں دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سے صرف انہی باتوں پر مؤاخذہ فرمائیں گے جن کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہمیں حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اگر نیکی کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا

ہے اور اگر بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو سزا کا سزاوار ہوتا ہے۔ اللہ کسی جان کو اس کی طاقتِ برداشت اور وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اور اسی طرح کسی کی ذرہ برابر نیکی ضائع نہیں فرماتا جب انسانوں کی عدالتیں بھی اپنی محدود صلاحیتِ عدل کے باوجود کسی ملزم کے حالات، جرم کے اسباب و وجوہ اور اس کے ماحول و استعداد کو ہر لحاظ سے جانچتی پرکھتی ہیں اور یہ تمام کارروائی ان کے نزدیک عدل کا اقتضاء ہے تو کیا یہ تمام امور ربّ العالمین کی عدالت میں ملحوظ نہ رکھے جائیں گے؟ جبکہ اس کی عدالت میں عدلِ مطلق ہوگا۔ اور کیا وہ ایک ایسے مجرم کو جو بدمعاش والدین کی اولاد ہو اور بدترین ماحول میں آوارہ بھٹکتا رہا ہو اتنی ہی سزا دے گا جتنی اس جرم کرنے والے کو جس نے جانتے بوجھتے ایسی حالت میں ارتکابِ جرم کیا ہو کہ وہ بہترین تربیت یافتہ ہو اور نیک نہاد والدین کی اولاد ہو؟

انصاف کے پیمانے

علماءِ علم کلام نے سب سے بڑی ٹھوکر یہ کھائی ہے کہ انھوں نے جنابِ باری تعالیٰ کے عدل کو انسانی عدل پر قیاس کر لیا ہے اور اس کے عدلِ مطلق کو انسانی پیمانوں سے ناپا ہے۔ مجھے اس حقیقت کا ادراک ایک خاص واقعہ سے ہوا جو خود مجھے پیش آیا۔ میں اسے بطورِ عبرت یہاں پیش کرتا ہوں اگرچہ وہ اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔

میں ۱۹۳۱ء میں شام کے ایک پرائمری سکول میں استاد تھا۔ میں اس وقت نوجوان تھا اور میرا دماغ ان دنوں طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اپنے اوپر بڑا گھمنڈ تھا اور زبان بھی خوب چلتی تھی۔ ان دنوں مسئلہ تقدیر کے بارے میں مجھے کچھ ایسے شکوک پیدا ہو گئے جن کے متعلق میں اکثر علماء سے بحثیں کرتا رہتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی مجھے تسلی بخش جواب نہ دے سکتا تھا اور میں اپنے گھمنڈ میں ان سے مناظرے کرتا اور انھیں زچ کرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن میں سکول میں ایک طالب علم کو پڑھاتے ہوئے بیدزنی

کر رہا تھا (اس زمانے میں مارنا تعلیم و تادیب کے ذرائع میں شامل تھا)، کہ بچّہ ایک دم پھٹ پڑا اور گستاخ ہو گیا۔ اور اس نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کر دیا کہ آپ ظالم ہیں اور یہ مجھ پر ظلم ہو رہا ہے۔ آپ یقین کیجیے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر چھڑی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ مدرسہ اور طالب علم سب نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا ہوں اور میری تاریکی چھٹ گئی ہے۔ مجھے یک لخت خیال آیا کہ یہ بچہ میرے مارنے کو اپنے اُوپر ظلم خیال کرتا ہے۔ اور میں اسے عدل و انصاف خیال کرتا ہوں۔ عمل ایک ہی ہے جس کے بارے میں دو متضاد آراء ہیں۔ یہ بچہ جب اپنے گھر والوں سے شکایت کرے گا تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ ظلم نہیں بلکہ عدل ہے وہ تمھارے فائدے کے لیے مارتا ہے۔ جب ایک بچے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے خیال کے غلط پیمانے کو استاد کے عدل پر منطبق کر سکے تو مجھے یہ حق کس طرح پہنچتا ہے کہ میں انسانی عدل کے پیمانے کو اللہ تعالیٰ کے عدل پر منطبق کروں۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ جس چیز کو میں ظلم سمجھ رہا ہوں وہ درحقیقت عینِ عدل ہو۔ ایک بیمار بچّہ انجکشن کی سوئی کو جو ڈاکٹر اس کے جسم میں داخل کرتا ہے ظلم سمجھتا ہے حالانکہ یہ عمل اس کے باپ کے نقطہ نگاہ سے عدل ہے۔ دراصل اندازِ نظر کا فرق ہے بچّہ اس درد کو دیکھتا ہے جو اسے ٹیکے کی وجہ سے ہوتا ہے اور باپ کی نظر اس فائدے پر ہے جو اس ٹیکے سے بچے کو پہنچے گا۔

کوئی جج جب تک کسی مقدمے کے تمام پہلو نہ دیکھ لے اور تمام واقعات کی چھان بین نہ کر لے، مقدمے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ہم انسان اکثر کسی معاملے کا صرف ایک پہلو ہی دیکھ سکتے ہیں اور اکثر ناقص معلومات کی بنا پر غلط فیصلے صادر کرتے ہیں۔ اس مثال پر غور کیجیے۔

آپ اور آپ کا ساتھی کسی صحرا میں تھک کر بیٹھ گئے ہوں۔ آپ کے پاس سے ایک بڑی کار گزرتی ہے۔ کار والا آپ کو بلا کر اپنی کار میں سوار کر لیتا ہے۔ اثناء راہ میں آپ کا ساتھی چاقو نکال کر کار کی گدّیاں پھاڑ دیتا ہے۔ کیا آپ اس کی یہ حرکت ظلم نہ خیال کریں گے؟ یقیناً یہ ظلم ہے لیکن اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ کچھ آگے راستے میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ بیٹھا ہے وہ جب ایک صحیح وسالم کار دیکھیں گے تو چھین لیں گے لیکن اگر کار داغدار ہوگی تو چھوڑ دیں گے۔ کیا یہ معلوم ہونے ہی آپ کا نقطہ نظر نہ بدل جائے گا اور آپ کے خیال میں یہ کام ظلم کی بجائے عدل نہ بن جائے گا بلکہ اگر خود کار کے مالک کو یہ حقیقت معلوم ہوگی تو وہ خود کار کے گدوں کو پھاڑ دے گا۔ اس لیے کہ وہ اس بات کو ترجیح دے گا کہ کار کی نشستیں پھٹ جائیں اور کار بچ رہے بہ نسبت اس کے کہ کار صحیح وسالم رہے، اور اسے ڈاکو لے جائیں۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے؟ دراصل یہی حضرت خضر کا وہ واقعہ ہے کہ جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے ساتھ کشتی میں بیٹھے تھے اور حضرت خضر نے کشتیاں داغدار کر دی تھیں۔ اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بطور مثال بیان فرمایا ہے تاکہ ہم یہ بات سمجھ سکیں کہ کسی معاملے کے تمام پہلوؤں اور واقعات کو پوری طرح دیکھے بغیر جلد بازی سے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

قرآن حکیم اور حدیث سے ثبوت

دلائل منقولہ پر گفتگو سے پہلے مندرجہ ذیل قواعد کی یاد دہانی ضروری ہے۔

۱۔ عقل کا دائرہ کار صرف نصوص قرآن وحدیث کو سمجھنے تک محدود ہے۔ عقل میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ بطور خود "تقدیر" کی حقیقت کا ادراک کر سکے۔ اس لیے کہ (جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں) عقل ان مسائل پر غور وخوض نہیں کر سکتی جو مادی دنیا سے ماورٰی ہیں۔ بنابریں ایسی بحثوں سے بچنا چاہیے جن کی وضاحت قرآن وحدیث نے نہیں کی۔

۲۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اصل الاصول قرآن مجید ہے چنانچہ اگر کسی

معاملے میں قرآن مجید کی نص اور کسی حدیثِ احاد کے متن میں تضاد نظر آئے اور دونوں کے مفہوم میں مطابقت پیدا کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو ہم صرف نصِ قرآنی کے مطابق عمل کریں گے۔[1]

۳۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ قرآن حکیم یا حدیثِ صحیح میں کسی ایسی بات کا واضح طور پر موجود ہونا ممکن ہی نہیں جو مشاہدے میں آنے والے ٹھوس حقائق کے خلاف یا ان سے متضاد ہو۔ اس لیے کہ جس ذاتِ اقدس نے قرآن نازل فرمایا ہے اسی نے یہ حقیقتیں بھی پیدا فرمائی ہیں۔ اور ہمارا خدائے بزرگ و برتر خود ہی اپنی تخلیق کی نفی نہیں فرما سکتا۔

۴۔ قرآن حکیم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن سے یہ مفہوم نکالا جا سکتا ہے کہ انسان مجبور ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ مثلاً یہ ارشاد باری تعالیٰ:۔
هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ط آلِ عمران (۶) "وہی تو ہے جو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔" گویا کوئی پیدا ہونے والا بچہ جسے لڑکی بنا دیا گیا ہو خود کو لڑکا نہیں بنا سکتا۔ نہ سیاہ فام اپنے رنگ کو بدل کر سفید کر سکتا ہے۔ اسی طرح یہ ارشاد باری: وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ط مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ط القصص (۶۸) "تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور (خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے۔ یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔" یا وہ آیات جن میں اس کائنات پر اثر انداز ہونے والے ایسے اسباب کا ذکر ہے جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔

---

[1] محدثین کے نزدیک یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد نہ تو قرآن حکیم کے خلاف ہو سکتا ہے اور نہ واقعتاً مشاہدے میں آنے والے حقائق کے۔ بنابریں اگر آپؐ سے کوئی ایسی حدیث منسوب ہو جو قرآن مجید سے متعارض ہو یا مسلّم الثبوت علمی حقائق کے خلاف ہو۔ تو علماء کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ آپؐ کا ارشاد ہی نہیں ہے۔ خواہ روایت صحیح سند سے مروی ہو۔ (مصنف)

مثلاً یہ آیت: اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝۶۳ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝۶۴ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا - الواقعہ (۶۵)۔ "کبھی تم نے سوچا یہ بیج جو تم بوتے ہو، ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کھیتوں کو بھس بنا کر رکھ دیں۔" یا اسی طرح یہ آیت: اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ط الانعام (۱۷) "اگر اللہ تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمھیں اس نقصان سے بچا سکے۔" یا وہ آیات جو کسی کے نیک یا بد ہونے کے ایسے اسباب کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو انسان کے بس میں نہیں ہیں مثلاً یہ آیت: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ الشمس۔ "اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔" یا وہ آیات جن میں لفظ ہدایت "تلقین اور رہنمائی کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً: وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ البلد۔ "اور کیا ہم نے دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیے"۔ نیز یہ آیت: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳ الدہر۔ "ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔" اس قسم کی آیات کے سلسلے میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، یہ ہے کہ ان آیات میں سے اکثر آیات صرف ان امور کی نشان دہی کرتی ہیں جو انسان کے نیک یا بد ہونے پر کسی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہیں۔ اور یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اللہ ایسے امور پر انسان سے مواخذہ نہیں فرمائے گا جو اس کی قدرت میں نہیں ہیں۔ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے بندے کو کسی بات پر اس طرح مجبور کرے کہ وہ اسے چھوڑنے پر قادر نہ ہو اور پھر اسی پر اسے سزا دے۔

دراصل یہی وہ آیات ہیں جن پر صراط مستقیم سے انحراف کرنے والے فرقوں نے اپنے اپنے مؤقف و مسلک کی بنیادیں اٹھائی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ان آیات کو

درست طور پر سمجھ نہیں پائے۔ اور ان کے مفہوم کو اصل مسئلے پر منطبق کرنے میں بھٹک گئے ہیں :

حالانکہ ان پر لازم تھا کہ

۱۔ ان آیات میں جن میں اللہ تعالےٰ کی "مشیت" و "قدرت" اور اس کا اپنی مخلوقات پر اختیار و اقتدار بیان کیا گیا ہے اور ان آیات میں جو ثواب و عذاب کے بارے میں ہیں فرق و امتیاز کرتے ۔

۲۔ ضروری تھا کہ تمام آیات کو پیشِ نظر رکھتے نہ کہ صرف اپنے مطلب کی بعض آیات کو۔ کیونکہ جو شخص بھی قرآن مجید کا بغور مطالعہ کرے گا اور دونوں طرح کی آیات کو پیشِ نظر رکھے گا اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ قرآن مجید یہ بات ثابت کرتا ہے کہ انسان کو ارادہ اور اختیار دیا گیا ہے اور اسی ارادہ و اختیار کی بنا پر ہی انسان ثواب یا عذاب کا مستحق ہوتا ہے ۔ مثلاً جب ہم پڑھتے ہیں کہ : یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط البقرہ (۲۶) "اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے"۔ تو بظاہر اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ گمراہی اور ہدایت ایک طے شدہ معاملہ ہے ۔ اللہ نے پہلے ہی سے اپنے بندوں میں سے بعض کے لیے گمراہی اور بعض کے لیے ہدایت اس طور پر مقدر فرما دی تھی کہ کچھ کو ہدایت دے دی اور کچھ کو گمراہ کر دیا لیکن جب یہ آیت پڑھیں گے کہ : هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ۲ البقرہ "ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے"۔ یا یہ آیت : وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ ۲۶ البقرہ "اور گمراہی میں وہ اُنھیں کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں"، تو معلوم ہو جائے گا کہ ہدایت یا گمراہی اللہ تعالےٰ کی طرف سے مسلط نہیں کی جاتی بلکہ یہ دونوں امر کسی شخص کے اپنے اعمال و کردار کا نتیجہ ہیں ۔ اگر وہ متقی ہو تو قرآن اسے ہدایت دے گا اور اگر فاسق ہو گا تو گمراہ ہو جائے گا ۔ مگر اس وضاحت کے بعد بھی شبہ باقی رہتا ہے ۔ کوئی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے

کہ مجھے کیا معلوم اللہ تعالیٰ نے مجھے متقیوں میں لکھا تھا یا فاسقوں میں لکھ دیا تھا۔

لیکن جب یہ آیات بھی زیرِ نظر ہوں کہ: لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ البقرہ۔ "(ہدایت ہے) ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" اور: اِلَّا الْفٰسِقِينَ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُونَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْاَرْضِ ۝ ۲۷ البقرہ۔ "گمراہی میں انہی کو مبتلا کرتا ہے۔ جو فاسق ہیں اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔" تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ معاملہ مجبور کرنے کا نہیں ہے بلکہ ہدایت و ضلالت کا اصل تعلق انسان کے ان عملوں سے ہے جو اس کے اپنے اختیار و قدرت اور ارادے کے تابع ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ یہ قدرت بھی رکھتے ہیں کہ غیب پر ایمان لائیں، نماز قائم کریں اور اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ اور یہ طاقت بھی رکھتے ہیں کہ اللہ کے عہد کو توڑ دیں۔ جن رشتوں کے ملانے کا حکم دیا گیا ہے انھیں قطع کریں۔ اور زمین میں فساد برپا کریں۔ ان باتوں کا کرنا بھی آپ کے دائرۂ اختیار میں ہے اور ترک کر دینے کی قدرت بھی آپ کو حاصل ہے۔ اب اگر آپ پہلی تین باتیں کرتے ہیں تو آپ ان کی وجہ سے متقی ہو جائیں گے اور ہدایت پانے کے مستحق ہوں گے اور اگر دوسرے تین اعمال کا ارتکاب کریں گے تو آپ ان کی وجہ سے فاسق اور گمراہی کے مستحق ہوں گے۔

ایک بے نتیجہ بحث

اس موقع پر بعض لوگ یہ بحث چھیڑ دیتے ہیں کہ آیا جب کوئی شخص کسی بُرائی کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ کی مشیّت سے کرتا ہے یا اس کی مشیت کے بغیر؟ کیا اس میں یہ قدرت بھی کہ ایسا نہ کرتا؟ دُوسرے کیا اپنے اعمال کا خالق انسان خود ہے؟ اسی قسم کے اور کئی مُہمل اعتراضات جن پر علمِ کلام کی کتابوں میں بحثوں کے انبار لگے ہُوئے ہیں یہ سب لاحاصل بحثیں ہیں۔ اصل اور بنیادی بات یہ ہے کہ خالق تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اور انسانی عقل باری تعالےٰ کی ذات، صفات یا افعال کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرنے سے قاصر ہے۔ کوئی اس کے حضور کیوں؟ اور کیسے؟ کی گستاخی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ البتہ وہ ہم سے ہمارے اعمال و افعال کا مؤاخذہ فرمائے گا۔

پھر اللہ تعالیٰ عادلِ مُطلق ہے۔ اس کے عدل میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے اس نے ہمیں یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اپنے متعلق سوچیں اور اپنی عقل کا بہتر استعمال کریں۔ نیز عمل اس طرح کریں کہ ہماری قوتِ ارادہ بھلائی کے کام آئے اور ذاتِ باری سے متعلق تمام ایسی بحثیں چھوڑ دیں جو ہمارے سلف صالحین نے نہیں کی تھیں اور ایسے مسائل میں نہ اُلجھیں جن سے انھوں نے خود کو بچایا تھا۔

تقدیر کی حجّت

بعض لوگ اپنے گناہ کے لیے تقدیر کو حُجّت بناتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی زانی سے پُوچھتے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میرے مقدر میں ہی ایسا لکھا تھا ایسے جوابات انتہائی فضول اور لغو ہیں۔ مندرجہ ذیل وجُوہ سے ان کا غلط ہونا واضح ہے۔

۱۔ حساب اور عذاب اعمال کی وجہ سے ہوگا۔ یا پھر ان اسباب و وجوہ کو ملحوظ رکھا جائے گا جو کسی عمل کا باعث بنتے ہیں۔ یہ شخص جو تقدیر کو بہانہ بنا رہا ہے کیا اس نے ارتکابِ

زنا سے پہلے لوحِ محفوظ کی تحریر ——— پڑھ لی تھی اور وہاں لکھا ہُوا دیکھ لیا تھا کہ زنا اس کا مقدر ہے اور اسی تقدیر کو پُورا کرنے کے لیے اس نے اس فعل کا ارتکاب کیا ہے؟ نہیں! ——— یہ بات نہیں ہے بلکہ زنا اس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی، فوری لذت کے حصُول اور شیطان کی دعوت قبول کرنے کے لیے کیا ہے۔ نزول قرآن کے دَور میں بعض مشرکوں نے بھی اسی قسم کی حُجت بازی کی تھی اور کہا تھا: لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا۔ الانعام (۱۴۸) "اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔" اللہ تعالیٰ نے ان کی بات یہ ارشاد فرما کر رد کر دی: قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ط الانعام (۱۴۸) "ان سے کہو کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو" یعنی تمھیں شرک کا ارتکاب کرنے سے پہلے کہاں سے معلوم ہو گیا تھا کہ شرک کرنا تمھاری تقدیر میں لکھا ہُوا ہے۔ یا کیا تم نے ایمان کا تجربہ کر کے دیکھ لیا تھا کہ وہ تمھاری قسمت میں نہیں ہے۔

۲- پھر ایک قابلِ غور پہلُو یہ بھی ہے کہ تقدیر کو حجت بنانے والے لوگ اگر اپنی بات میں سچے ہیں تو انھیں دوسری تمام چیزیں مثلاً فقر، بیماری، بھُوک، دوستوں کی جُدائی اور مال و دولت کا ضائع ہو جانا وغیرہ ہر بات کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر راضی ہو جانا چاہیے۔ لیکن دیکھنے میں آتا ہے کہ ان باتوں کو یہ لوگ تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر راضی بہ رضا نہیں ہوتے، حالانکہ درحقیقت یہ باتیں مقدر ہوتی ہیں مگر ان مواقع پر اس کا سہارا نہیں لیتے بلکہ مال جمع کرنے، بیماری کا علاج کرنے اور بھُوک دُور کرنے کے لیے کام اور کوشش کرتے ہیں اور دوستوں کی جُدائی اور مال کے چلے جانے سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔

آخر کیوں ان لوگوں نے اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو دُنیاوی لذّتوں کے حصُول اور تکالیف دُور کرنے کے لیے وقف کر رکھا ہے اور اپنی عقل سے شہوات نفسانی پر غالب آنے اور نفس کو مرغوب اور حرام کاموں سے باز رہنے

پر مجبور کرنے کا کام نہیں لیتے جبکہ انھیں معلوم ہے کہ اس کے نتیجے میں کتنی سخت سزا ملے گی۔

عقیدہ تقدیر کو سمجھنے کے انداز میں ہمارے اور سلف صالحین کے زاویہ نگاہ کا فرق

دشمنانِ اسلام اس دور میں مسلمانوں پر غیر ذمہ داری اور کاہلی کا جو الزام عاید کرتے ہیں اس کا باعث تقدیر پر ایمان کو قرار دیتے ہیں۔ اس الزام میں کسی حد تک صداقت بھی ہے لیکن اس کا باعث دراصل ہمارے اکثر علماءِ متاخرین[1] کی عقیدہ تقدیر کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ کیونکہ بہت سے جاہل مسلمانوں نے اس عقیدہ کو ارتکابِ گناہ کے لیے حجت اور کاہلی اور گوشہ نشینی کا بہانہ بنا لیا ہے جبکہ ہمارے سلف صالحین نے اسی عقیدے کو کام، کوشش اور جدّوجہد کا وسیلہ بنایا تھا۔

ہم نے کتابوں میں پڑھا کہ رزق قسمت کے مطابق ہوتا ہے یعنی "جو کچھ تمھارے نصیب میں ہے تمھیں مل کر رہے گا خواہ تم کمزور رہو، اور جو دوسرے کا مقدر ہے وہ تم کو نہیں مل سکتا خواہ تم طاقت ور رہو۔" تو کچھ لوگوں نے اس کے معنے یہ لیے کہ اسبابِ دنیوی سے کام نہیں لینا چاہیے اور کوشش کرنا فضول ہے۔ بیکار بیٹھ کر آسمان سے سونے اور چاندی کے برسنے کا انتظار کرنا چاہیے یا سفر کرتے

---

[1] متاخرین نے عقیدہ تقدیر کو جس انداز میں سمجھا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ بدحالی کا ذمہ دار اسلام کو قرار دے۔ اس لیے کہ اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ہمارے دین کی طرف لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (مصنّف)

وقت کوئی تیاری کرنا یا رقم ساتھ لینا ضروری نہیں ہے۔ یہی نظریہ جب متقدمین کے سامنے آیا تھا تو انھوں نے اس کا مفہوم یہ لیا تھا کہ ہم پر لازم ہے اپنی استطاعت کے مطابق کام کریں اور مالِ حلال کے حصول کے لیے اپنی وسعت کے مطابق طاقت صرف کریں پھر جب پوری کوشش کر چکیں تو جو اللہ کی طرف سے مل جائے اس پر شاکر رہیں۔ نہ تو اپنے رب سے شاکی ہوں اور نہ اپنے کسی بھائی کو زیادہ مل جانے پر اس سے حسد کریں نہ امیر بن جانے پر اترا جائیں اور نہ فقر کی وجہ سے رنج والم میں مبتلا ہو جائیں۔

ہم نے سُنا کہ موت کا ایک دن مُقرر ہے تو اس بات کو ہر قسم کا احتیاط اور پرہیز ترک کر دینے کا بہانہ بنا لیا۔ ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو گئے اور قصد و ارادے سے کیے گئے جرم میں اور بر بنائے تقدیر اتفاقاً ہو جانے والے حادثے میں (جو جرم کا نتیجہ نہیں ہوتا) فرق و امتیاز ختم کر کے دونوں کو خلط ملط کر دیا[1] لیکن یہی بات جب ہمارے اجداد نے سُنی تھی انھوں نے اسے اس انداز میں لیا تھا کہ "جب موت یقینی ہے، وقت سے پہلے نہیں آسکتی خواہ انسان دہکتی ہوئی آگ میں کود جائے یا اس کے سینے میں نیزہ گھونپ دیا جائے اور اسی طرح موت اپنے وقت سے ٹل نہیں سکتی خواہ کوئی ایسے قلعے میں جا چھپے جس کی سات دیواریں ہوں" تو ہمیں صرف وہ کام کرنے چاہئیں جن سے اللہ راضی ہو۔ دل و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہیے اور موت سے ڈرنا بے کار ہے اس لیے کہ موت تو آ کر رہے گی۔ اس کا ایک وقت مقرر ہے جس سے نہ پہلے آسکتی ہے اور نہ مؤخر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنی زبان سے بُرائیوں کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے اور سرکش ظالم کے

---

[1] اسی غلط فہمی کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ ڈرائیور تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہے اور اگر حادثہ پیش آ جائے تو کہتا ہے کہ تقدیر یہی تھی۔ یا طالب علم محنت نہیں کرتا اور فیل ہونے پر تقدیر کو بہانہ بناتا ہے۔ (مصنف)

سامنے کلمۂ حق کہنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ اتنے اعلیٰ وارفع ہو گئے کہ حق کے معاملے میں کسی سے نہ ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا انھیں کسی کا خوف نہ تھا۔

ہم نے تقدیر کے مسئلے کو اس انداز میں لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جو قوانین وسنن نافذ فرمائے ہیں ان کا مطالعہ اور ان پر غور وفکر چھوڑ دیا اور قوانین طبیعی جن کو اللہ تعالیٰ نے نفع وضرر کا سبب بنایا ہے ان کی تحقیق واکتشاف سے دست کش ہو گئے۔ حالانکہ ہمارے اسلاف ان علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ یہ لوگ سنن کونیہ اور قوانینِ طبعیہ کا پورا عرفان رکھتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ ہم رفعت کی بلندیوں سے قعرِ مذلت میں گر گئے اور ذلیل وخوار ہو گئے۔ حالانکہ وہ لوگ تقدیر پر ایمان کے باعث پوری دنیا کے سردار، رہبر اور معلم بن گئے تھے اور ہم محکوم ومقہور ہیں، انھوں نے صداقت کی تلوار کے بل بوتے پر موجودہ دُنیا کا ایک تہائی حصہ فتح کر لیا تھا اور ہم! ۔ ہمارے دشمن نے باطل کی تلوار سے ہمارے ممالک کے مراکز فتح کر لیے ہیں۔

خفتہ گانِ خاک کو مقدس سمجھنے کا سبب

جب ہم نے دیکھا کہ گزشتہ کچھ مدت سے ہماری زندگی کا ہر شعبہ فساد کا شکار رہے، اور ہم سب جو ابھی بقیدِ حیات ہیں ذلیل ہو چکے ہیں تو ہمیں اپنے آباؤ اجداد کی شان وشوکت اور ان کے نیک وبرگزیدہ ہونے کا خیال آیا اور ہماری اپنی موجودہ حالت سے مایوسی نے شاندار ماضی کے خوابوں میں پناہ تلاش کر لی اور چونکہ زندہ لوگ ہماری نظر میں چھوٹے ہو گئے اس لیے ہم مرے ہوؤں کو عظیم سمجھنے لگے، اور اسی وجہ سے ان کو مقدس خیال کرنے کے مظاہر کی ابتدا ہوئی، ان پر بھروسہ کیا جانے لگا اور ان کی طرف سے مدد پہنچنے کا انتظار کیا جانے لگا۔ ہم یہ گمان کرنے لگے کہ چونکہ وہ لوگ خوش بخت تھے اور ہم نامراد ہیں

اس لیے وہ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے بڑے بڑے مقبرے بلنے اور ان پر عالی شان قبے تعمیر ہونے لگے اور ہم ان کے لیے ایسے تقدس کا اظہار کرنے لگے جس نے ہمیں دورِ جاہلیت کے قریب پہنچا دیا ہے۔ ان قبروں پر نذریں گزاری جانے لگیں۔ اور انھیں حصولِ مقاصد میں کامیابی کا ایسا وسیلہ سمجھنے لگے جو شرعاً ممنوع ہے بلکہ بسا اوقات ہم ان سے اسبابِ ظاہری اور کسی ٹھوس ذریعہ کے بغیر فائدہ یا نقصان پہنچانے کی دعائیں مانگنے لگے۔ یہ سب باتیں ہمارے موجودہ حالات کی تباہی اور ماضی کے شان و شوکت کا ردِ عمل ہے۔

بے جواز مغالطہ

عقیدۂ تقدیر کے سلسلے میں یہ غلط فہمی دراصل غلط تعبیر و توضیح کی بنا پر پیدا ہوئی ہے یعنی اس وجہ سے کہ بعض فرقوں نے قرآن مجید کی ان آیات کو جو انسان کے اختیاری اعمال و افعال سے متعلق ہیں اور ان آیات کو جو ایسے امور سے متعلق ہیں جن پر انسان کو قدرت و اختیار حاصل نہیں ہے باہم خلط ملط کر دیا ہے۔ دراصل یہ عجیب و غریب الجھن علمِ کلام کے مکاتبِ فکر کے مابین ان کے آپس کے اختلاف کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ مثلاً ایک گروہ کلامیہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان کو زندگی کی راہ پر ڈال دیا گیا ہے جس پر وہ اپنے ارادے اور اختیار کے بغیر چلا جا رہا ہے۔ اس کی مجبوری یہ ہے کہ مثلاً وہ اپنے دل کے عضلات میں کوئی تصرف یا تبدیلی نہیں کر سکتا نہ اپنے والدین کے انتخاب میں اسے کوئی اختیار حاصل ہے نہ اپنی تربیت کے لیے بہتر ماحول کا حصول اس کی قدرت میں ہے۔ لیکن یہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسے عضلات بھی عطا فرمائے ہیں جن پر اپنی مرضی سے حکم چلا سکتا ہے۔ پھر اسے عقل عطا فرمائی ہے جس کی مدد سے حتی الامکان اپنی تربیت کی خامیوں اور ماحول کے غلط اثرات کی اصلاح کر سکتا ہے۔

دُوسرے گروہ نے انسان کو اتنا بڑھا دیا اور اس کے ارادے کو اتنا اختیار دے دیا جو واقع کے خلاف ہے اور نتیجتہً انھوں نے جزا و سزا کے معاملے کو الجھا کر رکھ دیا اور یہ بات بھول گئے کہ اللہ تعالےٰ صرف انسان کے ارادے اور قدرت کی حدُود کے مطابق ہی اس سے محاسبہ فرمائے گا۔ جن معاملات میں انسان مجبور ہے اور جو اس کی قدرت و اختیار سے باہر ہیں ان پر مواخذہ نہیں ہو گا۔ نیز انھوں نے اللہ تعالےٰ کے عدل کے معاملے سے بحث کرتے ہوئے اس میں بھی گڑبڑ کر دی اور یہ بہت واضح حقیقت فراموش کر گئے کہ اللہ تعالیٰ کے عدل کو انسانی عدل کے پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا۔ بات یہ ہے کہ تقدیر کا عقیدہ ہو یا دُوسرے عقاید، سب میں سلامتی کی راہ صرف یہ ہے کہ ہم ان میں بنیادی اور اصل منبع و مرجع یعنی قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کریں اور سلفِ صالحین یعنی صحابہ کرام اور تابعین کبار رضوان اللہ علیہم کا اتباع کریں اور ان بے کار بحثوں کو ترک کر دیں جن کے چھڑنے کا اصلی سبب یونان کے سطحی اور ابتدائی فلسفہ کا ناقص مُطالعہ ہے۔

ایمان بالغیب

یہ ایک حقیقت ہے کہ
اگر انسان کو اس دُنیا میں اس کے حواس اور عقل کے
رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو کچھ حواس محسوس کریں
عقل ان کے متعلق فیصلے کرتی رہے تو ہم
یقیناً ماورائی اُمور سے یک سر بے خبر رہ جاتے۔
چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور ہم پر اس کی رحمت کا
تقاضا یہ ہُوا کہ اس نے عقل کو اُمورِ غیبیہ کے ادراک سے
عاجز ہونے کی حالت میں نہیں رہنے دیا بلکہ اسے اس
کی ضرورت کے مطابق
اُمورِ غیبیہ کا علم بھی اپنی طرف سے عطا فرما دیا ہے۔

عالَمِ غیب

عقاید کے قاعدے بیان کرتے ہُوئے ہم یہ بات بتا چکے ہیں کہ انسان کے حواس موجودات میں سے ہر چیز کا ادراک نہیں کر سکتے، نیز یہ کہ کائنات میں مادی چیزوں کے علاوہ بھی ایسی حقیقتیں موجود ہیں جن کا ادراک ہم اپنے حواس کے ذریعہ سے نہیں کر سکتے ان حقائق میں سب سے زیادہ قریبی حقیقت خود ہماری رُوح ہے۔ ہر شخص اس کی وجہ سے زندہ ہے. کیا کوئی اس کے وجود سے انکار کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کوئی نہیں۔ پھر کیا کسی شخص نے رُوح کی حقیقت کو سمجھا ہے؟ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ عالم جسے ہم جانتے ہیں اور نظر آرہا ہے۔ اس کو قرآن مجید نے "عالم شہادت" کا نام دیا ہے اور جو عالم ہمارے حواس کے دائرہ ادراک سے باہر ہے یعنی ماورائی عالم (میٹافزکس) اس کا نام "عالَمِ غیب" رکھا ہے۔

عالَمِ شہادت پر ایمان لانے اور اس کے موجود ہونے کی تصدیق کرنے کے سلسلے میں سب لوگ برابر ہیں حتےٰ کہ بے زبان جانور بھی اپنی حس کی مدد سے اس عالم کے موجود ہونے کا ادراک رکھتے ہیں گویا اس پر ایمان لانے میں کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک کھُلی حقیقت ہے لیکن غیب پر ایمان لانے کی وجہ سے اُن لوگوں کو برتری حاصل ہے جو خود تو امورِ غیبیہ کو نہیں دیکھ سکتے لیکن خبر صادق پر اعتماد کرتے ہُوئے انھوں نے اس کے موجود ہونے کی تصدیق کی ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جو متقین کو حاصل ہے۔ اور

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کی ابتداء میں متقیوں کا پہلا وصف ایمان بالغیب بیان فرمایا ہے: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔ البقرہ (۲) "جو نادیدہ حقیقتوں پر ایمان لاتے ہیں"

ہم غیب پر کس طرح ایمان لائیں؟

جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسے حواس ہی نہیں عطا فرمائے جن سے امورِ غیبیہ کا ادراک کیا جا سکے تو ہم غیب پر کس طرح ایمان لائیں؟ ظاہر ہے کہ اگر انسان کو اس دُنیا میں اپنے حواس اور عقل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو کچھ حواس محسوس کریں عقل ان کے متعلق فیصلے کرتی رہے تو ہم یقیناً ماورائی اُمور سے بے خبر رہ جاتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور ہم پر اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہُوا کہ اس نے عقل کو امورِ غیبیہ کے ادراک سے عاجز ہونے کی حالت میں نہیں رہنے دیا بلکہ اسے اس کی ضرورت کے مطابق امورِ غیبیہ کا علم بھی اپنی طرف سے عطا فرما دیا۔

یہ علم انسان کے اندر سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ باہر سے آتا ہے۔ یہ نہ تو وجدانِ نفس ہے اور نہ رُوحانی الہام۔ نہ ذہن کی روشنی ہے اور نہ عقل کا استنباط و استدلال گویا یہ علمِ انسانی طاقت کے کسی منبع سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ باہر سے مندرجہ ذیل تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے آتا ہے۔

۱:۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ خواب میں یا غیبی اشارے سے یا تلقین کے کسی اور انداز سے جس میں انسان کے عمل کا دخل نہ ہو اور انسان اپنی کوشش سے اس تک نہ پہنچ سکتا ہو، خود اللہ تعالیٰ انسان کے دل میں یہ علم رکھ دے اور انسان اسے محسوس کرے اور بیان کرے۔

۲:۔ دُوسری صُورت یہ ہے کہ کوئی آواز انسان کو سنائی دے مگر اس کا حقیقی

کہنے والا نظر نہ آئے لیکن اس آواز کو سُن کر اس کا مفہوم سمجھ لے اور محفوظ کرلے۔

۳:- تیسری قسم جو سب سے زیادہ کثیر الورود اور عام ہے یہ ہے کہ اللہ اپنی برگزیدہ مخلوق میں سے کسی اپنے مطیع فرمان بندے کو جو ہمیں نظر نہیں آسکتا اور جسے فرشتہ کہا جاتا ہے کسی انسان کے پاس بھیجے اور اس انسان کو اس مقصد کے لیے منتخب اور مخصوص فرمالے۔ اور یہ فرشتہ اسے اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچاتا رہے اور وہ اللہ کے حکم سے انسانوں کو پہنچائے۔

بس صرف یہ تین طریقے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو ارشاد باری تعالیٰ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ط الشوریٰ (۵۱)
"کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رُو برو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے، یا پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔"

غیب کی وہ باتیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے

وہ امورِ غیبیہ جن کا ماننا ایمان کی شرط ہے اور جن کا منکر کافر اور ملتِ اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے وہ صرف قرآن مجید میں مذکور اُمورِ غیبیہ ہیں۔ اس کے علاوہ جن غیب کی باتوں کا احادیث صحیحہ میں ذکر ہے ان کا منکر نہ تو کافر ہوگا نہ ملت اسلامیہ سے خارج سمجھا جائے گا۔ البتہ فاسق ہوگا۔

قرآن مجید اور حدیث کے درمیان جو فرق اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وحی بصورت قرآن ہمیں پہنچائی یا جو بطور حدیث ارشاد فرمائی دونوں مسلمان کے لیے حجت[1] (دلیل قطعی) ہیں اور حجت

---

[1] خود کو مسلمان کہلانے والے بعض فرقوں کے متبعین یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ موجودہ قرآن مجید جو مسلمانوں
(باقی اگلے صفحہ پر)

ہونے کے لحاظ سے دونوں کا درجہ برابر ہے۔ قرآن کے لفظ اور معنیٰ دونوں اللہ تعالےٰ کی جانب سے وحی کیے گئے ہیں اور حدیث بھی اللہ کی وحی ہے لیکن صرف معنیٰ کے اعتبار سے اس کے الفاظ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ النجم۔ "وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے"۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی آیت یا آپ کی فرمودہ حدیث سُنتے تھے وہ ان دونوں میں واجب العمل ہونے اور حجّت ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔ دراصل فرق جو پیدا ہوا ہے طریقہ روایت سے پیدا ہوا ہے قرآن مجید اس انداز کے معتبر اور قابلِ اعتماد تسلسل کے ساتھ دست بدست ہم تک پہنچا ہے کہ ہم اس بات کا یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ قرآن میں موجود آیات بعینہٖ وہی ہیں جو حضرت جبرائیل علیہ السّلام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر نازل ہُوئے تھے اور وہی الفاظ و آیات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعینہٖ صحابہ کرام کو پہنچا دیے ان میں نہ کوئی کمی بیشی ہُوئی نہ کسی قسم کی تبدیلی۔ اس کے مقابلہ میں احادیث کا بڑا حصّہ (کل کے متعلق ایسا نہیں کہا جاسکتا) ایک فرد سے دُوسرے فرد تک پہنچا ہے اور اگرچہ یہ حقیقت ہے، کہ علماء حدیث نے روایات کی تحقیق اور روایان حدیث کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں انسانی طاقت کی حد تک کوشش کی انتہا کر دی ہے۔ اس کے باوجود ہم قطعیت کے ساتھ یہ بات اتنے وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ جو حدیث

(بقیہ فٹ نوٹ) کے پاس ہے۔ پُورا قرآن نہیں ہے بلکہ قرآن کا کچھ حصّہ ایسا بھی ہے جو موجودہ مصاحف میں شامل نہیں ہے۔ یہ اعتقاد کفر ہے اور ایسا عقیدہ رکھنے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں البتہ اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے خیال میں بعض آیات پہلے قرآن مجید میں موجود تھیں بعد میں ان کی تلاوت منسوخ کر دی گئی ــــ اگرچہ یہ بات بھی کسی متواتر خبر سے ثابت نہیں ہے (مصنف)

امام بخاری، مسلم یا دوسرے محدثین نے روایت کی ہے وہ بعینہ وہی ارشاد ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، اور آپ ہی کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔ جتنے وثوق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم وہی ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہُوا تھا۔

اور چونکہ عقیدہ دین کی بنیاد ہے اور اس میں خلل پیدا ہونے سے انسان کافر و مُرتد ہو جاتا ہے۔ اور کسی مسلمان کو جب تک اس کے قول و عمل کے کُفر نہ ہونے کا ذرا بھی احتمال ہو ہم مُرتد نہیں کہہ سکتے۔ اسی بنا پر ہم نے یہ بات کہی ہے کہ جو شخص کسی ایسے عقیدے کا انکار کرے گا جو صراحتاً قرآن میں مذکور ہو وہ کافر ہو جائے گا اور جو شخص ایسے عقیدے کا انکار کرے گا جو حدیث صحیح میں وارد ہُوا ہو وہ کافر نہیں ہو گا البتہ فاسق ہو گا اور فاسق بھی اس صورت میں کہا جائے گا جب وہ اس کا انکار عناد اور مخالفت کی بنا پر کر رہا ہو۔ اگر انکار کرنے والا علماء حدیث میں سے ہو اور حدیث کے وجوہ و علل سے واقف ہو اور کسی ایسے نقص کی بنا پر اس حدیث کو رد کر رہا ہو جو حدیث کے متن یا اس کی سند میں اسے نظر آتا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا۔ نہ اسے الزام دیا جائے گا۔

امورِ غیبیہ

وہ غیب کی باتیں جن کی خبر شریعت نے دی ہے جن پر ایمان لانا واجب ہے اور جن کے انکار سے کُفر لازم آتا ہے وہ یہ ہیں۔ ملائکہ اور جنّوں کا وجود، اللہ کی نازل کی ہوئی کتابیں، اللہ کے رسول، یوم آخرت اور آخرت کا حساب اور اس کے بعد کا عذاب یا ثواب اور تقدیر کا خیر و شر، —— نیز قرآن مجید میں انسان اور کائنات کی تخلیق کے سلسلے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اور ان کے علاوہ بھی جو اطلاعات قرآن مجید نے دی ہیں ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

مادہ پرست صرف ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جنھیں اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں اور باقی ہر چیز کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے اس مسلک کو ہم قواعدِ عقاید کے بیان میں اس دلیل سے غلط ثابت کر چکے ہیں کہ "اگر کسی چیز کو ہم نہیں جان سکتے تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ موجود ہی نہیں ہے اور محض اس وجہ سے کہ ہم اپنے حواس کے ذریعے سے نہیں جان سکے ہمیں یہ حق نہیں مل جاتا کہ ہم اس کے وجود سے ہی انکار کر دیں"۔ مزید برآں دوسرے قاعدے میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ "سچی خبر سے بھی اسی طرح یقین حاصل ہوتا ہے جس طرح حواس کے ذرائع سے"۔ اور چونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ اللہ کی طرف سے پہنچا آپؐ نے بعینہٖ پوری طرح پہنچا دیا۔ اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ وہی تمام علم و اطلاعات بعینہٖ (بصورتِ قرآن) ہم تک پہنچی ہیں۔ اسی بنا پر ہم مسلمانوں کو ان امورِ غیبیہ پر جو قرآن بتاتا ہے پورا پورا ایمان اور یقین ہے۔

غیب کی قسمیں

امورِ غیبیہ کی کئی قسمیں ہیں اور یہ سب کی سب غیب کہلاتی ہیں۔

۱۔ ایک قسم وہ ہے جس کا ادراک ہم تو نہیں کر سکے لیکن ہمارے علاوہ کچھ اور لوگوں نے ان کو دیکھا اور جانا۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی غیب فرمایا ہے۔ اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم نے اس واقعہ کو نہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور نہ سنا تھا لیکن بنی اسرائیل (اولادِ یعقوب علیہ السلام) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کو اس کا ادراک تھا۔ ان پر گزرا تھا بلکہ ان کی اپنی وارداتِ حیات تھی۔

۲۔ دوسری قسم وہ امور ہیں جن کو اولادِ آدم نے دیکھا تو نہیں لیکن عقلاً ان

کا ادراک ممکن ہے اگر انسانوں کو اس زمانے میں پیدا کر دیا جاتا تو ان امور کو دیکھ سکتے تھے۔ مثلاً وہ حوادث و واقعات جو اس زمین پر ہم سے پہلے پیش آ چکے ہیں یا ان مخلوقات کا ذکر جو انسان سے پہلے زمین پر آباد تھیں۔ یا حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کی پیدائش کے واقعات اور زمین پر حیاتِ انسانی کی ابتدا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں ہم نے واقعتاً بطور خود دیکھا اور جانا نہیں۔ البتہ ان کے متعلق ہمیں بذریعہ وحی اطلاع دی گئی ہے۔

۳۔ تیسری قسم وہ باتیں ہیں جن کو حواس کے ذریعہ محسوس نہیں کیا جا سکتا اور نہ عقل ان کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتی ہے۔ اور نہ ہمارا تصور و خیال ان کی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے جیسے صفاتِ باری تعالیٰ یا مخلوقاتِ غیبیہ مثلاً ملائکہ، جن، شیاطین اور یوم قیامت کے حالات و واقعات یا حساب و کتاب اور ثواب و عذاب کے حالات و کوائف۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

کہا جاتا ہے کہ غیب کی کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص رکھا ہے۔ مثلاً یہ کہ بارش کب ہوگی، یا رحمِ مادر میں کیا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر موسمیات والے یہ پیش گوئی کیسے کر دیتے ہیں کہ کل بارش ہوگی یا مطلع صاف رہے گا؟ اسی طرح سائنسی طریقوں سے یہ کیسے معلوم کر لیا جاتا ہے کہ حاملہ کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ

۱۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور اس کائنات کا اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے یہ بات ناممکن ہے کہ قرآن مجید میں کوئی صریح نص ایسی ہو جو کسی حقیقتاً موجود اور ٹھوس

مشاہدے میں آنے والے واقعہ کے خلاف ہو یا اس کے وجود سے انکار کرے۔ اگر کوئی ایسی نص آپ کو نظر آئے جو بظاہر واقع کے خلاف معلوم ہو تو اس پر مزید غور و خوض کیجیے جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دراصل اس کے وہ معنے نہ تھے جو بظاہر ہم نے سمجھے تھے۔[1]

۲۔ علاوہ ازیں موسمی پیش گوئی کرنے والے، بارش کی اطلاع اس کے آثار دیکھ کر اور بارش ہونے کے انتظامات مکمل ہو جانے کے بعد دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً اگر وہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ شام کے ساحلی علاقے میں بارش ہو گی۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس نے قوانینِ فطرت کے انکشاف سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ اس بارش کا باعث وہ ہوا ہے جو بحیرۂ اطلانتک کی جانب سے آتی ہے اور جبل الطارق کی تنگ وادی میں سے گزرتے ہوئے اس مقام پر رکی ہوئی ہوا کے بلاک سے ٹکراتی ہے اور ٹھہری ہوئی اور تازہ آنے والی ہواؤں کے درجہ حرارت میں اختلاف کی وجہ سے بادل بن جاتے ہیں۔ جب موسمیات والے یہ کیفیت دیکھتے ہیں تو قوانینِ طبعیہ کی معلومات کے حوالے سے جان لیتے ہیں کہ بادل اتنی مدت میں ساحلِ شام تک پہنچ جائیں گے، اور پیش گوئی کر دیتے ہیں۔

گویا ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے گھر کی کھڑکی میں سے پوسٹ مین کو آتے ہوئے دیکھ کر، اندازہ لگاتا ہے کہ وہ کتنی دیر میں اس کے گھر تک پہنچ

---

[1] یہ اس صورت میں ضروری ہے جب نص قرآن مجید کی آیت ہو۔ اس لیے کہ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے واضح اور قطعی طور پر کسی ایسی بات کی نفی لازم آتی ہو جس کے حقیقتاً موجود ہونے کا فیصلہ عقل دیتی ہو۔ لیکن اگر یہ نص حدیثِ احاد ہو یعنی ایک راوی کی دوسرے ایک راوی سے روایت۔ تو اس صورت میں ہم یقین کر لیں گے کہ یہ آپؐ کا فرمان نہیں ہے خواہ اس کے سب راوی ثقہ اور معتبر ہوں اس لیے کہ آپؐ واقع کے خلاف کوئی بات فرما ہی نہیں سکتے۔ (مصنف)

جائے گا اور اپنے گھر والوں سے کہتا ہے کہ پانچ منٹ تک پوسٹ مین آ جائے گا۔ یا کوئی شخص دُور بین سے ایک موٹر آتے ہوئے دیکھتا ہے اور موٹر کے دُوسروں کو نظر آنے سے پہلے اطلاع دے دیتا ہے کہ موٹر آ رہا ہے۔

ان سب صورتوں میں علم غیب حاصل نہیں ہُوا بلکہ انھوں نے ہونے والے واقعے کو دُوسروں سے پہلے دیکھ لیا ہے۔ یہی صورت ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو بچّہ بن جانے کے بعد اس کی صنف کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہیں۔ بادل کا پیدا کرنا یا ایسی زمین پر بارش برسانا جہاں اللہ تعالیٰ نے بارش کا نہ ہونا مقدر فرما رکھا ہے۔ یا ایسی زمین سے بارش کو روک دینا جس پر برسنا اللہ تعالیٰ نے طے فرما دیا ہے۔ یا منی کے ہارمونی جرثومے کو یا ایسے خلیے کو دیکھ کر جو جرثومہ منی اور بیضہ سے مل کر بنا ہو یہ بتا دینا کہ پیدا ہونے والا بچہ نر ہے یا مادہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے اور قرآن مجید میں جو بات فرمائی گئی ہے اس سے یہی مُراد ہے۔ (واللہ اعلم)

ملائکہ، رسول اور آسمانی کتابیں

ملائکہ، رسُولوں اور کتابوں پر ایمان لانا بنیادی عقیدے ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ان پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا۔ ملائکہ اللہ تعالےٰ کے پیغامبر ہیں، جو انبیاء علیہم السلام کے پاس بھیجے جاتے اور انبیاء، انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں کتابیں اللہ تعالیٰ کے فرامین ہیں جو فرشتے رسولوں کے پاس لے کر آتے ہیں اور یہی ارشادات رسولؑ انسانوں کو پہنچاتے ہیں۔

وحی کا امکان اور ضرورت

وحی کے امکان کو عقل تسلیم کرتی ہے۔ اس لیے کہ اگر عقل اللہ تعالےٰ کے موجود ہونے اس کی قدرت اور مشیت پر ایمان لے آئے تو وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتی کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ پیدا کرنے، رسولوں کا انتخاب فرمانے اور احکام نافذ فرمانے پر بھی قادر ہے

علاوہ ازیں وحی کا واقعتاً آنا ثابت ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں ہمیں خبرِ صادق کے ذریعہ اطلاع ملی ہے اور یہ بات ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ "خبرِ صادق علم یعنی یقین کے ذرائع میں سے ایک مستند ذریعہ ہے"۔ ہم خبرِ صادق پر اسی طرح یقین کر لیتے ہیں جس طرح سمع و بصر کی شہادت پر، اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر اطلاع کا یہ ذریعہ (خبرِ صادق) موجود نہ ہوتا تو انسان کی معلومات صرف عالمِ مادی تک محدود رہتیں اور اس کے ماوراء جو کچھ ہے اس سے انسان بے خبر رہ جاتا اور اس صورت میں اس کی حالت چوپایوں اور جانوروں کی سی ہوتی جن کے پیشِ نظر صرف دُنیا ہی دُنیا ہے کھاتے پیتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں یا جسمانی لذتیں حاصل کرتے ہیں۔ نہ تو ان کا اپنے رب سے کوئی رابطہ ہے اور نہ اُخروی زندگی کے لیے کچھ عمل کرتے ہیں۔ اور اگر وحی نہ ہوتی تو انسان اپنے اخلاقِ کریمہ اور شرفِ انسانیت سے عاری ہو جاتا اور "علم الاخلاق" (ETHICS) کے تمام نظریات اور بنیادیں جن پر اس علم کا ڈھانچہ کھڑا ہے ہلا بھی کھو دیتا۔ کیونکہ اخلاق کی عمارت کی بنیاد اگر عقیدے پر استوار نہ ہو تو وہ اس عمارت کی مانند ہے جو ریت کے ٹیلے پہ کھڑی ہو۔ انسانی خمیر میں فطری طور پر اپنی ذات سے محبت، فائدے کا حصول اور نقصان کو دور کرنا شامل ہے بنا بریں انسان کوئی کام اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک اس کام میں اس کے لیے کوئی لذت یا فائدہ نہ ہو[1]۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس صرف ایک روپیہ ہو جو اس نے اپنے شام کے کھانے کے لیے بچا رکھا ہو۔ اور اسے سرِ راہ یتیموں کی مدد کے لیے رکھا ہُوا صندوق نظر آئے۔ کیا اگر یہ شخص اللہ اور آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو گا تو یہ بچا ہُوا روپیہ چپکے سے اس طرح اس میں ڈال دے گا کہ اسے کوئی نہ دیکھ پائے

---

[1] اس سلسلے میں کتاب "MAXIMES" مؤلفہ LAROCHE-FAUCOWLD دیکھی جائے۔
(مصنف)

اور خود بھوکا سو رہے گا۔

لیکن اگر یہ مومن ہوگا تو ضرور ایسا کرے گا۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا اللہ اسے دیکھ رہا ہے جو اس کے بدلے روزِ قیامت سات سو روپے دے گا حقیقت یہ ہے کہ صرف مومن ہی اس بے نیازی سے کام کر سکتا ہے کہ لوگ اسے دیکھیں یا نہ دیکھیں اس کا شکر ادا کریں یا نہ کریں اس کے بدلے میں اسے کوئی فائدہ یا معاوضہ ملے یا نہ ملے وہ نیکی کرے گا۔ اور صرف مومن ہی بُرا کام اس انداز میں ترک کر سکتا ہے کہ تنہا ہو یا لوگوں کے سامنے بُرے کام سے بچا رہے گا۔

اس کے برعکس جو لوگ نیکی ستائش یا فائدہ اٹھانے کے لیے کرتے ہیں وہ نیک کام صرف اُسی وقت کریں گے جب انھیں کوئی دیکھنے والا ہو جو ان کی تعریف کرے یا کچھ عطا کرے۔ اسی طرح جو لوگ بدنامی یا سزا کے خوف کی وجہ سے بُرے کام سے بچتے ہیں وہ اگر تنہا ہوں اور پولیس یا لوگوں کا ڈر نہ ہو تو بُرے کام سے باز نہ رہیں۔

پھر وحی کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اگر رسولوں کو بھیجے بغیر اور شریعت اور دین سکھائے بغیر اللہ تعالیٰ روزِ قیامت انسانوں سے حساب طلب فرماتا تو وہ احتجاج کر سکتے تھے اور یہ کہہ سکتے تھے کہ: رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ ۔طٰہٰ (۱۳۴) "اے ہمارے پروردگار تُو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے"۔ اور دعوے کرتے کہ اگر ہمارے پاس رسول بھیجے جاتے تو ہم ان کے کہنے کے مطابق عمل کرتے اور اگر ہمیں شریعت معلوم ہوتی تو ہم اس کی پیروی کرتے۔ بنابریں تمام انبیاء و رسل اس لیے بھیجے گئے لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۔ النساء (۱۶۵) "تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حُجت نہ رہے"۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو ہدایت دے کر جنت کی راہ پر کیوں نہ ڈال دیا؟ پہلے اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کے نفس میں خواہشاتِ نفسانی پیدا فرمائیں پھر اگر کوئی شخص خواہشِ نفس سے مجبور ہو کر زنا کرتا ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے خود ہی انسان کے خمیر میں مال کی محبت ڈال دی، پھر اگر وہ ناجائز ذرائع سے مال جمع کرتا ہے تو اس سے حساب لیا جائے گا۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟

جواب یہ ہے کہ یہ بات سکول کے ان لڑکوں کی سی ہے جو کہیں کہ ہمیں امتحانی سوالات سال کے شروع میں ہی کیوں نہیں دے دیے جاتے۔ انھیں ہم سے چھپا کر کیوں رکھا جاتا ہے اور ہمیں امتحان کے لیے تیاری کی مصیبت میں ڈالا جاتا ہے؟ ظاہر ہے امتحانی سوالات اس لیے مخفی رکھے جاتے ہیں کہ طلباء خوب محنت کریں اور مقررہ نصاب پوری طرح پڑھیں۔ اگر امتحانی سوال پہلے ہی بتا دیے جائیں تو امتحان کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔

یہ دنیا دار الابتلاء (مصیبت کا گھر) ہے۔ ابتلاء عربی زبان میں امتحان کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ گویا دنیا میں انسان اس لیے بھیجا گیا ہے کہ نیک اور بد لوگوں میں یعنی سیدھے راستے پر چلنے والوں اور گمراہوں میں فرق و امتیاز کیا جا سکے۔ اگر گھڑ دوڑ کے میدان میں رکاوٹیں نہ ہوں تو کمزور سست رفتار سواروں اور تیز و طرار شہ سواروں میں امتیاز نہ ہو سکے۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب انسانوں کو ایک ہی مسلک پر ڈال دیتا یا فرشتوں کی طرح سب کی فطرت خیرِ محض بنا دیتا۔ لیکن اس کی مشیّت انسان کے سلسلے میں یہی تھی (کہ وہ ایسا ہو جیسا کہ ہے) اور باری تعالیٰ شانہٗ کی مشیّت سے نہ تو کوئی اختلاف کر سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ ایسا کیوں کیا؟ ہم سب

اس کے حضور سر افگندہ ہیں وہ ہی ہمارا مالک ہے اور اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ اس کے سوا نہ ہمارا کوئی رب ہے نہ معبود۔ ہمارے انجام کا فیصلہ اس کی مرضی پر منحصر ہے چاہے تو معاف فرما دے اور چاہے تو سزا دے۔ ہم ہر وقت اللہ سے رحمت اور عفو کے طلب گار ہیں اور اس کے عذاب سے اسی کی پناہ چاہتے ہیں اس لیے کہ اس کے معاف فرمائے بغیر ہم میں عذاب سے بچنے کی طاقت نہیں ہے۔ اور معاف فرما سکتا ہے تو صرف وہی، اس کے سوا کوئی اور نہیں۔

ملائکہ

فرشتوں کا وجود قرآن سے ثابت ہے جو شخص کسی ایسی بات سے انکار کرے گا جو ملائکہ کے بارے میں قرآن میں بیان کی گئی ہے وہ کافر ہو جائے گا اور قرآن مجید میں ملائکہ کے بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے درج ذیل ہے۔

۱۔ کہ ملائکہ انسان سے پہلے پیدا کیے گئے تھے اور انھیں اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی تھی کہ: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ ۚ البقرہ (۳۰) "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں انھوں نے عرض کیا، کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا۔"

۲۔ ملائکہ محض اطاعت و عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں: نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ (البقرہ ۳۰) "آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" تو گویا ملائکہ: لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۞ التحریم: "کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انھیں دیا جاتا ہے بجا لاتے ہیں۔" وَیُسَبِّحُوْنَہٗ وَلَہٗ یَسْجُدُوْنَ ۞ ۲۰۶ الاعراف۔ "اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔" یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ

رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۔ المومن (۷) "سب اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں"۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کی تخلیق مکمل کر لی تو آدم علیہ السّلام کو علمِ اسماء عطا فرمایا اور ملائکہ سے بطورِ امتحان ان اسمار کے بارے میں دریافت فرمایا۔ تو وُہ ان کے متعلق کچھ نہ بتا سکے۔ پھر آدم نے انھیں اسمار کی خبر دی جس سے ظاہر ہو گیا کہ آدم کو ملائکہ پر فضیلت حاصل ہے۔ اسی بنا پر ملائکہ کو جناب باری نے حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ یہ سجدہ تعظیم و احترام کا سجدہ تھا، عبادت کے لیے نہ تھا۔

۴۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کبھی کبھی مادی شکل و صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور انسانی حلیہ میں سامنے آتے ہیں۔ مثلاً حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے: فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ مریم۔ "اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی رُوح کو (فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پُورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا"۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے مہمان بھی فرشتے تھے اور انسانی شکل و صورت میں آئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے انھیں کھانے کے لیے بچھڑے کا بُھنا ہُوا گوشت پیش کیا: فَلَمَّا رَآ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ ہُود۔ "مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا۔ انھوں نے کہا کہ ڈرو نہیں ہم تو قوم لُوط کی طرف بھیجے گئے ہیں"۔

۵۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کی قیام گاہ آسمان ہے اور اللہ کے حکم سے آسمان سے زمین پر اُترتے ہیں: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ (۶۴) مریم ۔ "اے محمدؐ، ہم تمھارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اُترا کرتے"۔

۶۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بنیادی تخلیق اور ادائیگیِ فرض کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے فرشتوں کی کئی قسمیں اور کئی درجے ہیں اور انھیں اللہ نے بنایا ہے: رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ فاطر (۱) "ایسے پیغام رساں جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔" نیز دوسری جگہ خود ملائکہ کی زبانی بیان کیا گیا ہے: وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ ۱۶۴ الصّٰفّٰت "کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے۔" ان میں وحی لے کر آنے والے بھی ہیں اور یہ خدمت حضرت جبرائیل سرانجام دیتے ہیں۔ ارشاد ہے: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ: البقرہ (۹۷) "ان سے کہو کہ جو کوئی جبرئیل سے عداوت رکھتا ہے اسے معلوم ہوجانا چاہیے کہ جبرئیل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل فرمایا ہے۔" دوسری جگہ ارشاد ہے: وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ۱۹۲ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ ۱۹۳ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ ۱۹۴ الشعراء "یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں۔"

انھی ملائکہ میں ملک الموت[1] بھی ہیں جن کی ذمہ داری جان داروں کی روح قبض کرنا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ۔ السجدہ (۱۱) "ان سے کہو، موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا۔" انھی ملائکہ میں صور پھونکنے والا فرشتہ ہے اور انھی میں میکائیل شامل ہے اور انھی ملائکہ میں حاملینِ عرش ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِيْنَ

---

[1] پوری کوشش اور تلاش کے باوجود مجھے قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ ملک الموت کا نام عزرائیل ہے۔ (مصنف)

يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ۔ المومن (۷) عرش الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں"۔ اور : وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۵؎ الحاقۃ "اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اُوپر اٹھائے ہُوئے ہوں گے"۔ ان ہی میں وہ ملائکہ ہیں جو اہلِ جنت کو آرام پہنچانے پر مقرر ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ۔ الرعد (۲۴) "ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے تم پر سلامتی ہو۔ تم نے جس طرح دُنیا میں صبر سے کام لیا"۔ فرشتوں میں کچھ وہ ہیں جو دوزخیوں کو سزا دینے پر مقرر ہیں: عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ۔ التحریم (۶) "اس پر نہایت تند خُو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے"۔ کچھ فرشتے انسانوں کے اعمال نامے مرتب و مدوّن کرنے پر مقرر ہیں: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ ق۔ "کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو"۔ دُوسری جگہ ارشاد ہے: وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ الانفطار: "تم پر نگران مُقرر ہیں ایسے معزز کاتب جو تمھارے ہر فعل کو جانتے ہیں"۔ کچھ فرشتے وہ ہیں جو قیامت اور حشر کے دن لوگوں کو حساب کے لیے ہانک کر لے جائیں گے اور ان پر سختی کریں گے: وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ۝ ق۔ "ہر شخص اس حال میں آ گیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا"۔

فرشتوں کے سپرد مزید جو کام ہیں ان میں سے ایک مومنوں کو میدانِ جنگ میں ثابت قدم رکھنا ہے: اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ الانفال (۱۲) "اور وہ وقت جب کہ تمھارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تم اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو"۔ نیز فرشتے مومنوں کے

لیے دعا کرتے ہیں، ان پر رحمت و سلام بھیجتے ہیں اور ان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں: هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ ، الاحزاب (۴۳) "وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمھارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں"۔ دوسری جگہ ہے : وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝ رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدتَّهُمْ وَمَن صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ ۚ وَمَن تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ ، المومن (۹) "اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں جن کا تُو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ پہنچا دے) تو بلاشبہ قادرِ مطلق اور حکیم ہے۔ اور بچا لے ان کو برائیوں سے جس کو تُو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تُو نے بڑا رحم کیا"۔ فرشتے نماز فجر کے وقت مومنوں کے ساتھ بطور گواہ حاضر ہوتے ہیں: إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ بنی اسرائیل "کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے"۔ فرشتے ہی بوقت موت مومنوں کو بشارت دیتے ہیں اور گناہ گاروں کو ملامت کرتے ہیں: إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ ۳۰ حم سجدہ "جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل

ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ. اس جنت کی
بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے"۔ اور گناہ گاروں کے متعلق بیان کیا گیا
ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ ط النساء
(۹۷) "جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض
کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے"۔ اور کافروں کے بارے میں مذکور ہے:
وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ ۵
الانفال "۔ کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جبکہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر
رہے تھے! وہ ان کے چہروں اور ان کے کولھوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے"۔ اور
اس کے بعد انھیں جہنم کی طرف دھکیل کر لے جائیں گے اور انھیں برا بھلا کہیں گے۔
دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہے: وَسِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَھَنَّمَ زُمَرًا ط
حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْھَا فُتِحَتْ اَبْوَابُھَا وَقَالَ لَھُمْ خَزَنَتُھَآ اَلَمْ یَاْتِکُمْ
رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ رَبِّکُمْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ
ھٰذَا ط قَالُوْا بَلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَۃُ الْعَذَابِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ۵ قِیْلَ
ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ج فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَ ۵ الزمر
"وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تھا جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے یہاں تک
کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس
کے کارندے ان سے کہیں گے کیا تمھارے پاس تمھارے اپنے لوگوں میں سے
ایسے رسول نہیں آئے تھے جنھوں نے تم کو تمھارے رب کی آیات پڑھ کر سنائی
ہوں اور تمھیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمھیں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔
وہ جواب دیں گے ہاں آئے تھے مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔ کہا جائے
گا داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، یہاں اب تمھیں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ بڑا ہی برا

ٹھکانا ہے یہ متکبروں کے لیے"۔ اور فرشتے جنتیوں کا استقبال کریں گے تو انھیں خوش آمدید کہیں گے: وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۝ الزمر "اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انھیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم پر، بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے"۔ اور فرشتے نہ تو نکاح کرتے ہیں، نہ نسل پیدا کرتے ہیں اور نہ ان میں نر و مادہ ہوتے ہیں۔

ملائکہ کے بارے میں جو کچھ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے اس میں سے اہم اور خاص خاص باتیں یہ ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں۔ ان کے علاوہ احادیثِ صحیحہ میں بھی فرشتوں کے بارے میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں جو اگرچہ حدیثِ احاد ہیں لیکن ان کی روایت صحیح اور مستند ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو شخص کسی ایسی بات سے انکار کرے گا جو ملائکہ یا دوسری چیزوں کے بارے میں قرآن مجید میں صراحتاً بیان کی گئی ہیں وہ کافر ہو جائے گا۔

ملائکہ پر ایمان لانا اسلامی عقاید کے ارکان میں سے ہے۔ قرآن مجید میں ہے:
آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ - البقرہ (۲۸۵) "رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں"۔

ایمان بالملائکہ کا ثمرہ

فرشتوں پر ایمان لانے سے اللہ تعالےٰ کی عظمت کا شعور بڑھتا ہے اور اللہ کی رحمت کا احساس ہوتا ہے کہ اس نے مومنوں کے لیئے دعا و استغفار کرنے اور مومنوں کو ممکن حد تک گناہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے فرشتوں کو مامور کر رکھا ہے۔ ان ہی کی موجودگی کی وجہ سے انسان کو یہ بات بھی یاد رہتی ہے کہ میرا ہر قول و فعل لکھا جا رہا ہے۔ پھر فرشتے جہاد میں جرأت اور شجاعت کا باعث بنتے ہیں کیونکہ مسلمان کو میدانِ جہاد میں ہر وقت یہ تصور رہتا ہے کہ اللہ کے حکم سے فرشتے مجاہدین کی مدد کر رہے ہیں اور مومن ان کی وجہ سے جنت میں لے جانے والے کام کرتا ہے تاکہ یہ ان لوگوں میں شامل ہو جن کو فرشتے سلام کریں گے اور جہنم میں لے جانے والے افعال سے بچتا ہے تاکہ ان لوگوں میں شامل نہ ہو جائے جن کو فرشتے ڈانٹیں پھٹکاریں گے۔ پھر ان پر ایمان لانے کا ایک ضمنی نتیجہ یہ بھی ہے کہ مومن ان کی اطاعت شعاری کو دیکھ کر خود بھی اطاعت شعار اور گناہوں سے بچنے والا بنے اور انسان کی ملکی صفات میں اضافہ ہو۔

جن

قرآن مجید میں باری تعالیٰ نے یہ بات بتائی ہے کہ جن عام مخلوق سے مختلف مخلوق ہے۔ ہماری آنکھ ان کو اصلی شکل و صورت میں نہیں دیکھ سکتی جس طرح ہم فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتے یا جیسے ہم ماورائے بنفسجی (الٹرا وائیلٹ) یا تحت الحمراء (انفرا ریڈ) شعاعوں کو یا آواز کی لہروں یا بجلی کے کرنٹ کو دیکھنے سے قاصر ہیں حالانکہ یہ تانبے کے تار میں دوڑ رہا ہے۔ اسی طرح جن بھی ایک مخلوق ہے۔ جنوں پر ایمان لانے کا حکم قرآن مجید میں اس طرح خاص طور پر نہیں دیا گیا جس طرح فرشتوں پر ایمان لانے کا حکم ہے تاہم اس سلسلے میں جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا انکار کرنے والا کافر ہو جائے گا۔

جنوں کے بارے میں قرآن کے ارشادات

۱۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ جِنّ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آگ جس سے جنوں کو پیدا کیا گیا ہے ہماری آگ کی مانند ہو اور جو اسے چھوئے جل جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے اس آگ میں جلانے کی خاصیّت موجود ہو اور پھر اللہ تعالٰے نے جنوں کے وجود میں آجانے کے بعد خاصیّت بدل دی ہو۔ اس لیے کہ انسان بھی تو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے لیکن اب وہ مٹی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالٰی نے اسے نئی تخلیق عطا فرمادی ہے اب انسان ایسے مُرکّب کا نام ہے جس میں ہڈّیاں، عضلات، خون اور پٹھے ہیں۔ دراصل اس کائنات میں اللہ تعالٰے کی سُنّت اور دستور یہی ہے کہ مخلوقات کو ایک حالت سے دُوسری حالت میں تبدیل کیا جاتا ہے اللہ تعالٰی خلیہ (سیل) سے مختلف اوصاف ہیئتوں اور طبیعتوں کے جاندار پیدا فرماتا ہے اور ذرہ (ایٹم) سے مختلف وزن، شکل اور خصوصیتوں کی معدنیات بناتا ہے۔ خشک بیج سے سرسبز اور رنگ برنگے شگوفوں والا درخت پیدا فرماتا ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جن انسانوں سے پہلے پیدا کیے گئے ہیں: وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۲۷۔ الحجر "اور اس سے پہلے جنوں کو ہم لُو کی لپیٹ سے پیدا کر چکے تھے"۔

۳۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں اور ہم انھیں نہیں دیکھ سکتے اور یہ کوئی عجب بات نہیں ہے جس شخص کے پاس دُوربین ہو وہ دُور کھڑے ہُوئے شخص کو دیکھ سکتا ہے لیکن جسے دیکھا جا رہا ہو وہ دُوربین والے کو نہیں دیکھ سکتا۔ دُوربین کے علاوہ اللہ تعالٰی نے ہمیں اور بھی ایسے کئی آلات بنانے کی توفیق عطا فرمادی ہے مثلاً ٹیلیوژن جس کے ذریعے ہم کیمرہ کے سامنے بولنے والے اور ایکٹنگ کرنے والے کو دیکھ سکتے ہیں جبکہ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتا۔ ارشاد باری تعالٰی ہے: يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ

لَا تَرَوْنَهُمْ ط الاعراف (۲۷) "وہ اور اس کے ساتھی تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔"

۴۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان پر بھی تعمیل احکام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور ان سے اعمال کا حساب بھی اسی طرح لیا جائے گا جس طرح انسانوں سے، اور اسی طرح انھیں ثواب بھی ملے گا اور سزا بھی دی جائے گی۔ اور جہنم پناہ بخدا! جنوں اور انسانوں سے بھرا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝۵۶ الذاریات۔ "میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝۱۱۹ ھود۔ "اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہو گئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جن اور انسان سے بھر دوں گا۔"

۵۔ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت جنوں کے لیے بھی ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر جن ایمان لائے تھے۔ قرآن مجید میں ہے: قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۳۰ الاحقاف۔ "انھوں نے جا کر کہا۔ اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف۔"

۶۔ قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوں میں نیک اور بد دونوں قسم کے افراد ہیں اور انسانوں ہی کی طرح ان کی مختلف صنفیں ہیں۔ خود جنوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے: وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَٰلِكَ ۖ كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا ۝۱۱ الجن۔ "اور ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں۔ ہم مختلف طریقوں میں بٹے

ہُوئے ہیں۔"

اسی تسلسل میں کچھ آگے کہا گیا ہے: وَاِنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقَاسِطُوْنَ ط الجن (۱۴) "اور یہ کہ ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف"۔

۷۔ قرآن مجید میں یہ بھی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا مطیع فرمان بنا دیا تھا اور وہ: یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ[1] وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ط سبا (۱۳) "اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا، اُونچی عمارتیں، تصویریں، بڑے بڑے حوض جیسے لگن، اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں"۔

۸۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جن غیب کا علم نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جن سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی (ان کو زندہ خیال کر کے) ان کا کام کرتے رہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَلَمَّا قَضَیْنَا عَلَیْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰی مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ج فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ الْغَیْبَ مَا لَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ۵ سبا ۱۴ "پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اُس گھُن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھُل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلّت کے عذاب میں مبتلا

---

[1] تماثیل، تمثال کی جمع ہے جس سے عرفِ عام میں مجسمہ مُراد لیا جاتا ہے۔ جانداروں کا مجسمہ بنانا ہماری شریعت میں قطعاً حرام ہے۔ (مصنّف)

نوٹ: اکثر مفسرین نے اس جگہ تماثیل سے بے جان چیزوں کی تصویریں اور قدرتی مناظر کی نقش نگاری مُراد لی ہے اور یہی قابلِ ترجیح ہے کیونکہ جانداروں کے مجسمے بنانا حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت (تورات) میں بھی حرام تھا۔ (مترجم)

نہ رہتے۔"

۹۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو بھی قرآن جیسی کوئی چیز بنا کر لانے کی دعوت مقابلہ دی ہے جس طرح انسانوں کو چیلنج کیا گیا ہے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۸۸ بنی اسرائیل۔ "کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔"

۱۰۔ یہ بات بھی مذکور ہے کہ جن آسمان تک پہنچ کر فرشتوں سے اخبارِ غیب کا تجسس کیا کرتے تھے لیکن جب اسلام آگیا تو انھیں اس کام سے روک دیا گیا، اور شہاب ثاقب مارا جانے لگا: وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۹ الجن۔ "اور یہ کہ پہلے ہم سن گن لینے کیلیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے۔"

شیاطین

جنوں میں سے جو افراد کافر ہیں وہ شیطان کہلاتے ہیں ان کے ابوالآباء کا نام ابلیس ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابلیس فرشتہ ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ وہ جن ہے کیوں کہ:

۱۔ قرآن مجید میں یہ بات صراحتاً بتائی گئی ہے کہ جب سجدے کا حکم دیا گیا:
فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ الکھف (۵۰)
"تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔"

۲۔ ابلیس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی تھی اور فرشتوں کے متعلق واضح لفظوں میں کہا گیا ہے: لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۞ ۶ التحریم "کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انھیں دیا جاتا ہے بجا لاتے ہیں"۔

۳۔ یہ بات صراحتاً قرآن مجید میں مذکور ہے کہ ابلیس ناری مخلوق ہے: قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۞ ۱۲ بنی اسرائیل "بولا میں اس (انسان) سے بہتر ہوں تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے"۔

قرآن میں جو کچھ شیاطین کے بارے میں بیان کیا گیا ہے

۱۔ شیطان انسان کا سب سے بڑا اور پہلا دشمن ہے۔ اسی نے ہمارے باپ آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوایا اور اس کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ انسان دوبارہ جنت میں نہ جا سکے اور جنت کے راستے سے دور رہے بلکہ یہ ہمیں جہنم کے راستہ پر چلنے کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس کے وسوسوں کی وجہ سے شریعت کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور اس کے گمراہ کرنے کی وجہ سے انبیاء کی ہدایت کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اس طرزِ عمل پر اور اس حماقت پر کہ وہ اپنے دشمن کی بات مانتے ہیں جو انھیں عذاب میں ڈالنا چاہتا ہے اور اپنے رب کی بات نہیں مانتے جو انھیں رحمت و مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے اور ملامت کی ہے: اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۞ ۵۰ الکہف "اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو۔ حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں۔ بڑا ہی برا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

۲۔ مذکورہ بالا آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیاطین شادی بیاہ بھی کرتے ہیں اور ان

کے اولاد (ذرّیۃ) ہوتی ہے اور یہ کہ شیاطین ابلیس کی اولاد ہیں۔

۳۔ اللہ نے شیطان کو انسانوں پر مسلط ضرور کر رکھا ہے لیکن اسے فائدہ یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں عطا کی اور اس کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جس کا دفاع نہ کیا جا سکے البتہ اسے مکر و فریب کی صلاحیت دی گئی ہے ۔ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ؁ النساء: "یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں"۔ نیز: وَلَیْسَ بِضَآرِّھِمْ شَیْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ط المجادلہ (۱۰) بے اذنِ خدا وہ انھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی[1]۔" وَمَا کَانَ لَہٗ عَلَیْھِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ۔ سبا (۲۱) "ابلیس کو ان پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا"۔

۴۔ شیطان کا کام وسوسے پیدا کرنا، بدی کے لیے انگیخت پیدا کرنا اور بُرے کاموں کی دعوت دینا ہے: یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ۔ البقرہ (۲۶۸) "شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے" یَعِدُھُمْ وَیُمَنِّیْھِمْ وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ؁ النساء "وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں اُمیدیں دلاتا ہے مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں"۔ شیطان انسانوں کو شراب، جوئے اور اسی قسم کے دُوسرے بُرے کاموں پر آمادہ کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ۔ المائدہ (۹۰) "یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں"۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ المائدہ (۹۱) "شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان عداوت اور بُغض ڈال دے"۔

شیطان کا سارا پروگرام شرارت، فحاشی اور منفی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ اور اس

---

[1] یعنی سرگوشی جو ایک شیطانی کام ہے۔ (مترجم)

پروگرام کی بنیادی شق اور سب سے پہلا حربہ جس سے اس نے حضرت آدمؑ و حوّاؑ کو بھی مصیبت میں ڈالا تھا۔ بے حجابی، عُریانی اور چست لباس ہے اور اس کی انھی حربوں کے پیشِ نظر ہمیں خبردار کیا گیا ہے: یَا بَنِیٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطَانُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ط الاعراف (۲۷) "اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمھیں پھر اسی طرح فتنے میں ڈال دے جس طرح اس نے تمھارے والدین کو جنّت سے نکلوا دیا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اُتروا دیے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دُوسرے کے سامنے کھولے۔" گویا لباس اتروانا اور شرمگاہوں کو کھولنا اس شیطانی قانون کی پہلی اور بنیادی دفعہ ہے۔

شیطان کی ایک فن کاری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے متّبعین کے سامنے بُرے کاموں کو اس خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے کہ بُرے کام انھیں حسین نظر آنے لگتے ہیں اور وہ انھیں بُرا نہیں سمجھتے۔ اسی وجہ سے بُرے کام چھوڑ نہیں سکتے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ ان کے دل اتنے سخت ہو جاتے ہیں کہ انھیں خوفِ خدا نہیں رہتا: وَلٰکِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطَانُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ ۴۳ الانعام۔ "لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خُوب کر رہے ہو۔"

شیطان ایک اور کام یہ کرتا ہے کہ اپنے دوستوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ مومنوں کے سامنے شکوک و شبہات اُچھالتے پھریں تاکہ وہ اپنے اصل مقصد یعنی دعوت اِلی الحق کی طرف توجہ نہ دے سکیں اور لڑائی جھگڑوں میں لگے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی اس شرارت سے خبردار کیا ہے اور فرمایا ہے: وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِهِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ ج الانعام (۱۲۱) "شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا

کریں "۔ اس لیے مومنوں کو چاہیے کہ ان کی باتیں نہ قبول کریں اور ان کے شرک میں مُبتلا نہ ہوں ۔: وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝ ۱۲۱ الانعام۔ " لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مُشرک ہو "۔ شیطان کا ایک کام یہ بھی ہے کہ مومن کو اپنے رب کے ذکر سے غافل کر دیتا ہے اور وہ اللہ تعالےٰ کو بھول کر گناہ کا ارتکاب کر گزرتا ہے. گناہ گاروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ: اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَاَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ط المجادلہ (۱۹) "۔ شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے خدا کی یاد ان کے دل سے بھلا دی ہے "۔ اس کے برعکس: اَلَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ ۲۰۱ الاعراف "۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال انھیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آنے لگتا ہے "۔

۵ - لیکن شیطان فساد برپا کرنے کے اپنے تمام طریقوں اور بنی آدم کی دشمنی میں ثابت قدم ہونے کے باوصف اور باوجودیکہ وہ ان کو دائیں اور بائیں آگے اور پیچھے ہر طرف سے گھیرتا ہے اور ہر جانب سے انسانوں کی گھات میں لگا رہتا ہے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا کر لاتا ہے، مال و اولاد میں ان کے ساتھ حصہ دار بنتا ہے ۔ ان سب باتوں اور کوششوں کے باوجود اس کا اختیار صرف اتنا ہے کہ وسوسے پیدا کر سکتا ہے یا بُرائی کی شہ دلا سکتا ہے لیکن کسی قسم کا فائدہ یا نقصان پہنچانے کی قدرت اسے حاصل نہیں ہے۔ اسی بنا پر جب آخرت میں کافر اور شیطان آپس میں جھگڑیں گے تو شیطان ان سے کہے گا:

مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط ابراھیم (۲۲) "۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمھیں دعوت دی اور تم نے

میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو۔ اپنے آپ ہی کو ملامت کرو"۔ اسی طرح جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ مجھے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت دی جائے اور جناب باری نے اس کی درخواست قبول فرمالی تھی، تو شیطان نے کہا تھا: رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۳۹ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۴۰ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝۴۱ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝۴۲ الحجر "وہ بولا میرے رب جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دلفریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جنھیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو۔ فرمایا یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔ بے شک جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا تیرا بس تو صرف ان بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں گے"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۹۹ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝۱۰۰ النحل "اسے ان لوگوں پر تسلط نہیں حاصل ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے ہیں اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں"۔

۶۔ شیطان اپنے ماننے والوں کو ذلیل کرتا ہے اور مصیبت کے وقت ان سے کنارہ کش ہو کر انھیں تنہا چھوڑ دیتا ہے اور ان سے کیا ہوا عہد توڑ دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ الانفال (۴۸)

"ذرا خیال کرو اس وقت کا جبکہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے (مشرکین مکہ سے یوم بدر) کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ میرا تمھارا ساتھ نہیں ہے میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں (یعنی وہ فرشتے جو آج مومنوں کی مدد کے لیے آئے ہیں) جو تم لوگ نہیں دیکھ سکتے، مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے" دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے: كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝١٦ الحشر: "ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ پہلے وہ انسان سے کہتا ہے کفر کر۔ اور جب انسان کفر کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری الذمہ ہوں مجھے اللہ رب العٰلمین سے ڈر لگتا ہے۔"

انسانوں میں شیطان

قرآن مجید میں شیطان کے جو کارنامے بیان کیے گئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں شیطان کفر کی نشر و اشاعت اور بے حیائی اور عریانی پھیلانے کے لیے مسلسل کام کرتا ہے لوگ جن برائیوں میں مبتلا ہوں ان کو وہ بنا سجا کر اور حسین صورت میں پیش کرتا ہے تاکہ وہ ان پر جمے رہیں اور انھیں چھوڑ نہ سکیں۔ شبہات ابھارتا ہے، بے بنیاد اور بے کار جھگڑے کھڑے کرتا ہے، مسلمانوں کے درمیان دشمنی پیدا کر کے ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرتا ہے یہاں تک کہ لوگ اس کی بات مان لیتے ہیں اور اس کی پیروی شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جب کسی وقت انھیں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سے مدد مانگتے ہیں تو علیحدہ جا کھڑا ہوتا ہے اور ان سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

انسانوں میں سے بھی جس شخص میں یہ اوصاف و خصائص ہوں وہ شیطان ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰهِ النَّاسِ o مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ o الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ o مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ o الناس "کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔"

گویا جو شخص بدکاری کی ترغیب دیتا ہے اور اس مقصد کے لیے عریاں تصویریں، گندی کہانیاں یا فحش اور غلیظ لٹریچر تیار کرتا اور سجا بنا کر پیش کرتا ہے اسی طرح جاہلیت کے تعصبات کو ہوا دے کر (خواہ وہ قدیم جاہلیت ہو یا جدید) اُمّتِ مسلمہ کو فرقوں میں تقسیم کرتا ہے اور ان کے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ انسانی لباس میں شیطان ہے۔ بعینہٖ جو شخص لوگوں کو جنّت کی راہ سے بھٹکا کر جہنم کی طرف لے جائے اور انھیں اللہ کی یاد سے غافل کرے وہ بھی انسانی شیطان ہے: وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ o وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ o المومنون۔" اور دُعا کرو کہ اے پروردگار میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں بلکہ اے میرے رب میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔"

ایمان بالرسل

○

رسُول انسان ہی ہوتے ہیں۔ ان میں الوہیت کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ الوہیت صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو زیب دیتی ہے۔

البتہ رسُولوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ ط الفرقان (۲۰)

○

رسُولوں پر ایمان

سب سے پہلی بات جس پر قرآن حکیم میں زور دیا گیا ہے یہ ہے کہ ملائکہ، جن اور رسُول بھی دُنیا کی دُوسری مخلوقات کی طرح اللہ تعالٰے کی مخلوق اور بندے ہیں جنھیں اس نے پیدا فرمایا ہے اور وہی ان کا مالک و مختار ہے۔ اور یہ بات بھی واضح طور پر بتا دی گئی ہے کہ یہ سب یعنی ملائکہ، جن اور رسُول اپنی ذات کو بھی اللہ کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا فائدہ یا نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتے چہ جائے کہ کسی دُوسرے کو کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکیں۔

تمام رسول انسان ہیں اور انسانوں کی طرح ہی پیدا ہوتے اور موت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ انسانوں کی مانند بیمار[1] بھی ہوتے ہیں اور صحت پاتے ہیں جسم کی بناوٹ اعضائے جسمانی کی ظاہری شکل و صورت، دورانِ خُون اور حرکت قلب کے اعتبار سے دوسرے انسانوں سے ذرا بھی مختلف نہیں ہیں۔ انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے ہیں۔ دراصل ان باتوں کا مطلب یہ ہے کہ رسول میں اُلوہیت (خدائی) کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ الوہیت صرف اللہ تعالٰی ہی کو سزاوار ہے اور اسی کے لیے ہے۔ البتہ

---

[1] سب انبیاء و رسل علیہم السلام بشر ہیں اور ہر بات میں انسانوں کی مانند ہیں۔ لیکن جو اُمور ان کے منصبِ رسالت کے مناسب نہیں یا اس مقام بلند کی ذمہ داریوں کو نبھانے میں مانع ہوں ان سے اللہ تعالٰے ان برگزیدہ ہستیوں کو محفوظ و مصئون رکھتا ہے۔ مثلاً ایسے امراض جن سے شکل و صُورت بگڑ جائے یا جن باتوں سے دوسرے متنفر ہوں۔ (مصنّف)

انبیاء علیہم السلام کو یہ امتیازِ خصوصی حاصل ہے کہ بشر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی وحی ان پر نازل ہوتی ہے۔ ویسے یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ پہلی اُمتوں کو انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحی آنے پر سخت حیرت ہوئی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی حیرت کو بے جا قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۔ یونس (۲) "کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے۔"

لوگوں کو تو اس بات پر بھی تعجب ہوا تھا کہ رسول انسان ہو اور اسی بات نے انھیں ایمان لانے سے روکا تھا: اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۴ بنی اسرائیل۔ "کہ کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟" تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کو غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ رسول جن کی طرف بھیجا جاتا ہے انہی کی جنس میں سے ہوتا ہے۔ بنابریں انسانوں کی طرف انسان ہی کو رسول بنا کر بھیجا جا سکتا ہے: لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝۹۵ بنی اسرائیل۔ "اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔"

ان لوگوں کو اپنے رسولوں پر سب سے بڑا اعتراض ہی یہ تھا کہ: اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۔ ابراہیم (۱۰) "تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان ہو جیسے ہم ہیں۔" تو جواب میں: قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ ابراہیم (۱۱) "رسولوں نے کہا واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے۔" اور اللہ نے ہم پر یہ احسان فرمایا کہ ہمیں اس نے اپنی شریعت نازل

کرنے کے لیے منتخب کر لیا اور یہ علم لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ ہمارے سپرد فرمایا۔ اسی طرح ان لوگوں نے کہا : مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۵ الفرقان "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ؛ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا۔ اور نہ ماننے والوں کو دھمکاتا :" تو اللہ تعالےٰ نے ان کی اس بات کو رد کرتے ہوئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا : وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ط الفرقان (۲۰) : " اے محمدؐ تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے :"۔ اور کافروں سے خطاب کرتے ہوئے ان کی بات کو غلط ثابت کرنے کے لیے فرمایا : وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ط وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۵ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۵ الانعام " کہتے ہیں اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انھیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور اس طرح انھیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔

رسولؑ قرآن کی رو سے

رسولؑ بھی انسان ہوتا ہے لیکن اسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ جناب باری تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے : قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ..... الخ حٰم سجدہ (۶) " اے نبی ! ان سے کہو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعہ بتایا جاتا ہے "۔.....

اس آیت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بشر ہونے پر زور دینے کے لیے کلمۂ "اِنَّمَا" استعمال کیا گیا ہے۔ عربی میں یہ کلمہ کسی بات پر انتہائی زور دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ گویا یہ کہنا مقصود ہے کہ آپؐ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو آپ کے بشر ہونے کی نفی کرے۔ پھر مزید تاکید کے لیے "مِثْلُکُمْ" کہا گیا ہے۔ یعنی تمھاری ہی طرح ۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے اور مزاجِ تخلیق کے اعتبار سے انسانوں کی مانند ضرور ہیں لیکن اس کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ سب انسان بھی مکارمِ اخلاق یا محاسنِ عالیہ اور عظمت و کمال میں آپؐ کی مانند ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے ، واقعہ یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو نہ صرف نبی و رسول بلکہ خاتم الانبیاء تھے۔ آپؐ کی اس حیثیت سے (جس کی عظمت و رفعت کو ناپنے کے لیے انسانوں کے پاس کوئی مقیاس اور پیمانہ نہیں ہے) صرف نظر کر کے اگر محض بشر ہونے کے اعتبار سے آپؐ کی ذات والا صفات کو دیکھا جائے تو بھی پوری دنیا میں آپؐ کا کوئی ثانی نہیں ہے اور آپ بلا شک و شبہ اور بغیر کسی اختلاف و نزاع کے تمام بڑے انسانوں سے بڑے اور بطل الابطال[1] ہیں۔

اس بحث میں سب سے مشکل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ ہماری ہی طرح بشر تھے اور آپ کی بھی وہی کیفیات و واردات تھیں جو انسانوں کی ہیں تو کیا آپؐ سے بھی اسی طرح خطا اور غلطی سرزد ہو سکتی ہے جس طرح ہم غلطی اور خطا کے مرتکب ہوتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ غلطی کی کئی قسمیں ہیں :۔

---

[1] اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے جناب محترم الاستاذ "عبدالرحمٰن عزام" کی کتاب بطل الابطال کا مطالعہ کیجیے۔ (مصنف)

اس سے مُراد اگر یہ ہے کہ آپؐ سے ابلاغِ رسالت اور بیانِ شریعت میں غلطی ہو سکتی تھی یا نہیں؛ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہ صرف آپؐ سے بلکہ کسی نبیؑ سے کسی ایسی غلطی کا صدور ناممکن اور محال ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی رسول جب اللہ تعالیٰ کا کلام یا اللہ کی شریعت پہنچاتا ہے تو: مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ النجم۔ "وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔" نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ النساء (۰۷) "لوگو! یہ رسول تمھارے رب کی طرف سے حق لے کر آگیا ہے۔" اس لیے یہ بات محال ہے کہ رسولؑ سے منصبِ رسالت پر فائز ہو جانے کے بعد کوئی گناہ، کوئی غلطی یا کوئی ایسی بات سرزد ہو جو اس کی عدالت کو مجروح کرے یا مروّت میں خلل ڈالے یا اس کی عظمت و کمال کے منافی ہو۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ نے اسے رہبر بنا کر بھیجا ہے اور مُسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اس کے عادات و خصائل کو اپنائیں اور تمام باتوں میں اس کی پیروی کریں: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ الاحزاب (۲۱)۔ "درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔" انسانوں کے لیے نمونہ ہونے کا یہ مقامِ بلند تمام انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۝ الممتحنۃ۔ "انھیں لوگوں کے طرزِ عمل میں تمھارے لیے اچھا نمونہ ہے۔" اور انبیاء و رسل علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کا انسانوں کے لیے اُسوہ اور نمونہ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے کسی غلطی کا ارتکاب نہ ہو اور ہر قسم کے نقص سے پاک ہوں۔

۲۔ اس کے علاوہ کسی ایسے شرعی معاملہ میں خطا کا امکان جس میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہ ہُوا ہو اور اس معاملے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے رائے دی ہو۔ ایسی صورت میں غلطی سرزد ہو جانے کا امکان ضرور ہے،

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان برگزیدہ ہستیوں کو ایسی کسی غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا بلکہ فوراً ہی اس معاملہ میں صحیح صورت حال سے مطلع فرما کر غلطی کی اصلاح فرما دیتا ہے جیسا کہ نابینا صحابی حضرت ابن امِ مکتومؓ کے واقعہ میں یا اسیرانِ بدر کے متعلق آپؐ نے جو فیصلہ فرمایا تھا اس کے سلسلے میں ہُوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صورتوں میں آپؐ کو مطلع فرما دیا کہ آپؐ کا اجتہاد دُرست نہ تھا۔

مَیں نے اپنے طور پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ سلوک کا جو آپؐ نے حضرت ابنِ اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ سے اختیار کیا تھا اس انداز میں جائزہ لیا ہے کہ فرض کیجیے "سورۃ عبس" کی وہ آیات (جن میں آپ کو اس واقعہ کے بارے میں متنبہ کیا گیا ہے) نازل نہ ہُوئی ہوتیں اور آپؐ کے اُس طرزِ عمل کو جو آپؐ نے اس موقع پر اختیار کیا تھا دنیا کے بڑے بڑے عقلاء، قائدین اور علماء کے سامنے پیش کر کے سوال کیا جاتا کہ آیا اس میں کوئی بات ایسی ہے جس پر تنقید کی جا سکے یا ان کے خیال میں آپ کا اندازِ سلوک بالکل صحیح تھا؟۔

پہلے ذرا آپ واقعہ کی نوعیت کو سمجھ لیجیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے چند سر برآوردہ رؤساء کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہیں اور آپؐ کی پوری توجہ اس بات پر مرکوز ہے کہ یہ اشخاص اسلام کو سمجھ لیں اور ان کے دل اسلام کی طرف مائل ہو جائیں تاکہ یہ لوگ دین کی مدد اور دعوت کی کامیابی کا باعث بنیں۔ اسی اثناء میں آپؐ کے صحابیوں میں سے ایک صاحب جو نابینا تھے آتے ہیں اور ایک عام سا مسئلہ پُوچھنا چاہتے ہیں جو نہ تو ہنگامی تھا اور نہ اس کی تاخیر سے کوئی ہرج یا نقصان ہو سکتا تھا۔ اور یہ صاحب یہی مسئلہ آپ سے کسی بھی وقت دریافت کر سکتے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ پہلے آپ وہ گفتگو ختم کر لیں جس میں آپ مصروف ہیں اس کے بعد ان صاحب

کو جواب دیں۔ آپ بتائیں کیا ایسی صورتِ حال میں دنیا کا کوئی بھی شخص اس سے مختلف طرزِ عمل اختیار کرے گا؟ اور کیا کوئی ایسا شخص ہے جو یہ نہ کہے گا کہ میرے خیال میں آپؐ ہی کا انداز بالکل صحیح اور حق بجانب تھا؟

واقعہ بھی یہی ہے کہ انسانی منطق کے پیمانے سے آپ کا طرزِ عمل بالکل درست تھا۔ لیکن جب وحی نازل ہوئی تو پتہ چلا کہ پیمانہ وہ نہیں ہے جو ہم نے بنا رکھا ہے۔ اور درحقیقت وہی معیار و مقیاس درست ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ہے۔ جس نے عقل کو پیدا فرمایا ہے، اس کا فیصلہ عقل کے فیصلے سے کہیں زیادہ درست ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ حقیقی فیصلہ وہی ہے اور عقل کے فیصلے میں خامی اور کم نگاہی ہے۔

اسی طرح آپؐ نے بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں جو مؤقف اختیار کیا تھا اس کے متعلق بھی اگر بذریعہ وحی غلطی کی نشان دہی نہ کی گئی ہوتی تو یہ فیصلہ بھی دُنیا کے عقل مند ترین شخص کے نزدیک درست فیصلہ تھا۔ وہ اگر غلط قرار پایا تو محض نزولِ وحی کی وجہ سے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ دراصل آپؐ سے کبھی کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس کو ہم ان معنی کے اعتبار سے خطا یا غلطی کہہ سکیں جو اس لفظ سے عرفِ عام میں مُراد لیے جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے یہ احساس پیدا ہو کہ آپ کے علی الاطلاق اعظم البشر ہونے کے باوصف ایسا کیوں ہُوا؟ بلکہ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آسمانی حکمت ہر چیز پر غالب ہے۔

۳۔ امورِ شریعت کے علاوہ ایسے معاملات جن کا تعلق انتظامی یا جنگی اُمور سے ہے، ان کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان تھے اور ان معاملات میں آپ کی سوچ انسانی انداز ہی کی تھی۔ اکثر صحابہؓ کرام آپؐ سے اس قسم کے امور کے سلسلے میں یہ دریافت کیا کرتے تھے کہ آپ نے جو

فیصلہ فرمایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرمایا ہے۔ یا اپنی رائے سے۔ اگر آپ فرماتے کہ اس سلسلہ میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا اور یہ میری ذاتی رائے ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپؐ کی خدمت میں اپنی اپنی آراء پیش کرتے اور آپ ان میں سے کسی ایک کو قبول فرما لیتے تھے یا رد فرما دیتے تھے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ غزوۂ بدر کے موقع پر جائے قیام کے انتخاب کا تھا صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ جگہ آپؐ نے اللہ کے حکم کے مطابق انتخاب فرمائی ہے اور اس سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا منع کر دیا گیا ہے؟ یا یہ آپؐ کی رائے اور جنگی چال ہے؟ پھر جب آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے تو صحابہ نے اس کے مقابلے میں مختلف مشورے پیشِ خدمت کیے اور آپؐ نے ان میں سے ایک مشورہ قبول فرما لیا اور اپنی رائے تبدیل فرما دی۔ ایسی ہی صورتِ حال غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کھودنے اور بنی غطفان سے صلح کرنے کے بارے میں پیش آئی تھی۔

۴۔ اب رہ گئے خالص دنیاوی اُمور، ان میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی رائے بیان فرما دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی صنعت و حرفت اور زراعت سے متعلق ایسی باتوں میں جنھیں عام طور پر صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو اس کے اہل ہیں۔ آپؐ کا مشورہ واقعے کے خلاف بھی ہو جاتا تھا۔ جس طرح تابیرِ نخل (کھجوروں کی پیوند کاری) کے سلسلے میں آپؐ کے ارشادِ گرامی کا نتیجہ خلافِ توقع نکلا لیکن اس قسم کی کسی بات سے آپؐ کی عظمتِ شان اور رفعتِ مکان میں کوئی نقص یا خامی نہیں لازم آتی۔ دُنیا کے کسی بھی عظیم انسان یا بڑے سے بڑے عالم سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ ہر اس بات کو جانتا ہو جو صرف پیشہ ور، فن کار یا کارکُن اور اہلِ زراعت و تجارت ہی جانتے ہیں۔

کھجور کو بار آور کرنے کا معاملہ ایک زرعی اور فرعی مسئلہ ہے۔ آپؐ نے اس

سلسلے میں اپنی رائے سرسری طور پر بیان فرمائی تھی نہ تو اسے ضروری قرار دیا تھا نہ اس رائے کو ان پر مُسلّط فرمایا تھا اور نہ یہ فرمایا تھا کہ یہ کوئی دین کی بات ہے یا اللہ تعالٰے کی طرف سے وحی ہے۔ بعد میں جب آپ کو معلوم ہُوا کہ آپ کی رائے کا نتیجہ خلافِ توقع نکلا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: اَنْتُمْ اَعْرَفُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ: "اپنے دنیاوی امور کو تم بہتر جانتے ہو۔"[1]

رسُول اور علمِ غیب

قرآن مجید میں صراحت سے یہ بات بتا دی گئی ہے کہ رسولوں کو غیب کا علم نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ لوگوں کو صاف طور پر بتا دیں کہ آپ کو بھی غیب کا علم نہیں ہے: قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ ج اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ الانعام (۵۰) اے محمدؐ! ان سے کہو مَیں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ مَیں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے"۔ نیز: قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ج وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ج اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ الاعراف ۱۸۸ "اے محمدؐ ان سے کہو میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے، حالانکہ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو مَیں بہت سے

---

[1] غالباً وہ حدیث بھی اسی نوعیت کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مکھی اگر کسی شروب سے بھرے ہوئے برتن میں گر جائے تو اسے ڈبو کر نکالنا چاہیے۔ یہ بھی صرف مشورہ ہے حکم نہیں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ علما میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ مکھی کو ڈبو کر نکالنا واجب ہے اور اس کی مخالفت یعنی مکھی کو نہ ڈبونا حرام ہے۔ (مصنف)

فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں محض ایک خبردار کرنے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں اُن لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں"۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حقیقت سب کو بتا دی اور قرآن مجید کی یہ آیات پڑھ کر سُنا دیں۔ اور یہ آیات آج بھی قرآن میں موجود ہیں ان کی مسجدوں میں تلاوت کی جاتی ہے اور نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔

رسولؐ اور اصولِ رسالت

قرآن مجید میں یہ بات بیان فرمائی گئی ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بھیجے گئے ہیں: وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ ۝ ۲۴ فاطر۔ "اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو"۔ اور: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ یونس (۴۷) "ہر امت کے لیے ایک رسول ہے"۔ لیکن قرآن مجید میں بعض کا ذکر ہے اور بعض کا ذکر نہیں کیا گیا: وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ ؕ النساء (۱۶۴) "ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا گیا"۔

لیکن تمام رسول ایک ہی پیغام لے کر آئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار، یوم آخرت کی تصدیق اور اللہ کی شریعت کی پیروی کی جائے۔ چنانچہ اسلام اور پہلی شریعتوں کے بنیادی اصول ایک ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی یہی پیغام لے کر آئے تھے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ الشوریٰ (۱۳) "اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے

جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ"۔ جتنے بھی پیغمبر آئے سب اسی قوم میں پیدا ہوئے جس کی طرف وہ مبعوث ہوئے تھے اور اسی قوم کی زبان میں انھیں پیغام دیا گیا تھا تاکہ ان سے باتیں کر سکیں اور انھیں سمجھا سکیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم ۴) "ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے"۔

یہ سلسلۂ رسالت بالآخر خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دیا گیا۔ آپؐ کو پوری دنیا اور تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا۔ آپؐ کے بعد اب نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کسی پر وحی نازل ہوگی۔ آپؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے ساتھ ہی وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا گیا۔ آپؐ کے وجودِ مسعود کی برکت سے دین مکمل ہو گیا اور انسانوں پر اللہ کا انعام واکرام اپنی انتہا کو پہنچ گیا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط المائدہ (۳) "آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے"۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

کوئی شخص پوچھ سکتا ہے کہ جب تمام انبیاء و رسل علیہم السلام صرف اپنی اپنی قوم کے لیے بھیجے گئے تھے اور ان کی شریعتیں منسوخ بھی ہوئیں اور بدلی بھی گئیں تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پوری دنیا اور سب انسانوں کے

لیے ہے اور آپ کی شریعت قیامت تک بغیر کسی تغیر و تبدل کے باقی رہے گی؟

اس کا جواب یہ ہے واَلعلم عند اللہ کہ:-

ا۔ شریعتِ اسلامیہ میں اتنی لچک اور وسعت ہے کہ یہ شریعت ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے کام دے سکتی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جہاں تک عبادات اور اعتقادات کا تعلق ہے اسلام میں ان کے لیے قطعی اور مفصل احکام دیے گئے ہیں۔ جن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عبادتیں اور عقاید نہ تو زمان و مکان کے بدلنے سے تبدیل ہوتے ہیں اور نہ رسم و رواج کے بدلنے سے ان میں فرق پڑتا ہے۔

اس کے برعکس آئین و دستور، مالی امور اور انتظامی معاملات کے ڈھانچے جو زمان و مکان اور عرف عادت کی تبدیلی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں ایسے احکام دیے گئے ہیں جو عمومیت اور وسعت کے حامل ہیں۔ گویا ان کی حیثیت کسی عمارت کی بنیاد اور مرکزی ستونوں کی سی ہے اور ہمیں یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ ان بنیادی اصول و قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر زمانے اور ہر مقام کے مطابق خود قانون سازی کر لیں۔ میں یہاں اس سلسلے میں مختصراً کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔

مثلاً اسلام نے ضروری قرار دیا ہے کہ سربراہِ مملکت افرادِ قوم کی رائے سے منتخب کیا جائے اور اس میں امورِ مملکت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی صلاحیت ہو اسلام کے دستورِ اساسی یعنی قرآن مجید کے مطابق تمام امور سرانجام دینے پر قادر ہو اور ملکی مسائل و معاملات میں اربابِ حل و عقد سے مشورہ لینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ یہ بنیادی احکام دے دینے کے بعد طریقِ انتخاب (الیکشن) کا مسئلہ یا یہ کہ اہل الرائے افراد اور ارباب حل و عقد کو کس طرح متعین کیا جائے، ان سے مشورے کس انداز میں لیے جائیں وغیرہ، باقی تفصیلی اُمور ہمارے طے کرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

اسی طرح ہم پر یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ لوگوں کے تمام معاملات عدل وانصاف سے فیصل کیے جائیں لیکن عدل کے حصول کا طریقہ طے کرنا، قاضی مقرر کرنے کا طریقِ کار وضع کرنا، مقدمات کے لیے اصول وضوابط بنانا وغیرہ مسائل ومعاملات علماءِ امت کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔

اسی طرح معاہدوں کے لیے انتہائی وسیع اور عام اصول وقواعد کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جن میں معاہدہ کرنے والے دونوں فریقوں کا معاہدہ کرنے کے قابل ہونا، ان کا پوری طرح آزاد ہونا اور معاہدے کے لیے استعمال کیے گئے الفاظ کا جامع اور صحیح ہونا شامل ہیں تاکہ معاہدہ کرنے والے فریقوں کے اصل مقصد و مدعا کا پوری طرح اظہار ہو سکے اور معاہدے کا موقع ومحل معلوم ہو سکے۔ علاوہ ازیں معاہدوں کے کچھ اقسام جو مفادِ عامہ کے خلاف ہیں یا جن میں فریقین میں سے کسی ایک کے دھوکے میں مبتلا ہو جانے کا امکان ہے، ممنوع قرار دے دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد معاہدات کے مختلف اقسام کے لیے مفصل جزئیات کی تیاری، دفعات اور شقوں کی ترتیب وتدوین ہمارے لیے چھوڑ دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ باقی تمام اُمور مثلاً وہ انفرادی اعمال اور مالی معاملات جن کے ناجائز ہونے کے بارے میں نہ تو کوئی نص موجود ہو اور نہ وہ کسی ایسے بنیادی اصول کے تحت آتے ہوں۔ جس سے ان کا حرام ہونا لازم آتا ہو، مباح اور جائز قرار دے دیے گئے ہیں۔

پھر اسلام نے ہر معاملے میں استصلاح (بہتری اور بھلائی کا پہلو مدنظر رکھنا) کا ایک بنیادی اصول بتا دیا ہے جس کی رُو سے کسی مسلمان حاکم کی طرف سے جاری کردہ ہر وہ حکم جس میں عوام کا فائدہ اور اجتماعی مصلحت ہو بشرطیکہ اس حکم میں کوئی بات احکامِ شرع کے خلاف نہ ہو۔ دینی فریضہ قرار پاتا ہے۔ اس ضمن میں مالیات کے تمام ضابطے، عدالتی نظام سے متعلق تمام قوانین اور دفتری نظم ونسق کے

تمام امور مثلاً نظامِ مواصلات اور نظامِ بلدیات وغیرہ کے بارے میں ہر قسم کے احکام آجاتے ہیں۔

گویا اسلامی احکام میں اتنی لچک اور وسعت ہے جس کی وجہ سے یہ دین ہر زمانے میں قابلِ عمل اور ہر مقام پر نافذ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

لیکن متاخرین میں سے بعض فقہائے نے بہت سی ایسی باتوں میں بھی جن میں شریعت نے لوگوں کو وسعت و سہولت مہیا کی ہے اپنی تنگ ذہنی کی بنا پر اتنی تنگی پیدا کردی کہ ردِ عمل کے طور پر لوگ ایسے مسلکوں میں وسعت تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے جو دینِ اسلام کے خلاف ہیں۔ یہی بات امام "ابنِ قیمؒ" نے بھی اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" میں کہی ہے۔

۲۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا پوری دُنیا، ہر زمانے اور سب انسانوں کے لیے عام ہونے کا دُوسرا سبب یہ ہے کہ پہلے انبیاء ورسل علیہم السّلام کے اَدوار میں قومیں علیحدہ علیحدہ اور ایک دُوسرے سے ناآشنا رہتے ہُوئے زندگی بسر کرتی تھیں۔ ان میں باہم نہ کوئی رابطہ تھا نہ علاقہ، زیادہ سے زیادہ گھوڑوں یا اُونٹوں کے ذریعہ طویل مسافتیں طے کر کے ایک دُوسرے سے مل سکتے تھے لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اقوامِ عالم بتدریج ایک دُوسرے سے متعارف ہوتی گئیں دُور والے قریب ہو گئے اور مُسافروں کے لیے زمین سمٹ گئی۔ یہاں تک کہ آج ہم ایک ایسے زمانے میں پہنچ گئے ہیں۔ جب اگر امریکہ میں کوئی تقریر کی جاتی ہے تو چین کا باشندہ یہ تقریر مقرر کے سامنے کھڑے ہُوئے شخص سے پہلے سُن لیتا ہے[1]۔ یہ پوری دنیا ایک شہر کی طرح اور تمام اقوامِ عالم ایک قوم کی مانند ہو گئی ہیں۔ اگر اس وقت مسلمان اپنے

---

[1] یہ ایک حقیقت ہے۔ اس لیے کہ آواز ہوائی لہروں کے مقابلے میں نشریاتی لہروں کے ذریعے جلد منتقل ہوتی ہے۔ (مصنّف)

دینی فریضہ دعوت و تبلیغ کو کما حقہٗ بجا لائیں تو رسالتِ محمدیہ اور دینِ اسلام کی دعوت پوری دُنیا میں پھیل سکتی ہے۔

اسلام رسولوں کے مابین فرق و امتیاز نہیں کرتا

دُوسرے انبیاء کے متبعین میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے نبی کے علاوہ (جس کی طرف وہ خود کو منسوب کرتے ہیں) باقی سب نبیوں پر زبان طعن دراز کرتے ہیں لیکن اسلام نے مسلمانوں پر تمام نبیوں اور رسولوں کی تعظیم کرنا ضروری قرار دیا ہے اگر کوئی شخص کسی نبی یا رسول کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے یا انھیں مطعون کرتا ہے تو اسلام کے خلاف عمل کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: 'اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ق غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ۲۸۵ البقرہ "رسولؐ اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسولؐ کو ماننے والے ہیں انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کرلیا ہے یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسُولوں کو ایک دُوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ ہم نے حکم سُنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں، اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

گویا ایک مسلمان حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السّلام کو بھی اسی طرح محبوب رکھتا ہے جس طرح وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے۔ ان کا بھی ویسے ہی اکرام و احترام کرتا ہے جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کرتا ہے۔

اس کے معنی یہ ہُوئے کہ کوئی یہودی اگر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا دین قبول

کرتا ہے تو اسے موسیٰ علیہ السلام کو نہ ماننے کا خسارہ نہیں اُٹھانا پڑا۔ بلکہ اس کے ساتھ
اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا نفع بھی کمایا۔ اور اس کے بعد اگر
یہی عیسائی اسلام قبول کرتا ہے تو اسے حضرت موسےٰ اور حضرت عیسےٰ علیہما السّلام
کو نہ ماننے کا نقصان نہیں پہنچا بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تمام انبیاء و رسل
علیہم السلام پر ایمان لانے کا مزید نفع حاصل ہُوا۔

قرآن حکیم اور انبیاء و رُسل علیہم السلام

مسلمان یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے جو حضرت جبرئیلؑ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے۔ اور آپؐ نے جو کچھ اور جس طرح حضرت جبرئیلؑ سے
سُنا بعینہٖ انسانوں تک پہنچا دیا اور یہ بھی ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آج جو صحف ہمارے پاس
قرآن کی شکل میں موجود ہے وہ مکمل اور بعینہٖ وہی ہے جو حضرت جبرئیلؑ لائے تھے چنانچہ
جو شخص ان عقاید میں سے کسی عقیدے میں شک کرے گا یا ان میں سے کسی کا انکار
کرے گا وہ کافر اور اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں پچیس انبیاء کا ذکر ہے جنہیں چھ آیات میں جمع کر دیا گیا ہے اور وہ آیات
درج ذیل ہیں: (۱) وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ
مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝۸۳ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ
كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَ
اَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۸۴
وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۸۵ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۶ الانعام ۶ یہ تھی
ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے
ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں حق یہ ہے کہ تمہارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔ پھر ہم

نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہِ راست دکھائی (وہی راہِ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی اور اس کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی) اس طرح ہم نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اسی کی اولاد سے) زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا، ہر ایک ان میں سے صالح تھا (اسی کے خاندان سے) اسمٰعیلؑ، الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو راستہ دکھایا۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا کی"۔ (۲) وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ۝ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝ مریم "اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کرو۔ وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا"۔ (۳) وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ط الاعراف (۶۵) "اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا"۔ (۴) وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا۔ الاعراف (۷۳) "اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا"۔ (۵) وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ط الاعراف (۸۵) "اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا"۔ (۶) وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ ط كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ ۝ ۸۵ الانبیاء "اور یہی نعمت اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے"۔

قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کا ذکر بھی ہے لیکن واضح طور پر یہ نہیں بتایا گیا کہ آپ بھی رسول تھے۔ البتہ جن آیات میں حضرت آدمؑ کا ذکر ہے۔ ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ آپ کو رسول کہتے ہیں ان کا قول قابلِ ترجیح ہے۔

قرآن مجید میں مذکور پچیس انبیاؑ میں سے بعض کا صرف نام بتایا گیا ہے مثلاً حضرت ادریس اور ذوالکفل علیہما السلام وغیرہ۔ بعض نبیوں کے واقعات مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں مثلاً حضرت اسماعیل حضرت اسحٰق اور حضرت یونس علیہم السلام اور کچھ انبیاء و رسل کے قصے تفصیل

سے بیان کیے گئے ہیں جیسے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف اور حضرت عیسےٰ علیہم السلام۔ لیکن انبیاء و رسل علیہم السلام کے بارے میں جو کچھ اور جتنا قصہ بھی قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے وہ حق اور سچ ہے اور اس پر بہر حال ایمان لانا واجب ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ط البقرہ (۲۵۳)، "یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہمکلام ہوا اور کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے"۔

معجزات

جب واقعہ "اسریٰ" ہوا یعنی ایک ہی رات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور اسی رات واپس بھی تشریف لے آئے تو قریش نے اس واقعے کا یقین نہیں کیا۔ ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا کیونکہ اس زمانے کے وسائلِ سفر یعنی اونٹ گھوڑوں وغیرہ کے ذریعہ ایک رات میں اتنی دور جانا اور واپس آنا محال تھا۔ لیکن یہی ناممکن بات آج ہمارے زمانے میں نہ صرف ممکن ہو گئی ہے بلکہ اتنی عام ہے کہ اب اس پر نہ کسی کو تعجب ہوتا ہے اور نہ کوئی انکار کر سکتا ہے۔

آج سے ایک یا دو صدی پہلے اگر کسی بڑے سے بڑے عالمِ طبعیات سے کہا جاتا کہ عنقریب لوگ لوہے اور فولاد سے بنی ہوئی سواریوں پر بیٹھ کر اڑیں گے اور رفتارِ ہوا کی مقررہ حدود پھلانگ جائیں گے یا یہ کہ کسی کی گفتگو یا تقریر اس طرح ریکارڈ کر لی جائے گی کہ جب چاہیں سُن سکیں گے بلکہ بولنے والے کے مرنے کے بعد بھی اس کی گفتگو اسی کی آواز میں سُنی جا سکے گی تو وہ عالم

یقیناً کہتا کہ یہ ناممکن ہے حالانکہ آج یہ سب کچھ ایک ایسی حقیقت بن چکا ہے جسے سب جانتے ہیں۔

آخر یہ سب ناممکن باتیں حقیقت کیسے بن گئیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ محالات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک۔ ایسے اُمور جن کو ہوتے ہوئے دیکھنے کے ہم عادی نہیں ہیں اور صرف اسی بنا پر انھیں محال خیال کرتے ہیں یعنی "محال عادی" جیسے مذکورہ بالا اُمور۔ اور دوسرے، وہ باتیں جن کا وقوع میں آنا عقلاً محال ہے۔ جیسے اجتماعِ ضِدَّین۔ مثلاً "وجود" اور "عدم" ایک دُوسرے کی ضد ہیں۔ اب یہ بات ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی مقام پر ایک شخص موجود بھی ہو اور غیر موجود بھی۔

یا جیسے کسی چیز کی ھُوِیَّۃ (عینیت) کا بدل جانا ناممکن ہے یعنی کسی چیز کا وہ نہ ہونا جو فی الواقع وہ ہے۔ مثلاً کسی کتاب کا کتاب ہوتے ہوئے روٹی کا نوالہ بن جانا ناممکن ہے۔

اب جن باتوں کو عقل محال سمجھتی ہے ان کے تو وقوع میں آنے کا تصوّر بھی نہیں کیا سکتا۔ لیکن "محالاتِ عادیہ" تو یہ ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ انسانوں نے سائنسی علوم کے ذریعہ اُن کو ممکن بنا دیا ہے تو کیا وہ قادرِ مطلق جس نے خود یہ قوانین بنائے ہیں ایسا نہیں کر سکتا کہ محالات کو ممکن کر دے؟

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ جو امر عادتاً محال ہو، اسے وقوع میں لا کر ممکن بنا دے چنانچہ اگر کسی محالِ عادی کے وقوع میں آنے کی اطلاع ہمیں "خبرِ صحیح" کے ذریعہ ملے گی تو ہم اسے واقعہ تسلیم کر لیں گے اور اس پر یقین کریں گے۔

کرامتیں

قرآن مجید میں محالات فی العادہ" کے وقوع پذیر ہونے کے جو واقعات بیان کیے

گئے ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔

۱۔ ایسے واقعات جو کسی نبی کے ہاتھوں اس کی قوم کے چیلنج کے جواب میں نبی کی رسالت اور صداقت ثابت کرنے کے لیے بطور سند وقوع میں آئے۔ ایسے واقعات کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں ڈالا جانا اور اللہ تعالیٰ کا آگ کی فطرت کو بدل کر اسے ان کے لیے ٹھنڈا اور باعثِ سلامتی بنا دینا۔ یا جیسے حضرت موسٰے علیہ السلام کے قصے میں عصا کا سانپ بن جانا یا پتھر پر عصا مارنے سے پتھر میں سے پانی کے چشمے جاری ہو جانا یا عصا سے سمندر کا اس طرح پھٹ جانا کہ لوگ اس میں سے گزر سکیں۔ اسی طرح حضرتِ عیسٰے علیہ السلام کا اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔ گویا وہ تمام خلافِ معمول واقعات جو قرآن مجید میں مذکور ہیں سب معجزات ہیں۔

۲۔ دوسری قسم وہ غیر معمولی واقعات ہیں جو اللہ کے کسی نیک ولی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے۔ جیسے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس محراب میں کھانے کی چیزوں کا آجانا یا قصۂ سلیمان علیہ السلام میں اس شخص کا ذکر جس کے پاس "کتاب کا علم" تھا اور جس نے ملکۂ بلقیس کا تخت پلک جھپکنے سے بھی پہلے ملکِ یمن سے فلسطین پہنچا دیا تھا وغیرہ۔ ایسے تمام واقعات کو "کرامت" کہا جاتا ہے۔

۳۔ تیسری قسم ان واقعات کی ہے جو کسی کافر کے ہاتھ پر ظہور پذیر ہوئے جیسے سامری نے زیورات پگھلا کر ان سے بنی اسرائیل کے لیے ایک ایسا بچھڑا بنا دیا تھا جو بیل کی آواز نکالتا تھا۔ ایسے واقعات "استدراج" کہلاتے ہیں۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ ان تینوں قسموں کے واقعات پر ایک تو اس لحاظ سے ایمان لانا ضروری ہے کہ ایسے واقعات وقوع پذیر ہو سکتے ہیں اس لیے کہ قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے۔

دُوسرے ان تفصیلات پر بھی ایمان لانا ضروری ہے جو ان واقعات کے سلسلے

ہیں قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔

ان کے علاوہ وُہ کرامتیں جنھیں بعض لوگ ایسے افراد کی طرف منسوب کرتے ہیں جنھیں وہ اولیاء اللہ خیال کرتے ہیں۔ ایسی سب روایتیں صرف "خبر" کی حیثیت رکھتی ہیں جو سچی بھی ہو سکتی ہیں اور جھوٹی بھی۔ اب اگر کوئی واقعہ کسی مومن اور متقی ولی کی طرف سے ظہور پذیر ہو (جن کے بارے میں قرآن مجید میں ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ یونس۔ سنو! جو اللہ کے دوست ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں") اور اُس واقعے میں کوئی خلافِ شریعت بات بھی نہ ہو اور آپ اس کا یقین کر لیں تو آپ پر کوئی گناہ لازم نہیں آئے گا۔ اور اگر آپ کے نزدیک اس کی صحت مشکوک ہو جس کی وجہ سے آپ اس کا یقین نہ کر سکیں تب بھی آپ گناہ گار نہ ہوں گے۔

باقی رہ گیا کوئی ایسا مظاہرہ جس کے کرامت ہونے کا صرف فرضی دعوےٰ کیا جائے اور اس میں کوئی امر خلافِ شرع بھی ہو جیسے امام شعرانی نے اپنے "طبقات" میں بعض روایات بیان کی ہیں یا کسی غیر مومن یا فاسق و فاجر کی طرف سے دکھایا گیا ہو اسے کرامت ہرگز نہ کہا جائے گا۔ (اسے شعبدہ یا کچھ اور جو جی چاہے کہہ لیجیے)۔

معجزہ یا سحر کا فرق

جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور فرعون کے جادُوگروں میں مقابلہ ہُوا تھا اور جادُوگروں نے اپنے عصا اور رسّیاں میدان میں ڈالی تھیں تو دیکھنے والے انھیں سانپ اور اژدہے سمجھے تھے۔ پھر جب موسیٰ علیہ السّلام نے اپنا عصا میدان میں ڈالا تو وہ بھی سانپ بن گیا تھا اور اس نے جادُوگروں کے سانپوں اور اژدہوں کو نگل لیا تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور فرعون کے جادُوگروں کا عمل

ایک ہی نوع کا تھا اور کیا ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟

اس بات کا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بھی کوئی جادو ہی دکھایا تھا تو جادوگر کس بات سے متاثر ہو کر ایمان لے آئے تھے جبکہ (جادو تو وہ بھی جانتے تھے) واقعہ یہ ہے کہ جادوگروں نے جو کچھ دکھایا تھا وہ صرف فریب نظر اور دیکھنے والوں کو مغالطہ میں ڈالنے والا عمل تھا۔ عصا اور رسیاں اپنی اصلی حالت پر قائم رہتے ہوئے دیکھنے والوں کو سانپ اور اژدھے نظر آئی تھیں جبکہ عصاءِ موسیٰ علیہ السّلام فی الواقع سانپ بن گیا تھا۔ اگر اس وقت وہاں کیمرہ موجود ہوتا اور سارے واقعے کی تصویر لی جاتی تو عصاءِ موسیٰ علیہ السّلام کی تصویر یقیناً حقیقی سانپ کی تصویر ہوتی جبکہ ساحروں کے سانپ اس تصویر میں رسیاں اور عصا ہی نظر آتے۔

یہی وجہ ہے کہ جادوگر اتنی جلدی ایمان لے آئے تھے۔ حقیقتاً انھوں نے کوئی ایسی چیز دیکھی تھی جو نہ تو جادو تھی نہ نظر بندی اور نہ شعبدہ بازی۔ کوئی ایسی چیز تھی جس نے ان کے دل دہلا دیے تھے اور ایمان لانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کا ایمان اس حد تک پختہ ہو گیا کہ فرعون کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اسے بھی چیلنج کر رہے تھے (کہ جو جی چاہے کرلو) یقیناً ان کے دل میں اللہ تعالےٰ کی عظمت گھر کر گئی تھی اور وہ اس پر ایمان لا چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظروں میں فرعون کی جھوٹی اور خود ساختہ عظمت بے معنیٰ ہو کر رہ گئی تھی۔ دراصل ان کے نزدیک دنیا اتنی حقیر ہو گئی تھی کہ فرعون انھیں سولی پر چڑھانے اور ہاتھ پاؤں کاٹ دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا اور انھیں کوئی پروا نہ تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ فرعون انھیں زیادہ سے زیادہ دنیاوی عذاب دے سکتا تھا اور آخرت کے سامنے دُنیا کی کیا حیثیت ہے اور دُنیا کے پل بھر کے عذاب کا اُخروی ابدی انعام واکرام سے کیا مقابلہ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فرعون کے فیصلے کی تحقیر کرتے ہوئے باآوازِ بلند

کہہ دیا تھا کہ: فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ط اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ط[1] : "تو جو کرنا چاہے کرلے۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کرسکتا ہے"۔

دوستو!

میں مسلمان پیدا ہوا ہوں اور میرے آباؤ اجداد بھی نسلاً بعد نسلٍ سب مسلمان تھے اس کے باوجود خدا کی قسم میں اکثر یہ آرزو کرتا رہتا ہوں کہ کاش مجھ میں بھی وہ ایمان پیدا ہو جائے جو فرعون کے جادوگروں میں اسلام[1] قبول کرنے کے چند ہی منٹ بعد پیدا ہو گیا تھا۔

سیدِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

سیدِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بڑے معجزے: (۱) قرآن حکیم اور (۲) آپ کی ذاتِ اقدس کہ بے نظیر خلقِ عظیم اور وہ بے مثال مکارمِ جمیلہ اور محاسنِ جلیلہ ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی رسالتِ عظمیٰ یعنی منصبِ ختمِ رسالت و نبوّت کے مقامِ بلند کے لیے آپ کو منتخب فرمایا۔

رحمتِ عالم کی حیاتِ طیبہ کا ہر واقعہ بلکہ پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ آپؐ بشر تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ اپنے بشر ہونے پر جو ایک واضح حقیقت ہے، پورا زور دیں اور کھلے لفظوں میں لوگوں کے سامنے اس حقیقت کا اعلان کردیں تاکہ لوگ آپ کو خدا نہ بنا بیٹھیں۔ یا آپ کے لیے خدائی صفات ثابت کرنے

---

[1] اسلام کے تین معانی ہیں۔ (۱) معنیٰ عام۔ اس معنی کے اعتبار سے ہر وہ شخص مسلمان ہے جو کسی بھی رسول پر اس کے دورِ رسالت میں ایمان لایا ہو۔ (۲) معنیٰ خاص۔ اس معنی کے لحاظ سے صرف وہ شخص مسلمان ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے (۳) معنیٰ خاص الخاص۔ یہ وہ معنیٰ ہیں جو مشہور حدیث جبریل میں "ایمان"، "اسلام" اور "احسان" کی توضیح و تشریح کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں۔ (مصنف)

کی کوشش نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ الکہف (۱۱۰) "اے محمدؐ کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا میری طرف وحی کی جاتی ہے"۔ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ انسان ہونے کے ناطے جہاں تک انسانیت کے عام اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے میں تم جیسا ہی ہوں لیکن اس کے مقابلہ میں ایک اور بہت بڑی حقیقت بھی ہے جسے سب تسلیم کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ انسانوں میں کوئی اور ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو عظمت و کرامت میں آپؐ جیسا ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم انسانیت میں اس مقام و مرتبہ اور انداز و طراز کا انسان سوائے ایک فردِ بے مثال کے جس کا نام نامی حضرت محمد ابنِ عبداللہ ہے پیدا نہیں فرمایا صلی اللہ علیہ وعلیٰ ابیہ ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ وجمیع الانبیاء۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر سب سے بڑا ظلم جو دراصل حقیقت کے ساتھ بھی بہت بڑی ناانصافی کے مترادف ہے یہ ہوگا کہ ہم آپؐ کی عالی مرتبت ذات کو تاریخِ عالم کے ان ہزاروں بڑے لوگوں میں سے کسی ایک پر قیاس کر لیں جن کے نام تاریخ کے دھندلے صفحات پر تاریخ کے وجود میں آنے کے وقت سے روشن نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ تاریخ کے ان بڑوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ ان میں سے اگر کوئی بڑی عقل کا مالک ہے تو قوتِ بیان اور جذبۂ محبت سے عاری ہے یا اگر کوئی گفتگو کی فصاحت و بلاغت اور تیز خیالی سے آراستہ ہے تو اس کا اندازِ فکر رسمی اور عامیانہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی قوتِ ارادی اور قیادت کی اہلیت رکھتا ہے تو اس کا کردار و اخلاق بازاری اور فاسقانہ ہے۔ ان سب کے برعکس جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی وہ واحد و یکتا ہستی ہیں جس نے عظمت و کرامت کے تمام پہلو اپنے اندر سمو رکھے ہیں۔ پھر دنیا کے مشہور صنادید[1] و ابطال میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کی سوانح حیات

---

[1] اس بات کی تصدیق ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس نے یورپ کے ادیبوں (باقی اگلے صفحہ پر)

کا کوئی نہ کوئی گوشہ ایسا نہ ہو جس کو چھپانے اور اپنے ان کارناموں کی پردہ پوشی کا اہتمام نہ کرتا ہو اور اسے یہ خوف نہ رہا ہو کہ کہیں لوگ اس سے واقف نہ ہو جائیں. خواہ اس پہلو کا تعلق اس کی شہوت پرستی سے ہو یا اس کے خاندانی پس منظر سے یا اس کی ذاتی کمزوریوں اور بے اعتدالیوں سے ہے۔ ان سب سے بالکل برعکس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی دُنیا کی وہ واحد شخصیت ہیں کہ آپؐ نے اپنی پُوری زندگی ہر لحاظ سے لوگوں کے سامنے کھول کر پیش کر دی تھی اور آج وہ ایک کھُلی کتاب کی مانند ہم سب کے سامنے ہے جس میں کوئی صفحہ خفیہ اور کوئی سطر دُھندلی نہیں ہے اس میں سے ہر شخص جو چاہے پڑھ سکتا ہے۔

صرف آپؐ ہی دُنیا کے وہ واحد انسان ہیں جس نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو کھلی اجازت دی کہ آپؐ کے تمام افعال واقوال جو انھیں معلوم ہیں ہر طرف نشر کریں اور دُوسروں تک پہنچائیں۔ چنانچہ صحابہ کرام نے آپؐ کے بارے میں ہر وہ بات بیان کر دی جو انھوں نے دیکھی، خواہ اس کا تعلق کسی کیفیت سے ہو وہ بات آپؐ کے مقاماتِ عالیہ سے متعلق ہو یا آپؐ کے بشری پہلو یعنی غصہ کی حالت یا مختلف جذباتی کیفیات کے بارے میں ہو۔

اسی طرح آپؐ کی ازواجِ مطہرات رضوان اللہ علیہنّ نے بھی اُن تمام روابط و تعلقات سے پوری طرح پردہ اٹھا دیا جو اُن کے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھے۔ آپ اُم المومنین حضرت عائشہؓ ہی کو لے لیجیے۔ آپؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہی اور آپؐ کی اجازت سے آپؐ کے رہن سہن اور اہل و عیال

(بقیہ فٹ نوٹ) الیگزینڈر ڈوماس، بوڈلیر اور بائرن وغیرہ کے سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے، علاوہ ازیں ان قوموں کے قائدین خواہ وہ نپولین بونا پارٹ ہو یا کوئی اور چھوٹا بڑا سب کے اخلاق و کردار کا حال یہی ہے۔ (مصنف)

کے ساتھ آپ کے طرزِ معاشرت کو پُوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔
دراصل اس کا حقیقی سبب یہ ہے کہ آپ کا ہر قول و فعل بلکہ زندگی کا ہر ہر لمحہ دین اور شریعت ہے۔ اگر مجھے اس بات کا خیال نہ ہوتا کہ اس کتاب کو نوجوان لڑکے اور خواتین بھی پڑھیں گے تو میں یہاں زندگی کے چند ایسے زاویے بھی بیان کرتا جن کی عام طور پر پردہ پوشی کی جاتی ہے۔ حدیث فقہ اور سیرت کی کتابوں میں یہ سب چیزیں پوری شرح و بسط کے ساتھ موجود ہیں۔

صحابہ کرام نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں ہر چیز بیان کر دی ہے یہاں تک کہ وہ امور بھی جن کا تعلق انسان کی فطری ضروریات سے ہے اور اسی کے نتیجہ میں ہمیں یہ تک معلوم ہو گیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کھانا تناول فرماتے تھے، آپ کے لباسِ مبارک کی کیا کیفیت تھی۔ کس طرح استراحت فرماتے تھے اور قضائے حوائج کا انداز کیا تھا اور اس کے بعد طہارت کس طرح فرماتے تھے۔

آپ تاریخ کے بڑوں میں سے کوئی ایک ایسا باہمّت انسان نکال کر دکھائیں جس میں یہ جرأت ہو کہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر لوگوں سے علی الاعلان کہہ سکے کہ آئیے اور دیکھیے' یہ ہے میری پُوری زندگی اور زندگی کے اعمال و افعال آپ کے سامنے موجود ہیں انھیں دوست و دشمن سب کو دکھائیے اور اس پر جس کا جس طرح جی چاہے تنقید کرے اور انھیں پرکھ کر دیکھ لے۔

تاریخ میں کوئی ایسا بڑا آدمی بتائیے جس کے سوانح حیات اس قدر تفصیل اور اہتمام کے ساتھ مرتب کیے گئے ہوں کہ اس کے تمام لمحاتِ زندگی اور زندگی کے خفیہ گوشے تیرہ سَو سال بعد بھی لوگوں کے سامنے اس طرح عیاں ہوں جس طرح حضرت خیر البشر کے تمام زاویہ ہائے سیرت پاک ہمارے سامنے ہیں۔

کسی عظیم انسان کی عظمت کے اسباب یا تو اس کی عادتیں، اخلاق، اوصافِ جمیلہ

اور ذاتی خوبیاں ہوتے ہیں۔ یا وہ کارہائے نمایاں جو اس نے اپنی زندگی میں سرانجام دیے یا وہ باقیات صالحات اور اچھے اثرات ہوتے ہیں جو وہ اپنی امت کی تاریخ میں اور تاریخِ عالم کے لیے چھوڑ گیا ہو۔

دُنیا کے ہر بڑے انسان کی عظمت و کرامت کو ناپنے کے لیے ان پیمانوں میں سے کسی ایک پیمانے کے اعتبار سے اس کی بڑائی کو متعین کیا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو ان تمام پیمانوں سے ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ آپ نے تمام عظمتوں کو خود میں جمع کر لیا تھا۔ آپ اوصافِ جمیلہ کے لحاظ سے بھی عظیم تھے اور کارناموں اور اعمال کے لحاظ بھی عظیم۔ اور باقیاتِ صالحات کے اعتبار سے تو آپ کا مقام اتنا بلند ہے کہ آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

دنیا کے تمام بڑے لوگ یا تو اس لحاظ سے بڑے گزرے ہیں کہ وہ اپنی اپنی قوم کے بڑے تھے اور انھوں نے اپنی قوم کو فائدہ پہنچایا تھا لیکن انھوں نے اتنا ہی کسی دوسری قوم یا ملک کو نقصان بھی پہنچایا ہوگا۔ جیسے بڑے بڑے جنگ جُو سپہ سالار یا فاتح قائدین۔ یا پھر ان کی عظمت اگر عالمی معیار کی ہے تو وہ صرف کسی ایک محدود سمت میں ہو گی مثلاً کسی کا کارنامہ یہ ہوگا کہ اس نے اللہ کے بنائے ہوئے قوانینِ طبیعیہ میں سے کوئی ایسا قانون دریافت کیا ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اس لیے چھپا کر رکھا تھا کہ ہم اپنی عقل کو کام میں لائیں۔ اور اسے دریافت کریں۔ یا کسی مرض کی کوئی دوا دریافت کی ہو گی یا فلسفہ کا کوئی نظریہ وضع کیا ہوگا۔ یا اظہار و بیان کے مختلف اسالیب میں سے کسی اسلوب میں کوئی مثالی چیز تخلیق کی ہو گی مثلاً کوئی بے نظیر ناول یا فصیح و بلیغ اشعار کا کوئی دیوان وغیرہ وغیرہ۔

لیکن حضرت محمدؐ! زبان پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ کی عظمت و رفعت۔ عظمت و رفعت کے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے عالم گیر اور اپنے

تمام زاویوں اور گوشوں کے اعتبار سے ہمہ گیر تھی۔

آپؐ جس چیز کی دعوت دیتے تھے اس پر خود بھی کامل ایمان رکھتے تھے۔ جب کہ بہت سے قدیم و جدید مُبلّغ اور داعیوں کی کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں ان کا عمل اُسے جھٹلاتا ہے۔ لوگوں کے سامنے جیسا خود کو ظاہر کرتے ہیں خلوت میں ویسے نہیں ہوتے۔ کسی چیز سے رغبت و محبت یا نفرت و خوف کے وقت، غصّے اور بھوک کی کیفیت میں یا احتیاج کی حالت میں ان پر خواہشاتِ نفسانی کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اپنی کہی ہوئی باتیں انھیں یاد نہیں رہتیں۔ میں کسی دوسرے کی بات نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات کی مثال پیش کرتا ہوں۔ مَیں خود جب دعوتِ خیر و صداقت اور تبلیغ دین و ہدایت کی غرض سے تقریر کرتا ہوں یا ان مقاصد کے لیے کوئی مقالہ لکھتا ہوں اس وقت اپنی طبیعت میں ایک خاص انداز کی رفعت محسوس کرتا ہوں لیکن پستی سے بلندی کی طرف سفر کی ابھی ابتدا ہی ہوتی ہے کہ مجھ پر کثافتِ طبع اور خواہشاتِ نفس امارہ کا پھر سے غلبہ ہو جاتا ہے اور مَیں واپس اسی ارضی سطح پر آ جاتا ہوں جہاں سے اُٹھا تھا۔ دراصل لوگ واعظوں اور خطیبوں میں یہی کمی دیکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی باتوں پر کان نہیں دھرتے اور اسی وجہ سے ان کے وعظوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو احکامِ اسلام بیان کرنے کی غرض سے کبھی کسی یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے بُلائے گئے نہ کسی مدرسہ میں آپؐ کے لیے ہیڈ مقرر کیے گئے، نہ کبھی آپؐ نے وعظ کا کوئی جلسہ منعقد کیا بلکہ آپؐ تو جو کچھ آپ کی طرف وحی کیا جاتا تھا گھر مسجد اور بازار میں یعنی ہر جگہ پہنچا دیتے تھے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ جہاں اور جب ضرورت ہو انجام دیتے تھے لیکن جو کچھ زبان سے ارشاد فرماتے تھے اس کا اظہار آپؐ کے عمل سے بھی ہوتا تھا۔ آپؐ کا عمل آپؐ کے ارشادات کی تعبیر و تفسیر ہُوا کرتا تھا۔ آپؐ کا خلقِ عظیم قرآن کریم تھا

آپ نے یہ بات اکثر سنی ہو گی لیکن کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ جنابِ والا اس کے معنی ہیں کہ آپؐ کے اعمال و افعال میں سے ہر فعل و عمل اور آپؐ کی عاداتِ کریمہ میں سے ہر عادت قابلِ تلاوت آیت ہے، ایک خطبہ ہے جو ہر جگہ پڑھا جاتا ہے بلکہ ایک مکمل حلقہ درس و وعظ ہے۔

آپؐ راتوں کو اتنا طویل قیام فرماتے تھے کہ قدم مبارک متورّم ہو جایا کرتے تھے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے طلبِ مغفرت فرماتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرما دیے ہیں (پھر آپؐ اتنی عبادت و استغفار کیوں فرماتے ہیں؟) آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟۔ واقعہ تو یہ ہے کہ آپؐ کے تمام اعمال نماز تھے اس لیے کہ خیر کی ہر کوشش، بدی کو ختم کرنے والا ہر اقدام اور معاشرہ کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے ہر کام نماز بن جاتا ہے بشرطیکہ کرتے وقت کرنے والے کی نیت اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔

مَیں یہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنی تعلیمات پر ایمان محکم اور احکام خُدا کو نافذ کرنے میں اتنی زیادہ باقاعدگی اور استحکام کی صرف ایک مثال جو ہر اعتبار سے ارفع و اعلیٰ ہے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ میں پہلے اصل واقعہ کی وضاحت کے لیے بطورِ تمہید ایک سوال کرتا ہوں:

آجکل اگر شرفاء کے کسی بہت بڑے خاندان مثلاً کسی وزیر یا رئیس کی لڑکی چوری کے الزام میں پھنس جائے تو آپ کا کیا خیال ہے اسے بھی اسی طرح جیل بھیج دیا جائے گا جس طرح کسی خانہ بدوش لڑکی کو چوری کے جرم میں جیل بھیج دیا جاتا ہے اور اس پر بھی قانونی حکم اسی طرح نافذ کر دیا جائے گا جس طرح خانہ بدوش لڑکی پر یا سینکڑوں ہاتھ آگے بڑھ کر اس کے جرم کو چھپانے اور مقدمہ آسان بنانے یا سزا کم کروانے کی کوشش

کریں گے؟

دراصل اسی قسم کا ایک واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ خیر القرون میں پیش آچکا ہے۔ قبیلہ قریش کی شاخ بنی مخزوم کی ایک لڑکی جو کہ بہت ہی اُونچے خاندان کی فرد تھی یعنی ولید کے خاندان کی۔ جسے وحید کہا جاتا تھا بلکہ یُوں سمجھیے کہ حضرت خالدؓ بن ولید جو کہ قرنِ اوّل کے تمام معرکوں میں چوٹی کے سپہ سالار رہے ہیں اور جن کا خاندان قریش میں بنی ہاشم اور بنی اُمیہ کے بعد تیسری حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے خاندان کی ایک لڑکی نے چوری کی اور جُرم ثابت ہو جانے کی بنا پر سزا کا فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ اب لوگوں نے اس خیال سے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم معافی اور درگزر کو پسند فرماتے ہیں سفارش کی بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ آپؐ معاف فرما دیں گے۔ لیکن ہُوا یہ کہ آپؐ نے شدید غصہ کی حالت میں ارشاد فرمایا کہ "یاد رکھو! تم سے پہلی اُمتیں صرف اسی وجہ سے تباہ و برباد ہوگئیں کہ ان میں اگر کوئی خاندانی اور صاحبِ جاہ و مرتبت شخص جرم کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیا جاتا تھا اور اگر کوئی کمزور اور غریب جرم کرتا تو اُسے سزا دیا کرتے تھے۔" اور اسی اثنا میں آپؐ نے یہ حیرت انگیز ارشادِ گرامی صادر فرمایا جو اسلامی زندگی میں ایک بہت ہی مستحکم اصول کی حیثیت اختیار کر گیا اور اسی کی بنا پر یہ قانون بنا کہ حدود کے سلسلے میں نہ کوئی سفارش قابلِ شنوائی ہے اور نہ کسی صورت معاف کیا جا سکتا ہے۔ اَیمُ اللّٰہِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا۔ "خدا کی قسم اگر حضرت فاطمہؓ بنتِ محمدؐ بھی چوری کرتیں تو میں ان کا ہاتھ کاٹ دیتا۔"

اور ایسا کرنا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مرتبت کے اعتبار سے ایک قدرتی امر تھا۔ آپ کی تو زندگی ہی دعوت الی اللہ تھی اور یہی آپؐ کا مقصد حیات تھا۔ آپ نے اپنے جذبات و عواطف کو احکامِ الٰہی کے تابع کر لیا تھا۔ اور

انسانوں سے آپؐ کے تمام رابطے اور تعلقات خواہ رشتہ داری کے ہوں یا دوستی کے یا کسی فائدے کی غرض سے، اُس وقت ختم ہو جاتے تھے جب وہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں حائل ہوں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھے جس کے لیے لوگ عام طور پر زندہ رہتے ہیں۔ مثلاً کھانے اور کپڑے کے مسائل۔ اسی طرح آپؐ تمام اغراض و خواہشاتِ نفس سے بلند تھے، نہ عسرت کی زندگی کے حریص تھے اور نہ ارادۃً بھوک کو دعوت دیتے تھے جیسا کہ بعض مدّعیانِ ورع و تقویٰ کرتے ہیں اور نہ ہمیشہ فقیرانہ لباس یا کھدر کے کپڑے استعمال فرماتے تھے بلکہ آپؐ کے سامنے جو طیّب اور حلال چیز پیش کی جاتی آپؐ تناول فرما لیتے تھے اور اگر کوئی حلال چیز آپؐ کو پسند نہ آئے تو اُسے نہ کھاتے لیکن اس میں عیب بھی نہ نکالتے۔ آپؐ کے بارے میں ہمیں کوئی بات ایسی نہیں پہنچی جس سے معلوم ہو کہ آپؐ نے کبھی کسی حلال کھانے کی بُرائی کی ہو۔ اگر کبھی کھانے کو نہ ملتا تو آپؐ بھوک برداشت فرماتے۔ یہاں تک کہ جب تکلیف حد سے بڑھ جاتی تو آپ پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ لباس کے معاملے میں جو میسّر آگیا استعمال فرما لیتے۔ نہ کسی خاص وضع کا التزام فرماتے تھے اور نہ کسی مخصوص رنگ کا اور نہ کسی خاص قسم کے کپڑے کا۔ کبھی آپؐ کلاہ پر عمامہ باندھتے اور کبھی بغیر عمامہ کے کلاہ یا بغیر کلاہ کے عمامہ استعمال فرما لیتے تھے۔ آپؐ نے قمیص کے ساتھ تہ بند اور چادر بھی استعمال فرمائی ہے اور دھاری دار کپڑا بھی اور جبّہ بھی۔ لیکن وہ جبّہ آج کل کا سا لمبا چوڑا اور بڑی بڑی آستینوں والا نہ تھا بلکہ تنگ آستین والا جبّہ۔ آپؐ کا عمامہ بھی آج کل کے عماموں کی مانند نہ ہوتا تھا بلکہ جیسا اہلِ حجاز میں مُروّج ہے۔ معمولی کپڑے کا ایک ٹکڑا جسے سر پر لپیٹ لیا جاتا ہے۔ اور کسی وقت اسے سر پر باندھنے کی حاجت نہ ہو تو کندھے پر

ڈال لیا جاتا ہے اور عام ضروریاتِ زندگی کے کاموں میں بھی برتا جا سکتا ہے۔ جنگ کے موقع پر اگر قیدی کو باندھنا مقصود ہو تو یہ کام بھی اس سے لیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی آپؐ عمامے کا چھوٹا سا شملہ بھی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ویسے عمامہ حجاز میں اس علاقہ کی شدید گرمی کے باعث ناگزیر ہے۔ اہلِ حجاز عمامے سے اپنے سر کو دھوپ کی تمازت سے بچاتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ عمامہ اہلِ عرب کا تاج ہے عمامہ کے سلسلے میں بھی کسی خاص رنگ کی پابندی نہیں فرماتے تھے۔ البتہ فتح مکہ کے دن آپؐ کا عمامہ سیاہ رنگ کا تھا۔

لباس کے سلسلے میں اسلام کسی خاص لباس کو حرام قرار نہیں دیتا۔ سوائے اس لباس کے جس کی وجہ سے جسم کے وہ حصے کھل جائیں جن کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے مسلمان عورت کے لیے ایسا لباس جس سے اس کے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ کھُلا رہے اور مردوں کے لیے ریشم کا لباس منع ہے۔ نیز غیر مسلموں کے مذہبی پیشواؤں کے مخصوص لباس جس کی وجہ سے پہننے والا ان میں سے ہی سمجھا جائے۔ مثلاً راہبوں کا لباس وغیرہ۔ عورتوں سے مخصوص لباس مردوں کے لیے اور مردوں کے مخصوص لباس عورتوں کے لیے اور ایسی بیش قیمت پوشاکیں جن کی وجہ سے فضول خرچی ہو ازروئے اسلام ممنوع ہیں۔ ان کے علاوہ ہر لباس کا استعمال جائز ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو زینت و آرائش کو، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہے، حرام قرار دیتے تھے اور نہ کھانے پینے کی پاک چیزوں کو۔ نہ کسی رزق کو رد فرمایا کرتے تھے۔ اور نہ کسی کھانے کی چیز سے جو میسر آجاتی انکار فرمایا کرتے تھے لیکن آپؐ کھانے پینے کی چیزوں کے حریص بھی نہ تھے کہ انہی چیزوں کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد خیال کریں (جیسا عام لوگ کرتے ہیں)

اسی طرح آپؐ دنیاوی جاہ و ثروت کی طلب و خواہش سے بھی بے نیاز تھے۔ سب

جانتے ہیں کہ قریش نے دعوتِ اسلام ترک کر دینے کے عوض آپؐ کے سامنے طرح طرح کی پیش کشیں کیں کہ اگر آپ مال دار ہونا چاہتے ہیں تو جس قدر چاہیں مال لے لیں، اگر اقتدار چاہتے ہیں تو آپؐ کو امیر و سلطان بنا دیا جائے گا۔ غرض انھوں نے کوئی ایسی چیز نہ چھوڑی جو اُن کے خیال میں انسانی نفس کو مرغوب و مطلوب ہو سکتی ہے۔ لیکن آپؐ نے ان کی ہر پیش کش کو بڑے استغنا سے اور ان کی عقل و دانش پر رحم کھاتے ہوئے مسترد فرما دیا۔

اسی طرح آپ جنسی خواہشات کی الجھنوں سے بھی بے نیاز تھے۔ بہت سے مستشرقین جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ اپنی پست اور مریضانہ ذہنیت سے کیا ہے اور آپؐ کو بھی اسی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کی ہے جس سے وہ اپنے بڑے لوگوں کو ناپتے ہیں۔ انھوں نے سیرت کی کتابوں میں دیکھ لیا کہ آپؐ کی ازواجِ مطہرات رضوان اللہ علیھن کی تعداد ۹ تھی، تو انھوں نے فوراً کہہ دیا کہ آپ تو معاذ اللہ جنس زدہ تھے۔ ان لوگوں نے آپؐ کو بھی اپنے مشاہیر اہلِ سیف و قلم پر قیاس کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً نپولین جس نے ایک پوری قوم کو ان کی حکومت اور سربرآوردہ لوگوں کے ذریعے اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ دلال بن کر اس پولش لڑکی (میری لوئیس) جس سے وہ محبت کرتا تھا ملا دیں۔ پھر معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ لڑکی کے باپ کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس گناہ کے لیے تیار کرے جو نپولین کو مطلوب تھا۔ دراصل نپولین نے پولینڈ کی آزادی اپنی ناروا جنسی خواہش کی تکمیل کے ساتھ مشروط کر دی تھی۔

اور یہ بدکاری صرف نپولین پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ "الیگزنڈر ڈوما"، "بائرن"، "گوئٹے"، "بوڈلیر" وغیرہ بیسیوں اور بڑے لوگ ہیں جن سب کا کردار اتنا ہی گھناؤنا ہے۔ آپ ان میں سے کسی کی سوانح حیات اٹھا کر دیکھ لیں جب آپ ان کی جنسی زندگی کے حالات پر پہنچیں گے تو اتنی غلاظت نظر آئے گی کہ اس کی بُو سے آپ کا جی متلانے لگے

گا۔ اب یہ لوگ اسی ذہن و مزاج کو لے کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی اس قسم کی دریدہ دہنی سے کہ آپؐ بھی العیاذ باللہ "شہوت پرست" تھے نہ صرف یہ کہ آں حضرت کی سیرتِ پاک سے قطعی لاعلمی کا ثبوت مہیّا کرتے ہیں بلکہ خود اپنے علم النفس سے نابلد ہونے اور تحقیق و تلاش و جستجو کے سلسلے میں دیانت اور غیر جانب داری سے عاری ہونے کا بھی احساس دلاتے ہیں۔

انسان میں شہوتِ جنس کے ہیجان و عروج کا زمانہ عنفوانِ شباب کا وہ دور ہے جو بلوغ کے وقت سے پچیس سال کی عمر تک رہتا ہے۔ دراصل یہی وہ پرخطر دَورِ عمر ہے جس میں ہر با ہوش لڑکے لڑکی کو ہر اس چیز سے خود کو بچانا چاہیے جو گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ مثلاً بے پردگی، آزادانہ میل جول، حرام اور فحش باتوں کی ٹوہ میں رہنا اور ذہن و فکر کو اس قسم کی بے ہودگیوں میں مصروف رکھنا وغیرہ، بلکہ آزادانہ میل جول تو اگر پڑھنے پڑھانے کے نام پر ہو تب بھی ناروا ہے۔ خیر، تو اب آپ دیکھیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عمر کے اس دَورِ پُرخطر میں کس مقام پر ہیں اور آپؐ کے آغازِ جوانی کے احوال و واقعات کیا ہیں؟ آپؐ ایک آزاد نوجوان تھے، نہ آپؐ پر کوئی نگرانی تھی نہ اس زمانے کا رسم و رواج آپؐ کو کسی بُرے کام سے روکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس دَور میں آپؐ کے ہم عمر نوجوان اس قسم کی لذتوں میں پوری طرح ڈوبے ہوئے تھے جنہیں ان بُرائیوں اور بدکاریوں سے نہ کوئی دین منع کرتا تھا، اور نہ کوئی قانون۔

آپؐ کی سیرتِ پاک کا ہر گوشہ دوست اور دشمن کے سامنے کھلا ہُوا ہے ہر نقّاد اسے پرکھ سکتا ہے۔ کیا اس میں کسی کو نظر آتا ہے کہ آنجناب صلّی اللہ علیہ وسلم اس دَورِ عمر میں ان لوگوں میں شامل تھے جو عیش و مستی میں ڈوبے رہتے ہیں اور بُری خواہشات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور لُطف و لذّت ہی ان کا منتہائے مقصود ہوتا ہے!

اس کے برعکس یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ آپؐ نے صرف ایک مرتبہ محض سوچا تھا کہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ مل کر کسی کھیل میں شریک ہوں تو اللہ تعالےٰ نے آپؐ کی آنکھوں پر نیند کا پردہ ڈال دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خیال ہی آپؐ کے دل سے نکل گیا تھا۔ علاوہ ازیں اگر کبھی آپؐ سے اس قسم کی کوئی بات سرزد ہوئی ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ مشرکینِ عرب جو آپؐ کے بدترین دشمن تھے اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہر طریقے اور ہر حربے سے آپؐ کو ایذا پہنچائیں، ایسے معاملات میں خاموش رہتے اور اگر ایسا کوئی واقعہ ہوتا تو اسے آپؐ کے خلاف گند اُچھالنے کے لیے استعمال نہ کرتے؟ دُوسری بات یہ ہے کہ آپؐ نے پچیس سال کے سن میں شادی فرمائی تھی تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپؐ نے کسی خوبصورت کنواری لڑکی سے شادی کی تھی یا ایک ایسی عورت سے جو عُمر و سن کے اعتبار سے ماں کے لگ بھگ تھیں، چالیس سالہ بیوہ۔ بلکہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ آپؐ کی تمام ازواجِ مطہّرات جن سے آپؐ نے کسی دینی مصلحت و مقصد کے زیرِ نظر نکاح فرمایا تھا ان میں زیادہ تر بیوہ خواتین تھیں؟ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیک وقت چار سے زیادہ ازواج بطورِ حرمِ محترم رکھنے کا خصوصی حق عام مسلمانوں سے زائد عطا فرمایا تھا تو اس کے مقابلے میں ایک ایسے حق سے محروم فرما دیا تھا جو ہر خاوند کو حاصل ہے یعنی طلاق کا حق۔

علاوہ ازیں جنسی قوّت و صلاحیّت کوئی عیب نہیں ہے بلکہ حقیقتاً یہی تو مردانگی کا مظہر ہے اور پھر مردانگی اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ ہو گی تو اور کس میں ہو گی؟ دراصل معیوب بات یہ ہے کہ انسان محض اسی قوت و صلاحیت کو اپنا مقصدِ حیات بنا لے اور صرف اسی کے لیے زندہ رہے، اسی کے بارے میں ہر وقت سوچے اور اس کے تقاضے پورا کرنے کے لیے حرام ذرائع بھی اختیار کرے۔

اسی ضمن میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کا واقعہ آجاتا ہے۔ دراصل دریدہ دہن مخالفین اسی واقعہ کو بڑی بے شرمی سے غلاظت اچھالنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کی باتیں فی الواقع اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی تردید کی جائے، اس لیے کہ یہ لوگ قصداً اور ارادۃً اصل واقعہ کو مسخ کر کے غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں اور اپنی بیمار اور گندی سوچ کے مظہر ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ایک حسین و جمیل خاتون اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قریبی رشتہ دار تھیں۔ اگر آپ نے کبھی ان سے نکاح کے بارے میں سوچا بھی ہوتا تو یہ نکاح کبھی کا ہو چکا ہوتا کیونکہ یہ نسبت یقیناً حضرت زینب اور ان کے خاندان کی آرزوؤں میں سے سب سے بڑی آرزو ہوتی۔ لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ دراصل اس واقعے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نافذ کردہ اصلاحات میں سے دو معاشرتی اصلاحوں کا ذریعہ بنایا تھا۔ ایک اصلاح کا تجربہ تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا پر ہوا اور دُوسرے تجربے کا مصداق و محور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بنی۔

اسلام میں زمانہ جاہلیت کے نسبی غرور اور طبقاتی تفریق کو ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ حضرت زینبؓ کی مثال سے اس طرح نافذ کیا گیا کہ حضرت زینبؓ جو کہ قبیلہ قریش میں چوٹی کے عالی نسب خاندان کا فرد تھیں ان کی شادی حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کر دی گئی۔ حضرت زید ایک غلام اور متبنّیٰ تھے اور اُس معاشرے کی نظر میں آپ کسی صُورت حضرت زینبؓ کے ہمسر اور برابر نہ ہو سکتے تھے۔ اور یہ شادی حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان کی ناپسندیدگی کے باوجود ہُوئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی ازدواجی زندگی مسلسل جھگڑے اور اختلافات کا شکار رہی۔ دونوں فریق بارہا اس رشتے کو ختم کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے تھے، لیکن

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے منع فرماتے تھے اور حضرت زیدؓ سے ارشاد فرماتے: اَمۡسِكۡ عَلَیۡكَ زَوۡجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ ۔ الاحزاب (۳۷) :- " اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو "۔ یہاں تک کہ دونوں کا پیمانۂ صبر اتنا لبریز ہو گیا کہ چھلک گیا اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی کوئی صورت نہ رہی تو حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔

اس طلاق کے بعد اس واقعے کے دُوسرے تجربے کا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور یہ مرحلہ پہلے مرحلے سے بھی سخت اور گراں بار تھا اور حضرت زینب سے نکاح فرما کر اس تجربے کی پیچیدگیوں اور مشکلات سے عُہدہ برآ ہونے کی ذمّہ داری آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آ پڑی تھی۔ دراصل اس کا مقصد متبنیٰ بنانے کی بعض جاہلانہ رسوم کو باطل قرار دینا اور یہ واضح کرنا تھا کہ متبنیٰ کی بیوی طلاق کے بعد متبنیٰ بنانے والے شخص کے لیے حلال ہے لیکن اس میں سب سے بڑی دِقّت یہ تھی کہ لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باتیں بنائیں گے اور اس وقت کا مُعاشرہ آپؐ کے متعلق یہ بدگمانی کرے گا کہ آپ نے اپنے بیٹے کی مُطلّقہ بیوی سے شادی فرما لی ہے. اس واقعہ کا بھی وہ سخت ترین مرحلہ تھا جس میں سے آپؐ گزرے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی رہتے ہوئے آپؐ نے اسے برداشت فرمایا۔

گویا اصل واقعہ ویسا نہیں ہے جیسا بدگمانی اور مفروضوں کے ماتحت یاوہ گو حضرات پیش کرتے ہیں. دراصل یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں اتنی لغو اور فضول ہیں کہ ان کا رد کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے. میں نے جو کچھ پیش کیا ہے صرف اس مقصد سے کیا ہے کہ قارئین کتاب میں سے جنہیں اصل واقعات کا علم نہیں انھیں صحیح صورتِ حال معلوم ہو جائے۔

جسمانی قوّت سے انسان مادی مقابلوں میں کامیابی حاصل کرتا ہے دل قوی ہو تو

دشمنوں کو زیر کر لیتا ہے لیکن ان قوتوں سے بھی بڑی ایک اور قوت ہے جس کے ذریعہ انسان ان معاملات پر فتح پاتا ہے جو مادی قوت اور دشمن سے کہیں زیادہ طاقت ور ہیں اور وہ ہے اخلاقی قوت اس کے وسیلے سے انسان اپنے نفس پر، نفسانی خواہشات و جذبات پر اور لگاوٹوں اور چاہتوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔

یہ نفسیات کا ایک مسلّمہ مسئلہ ہے جسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اندازو الفاظ میں متعدد مواقع پر بیان فرمایا ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا: لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ وَلٰكِنَّ الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ۔ "بہادر وہ شخص نہیں ہے جو فنِ پہلوانی کا ماہر ہو بلکہ بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت خود پر قابو رکھے۔" اور یہ بات بالکل صحیح ہے اس کے درست ہونے کا اندازہ آپ خود اپنی ذات سے کر سکتے ہیں اگر دشمن کو پچھاڑنے کے لیے قوت کی ایک اکائی درکار ہو تو اپنے غصے پر قابو پانے اور سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو اس طرح ٹھنڈا کرنے کے لیے کہ آپ اپنی حرکات، آواز، اور لہجہ کے لحاظ سے بھی پرسکون نظر آئیں سوگنا قوت کی ضرورت ہو گی اس لیے کہ یہ کام مدِ مقابل کو پچھاڑنے سے سوگنا مشکل ہے۔ آپ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں آپ کے پاس ایک شخص لایا جائے جو غصہ سے اس قدر اندھا ہو چکا ہو کہ اسے اپنے سامنے کی چیزیں بھی نظر نہ آ رہی ہوں۔ آپ اسے اخلاقِ حسنہ نرمی اور درگزر کا درس دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسی حالت میں دس ہزار میں سے ایک شخص ایسا ہو گا جو آپ کی بات قبول کر سکے گا۔

ذرا تصور کیجیے اگر کسی شخص نے آپ کی محبوب ترین اور عزیز ترین ہستی کو قتل کر دیا ہو اور آپ کسی نظریے کے داعی ہوں۔ پھر وہ شخص آپ کے پاس آ کر آپ کی دعوت قبول کرنے کا اظہار کرے تو کیا آپ وہ آنسو بھلا دیں گے جو آپ نے اپنی اس عزیز ہستی کی موت پر آنکھوں اور دل سے بہائے ہوں گے اور اسے معاف کر

دیں گے ؟ اس سوال کا جواب آپ کو معلوم ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب وحشیؓ کو جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل تھے جب وہ مسلمان ہو گئے تو معاف فرما دیا تھا۔ اور آپؐ پر انسان کے فطری تقاضے کا صرف اتنا اثر تھا (جو نہ تو اسلام کے خلاف ہے اور نہ اس سے کسی کو نقصان پہنچتا ہے) کہ آپؐ نے حضرت وحشیؓ سے فرمایا تھا: "تم میرے سامنے نہ بیٹھا کرو۔" اور یہی وجہ ہے کہ حضرت وحشیؓ آپؐ کی نظرِ مبارک سے بچ کر رہتے تھے۔

اسی طرح حضرت ہندؓ حضرت ابوسفیانؓ کی زوجہ جو بحالتِ کفر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے عداوت میں اُس حد کو پہنچ گئی تھیں اور انھوں نے وہ کچھ کیا تھا جو کوئی عورت ہی نہیں کوئی انسان کر ہی نہیں سکتا۔ شاید بھیڑیا اور چیتا بھی نہ کرے یعنی انھوں نے سیدالشہدا، حضرت حمزہ کا سینہ چیرا اور آپ کا دل نکال کر چبا لیا تھا۔ یہی ہند جنھوں نے آپؐ کے خلاف یہ سب کچھ کیا تھا جب مسلمان ہوئیں تو آپؐ نے ان کا اسلام قبول فرما لیا اور معاف فرما کر انھیں بیعت کر لیا تھا۔

اسی طرح طائف والوں نے آپ کو معلوم ہی ہوگا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا لیکن یہی اہلِ طائف جب مسلمان ہو گئے تو آپؐ نے انھیں معاف فرما دیا۔ اور یہ لیجیے حسنِ سلوک کا سب سے بڑا کارنامہ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ کے ہر دَور میں سب سے اُونچی مثال ہے۔ مکّہ والوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو طرح طرح کے مصائب و آلام اور ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ آپؐ کو جسمانی، رُوحانی اور عقیدے کے سلسلے میں ہر طرح کی ایذا پہنچائی۔ آپؐ کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلائیں، آپؐ کی اور آپؐ کے ساتھیوں کی شان میں گستاخیاں کیں، مقاطعہ کیا، شعب ابی طالب میں محصور کیا، راستے میں کانٹے بچھائے نماز کی حالت میں آپؐ پر اُونٹ کی اوجھ ڈالی، آپؐ کا مختلف طریقوں سے مذاق اُڑایا،

اور یہ سلسلہ ایک دو دن یا ایک دو سال نہیں تیرہ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔
پھر ان لوگوں نے آپؐ کے خلاف جنگ کی، آپؐ کے قریبی عزیزوں اور دوستوں کو قتل کیا، یہاں تک کہ آپؐ کو ان پر فتح حاصل ہوگئی۔ اب ایک موقع آتا ہے کہ یہی لوگ کعبہ کے ماحول میں آپؐ کے حضور ذلیل و خوار کھڑے ہیں اور ان میں کسی قسم کی مدافعت کا یارا نہیں ہے گویا انتقام کا وقت آگیا ہے۔ نہیں انتقام کیسا! اب انتقام کی بات نہ کیجیے، معاملہ اس سے آگے بڑھ کر قانونی سزا کا ہے۔ ایسی قانونی سزا جو ان تمام مظالم و مصائب، جبرہ دستیوں اور ستم شعاریوں کا پورا پورا جواب ہونا چاہیے جو اس طویل مدت تک جاری رہی تھیں۔ آپؐ ان لوگوں سے دریافت فرماتے ہیں: مَا ذَا تَرَوْنَ اِنِّیْ فَاعِلٌ بِکُمْ "کیا خیال ہے میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا"۔

انھیں اپنی تمام کارستانیاں اچھی طرح یاد ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے لیکن ساتھ ہی انھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا خیال آتا ہے۔ آپؐ کے اخلاقِ فاضلہ کی مثالیں ان کے سامنے ہیں اس لیے کہتے ہیں: اَخٌ کَرِیْمٌ وَابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ "آپ مہربان بھائی بھی ہیں اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں"۔

اب اہلِ مکہ اس انتظار میں ہیں کہ آپؐ کی طرف سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے ویسے یہ ایک حقیقتِ واقعی ہے کہ اس وقت اگر آپؐ ان سب کے قتل کا حکم صادر فرما دیتے تو مؤرخین میں سے ایک بھی دوست یا دشمن ایسا نہ ہوتا جو اس معاملہ میں آپؐ کے خلاف ایک لفظ بھی لکھتا۔ صورتِ حال ہی ایسی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان ہی نرالی ہے، آپؐ کا حکم اس موقع پر اتنا مختلف اور اتنا حیرت انگیز تھا کہ کسی کو اس کی توقع نہ ہوسکتی تھی اتنا انوکھا کہ جس نے اس دَور کو بھی حواس باختہ کر دیا تھا اور آنے والے اَدوار میں بھی لوگ انگشت دردہاں اور

سرِ بگریباں ہیں۔ آپؐ نے روحی فداہٗ ان سے فرمایا: اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ "جاؤ تم آزاد ہو۔"

اس وقت مجھے سب سے زیادہ جو بات کھل رہی ہے یہ ہے کہ مَیں آپؐ کے خُلقِ عظیم کے اس اقدام کو انتہائی اختصار سے پیش کر رہا ہوں۔ میری خواہش تھی کہ صرف آپؐ کے اس موقف کو بیان کرنے کے لیے کم از کم ایک پُورا باب وقف کرتا تاکہ میں اس کے تمام پہلو کماحقہٗ، آپ کے سامنے اُجاگر کر سکتا۔ درحقیقت اس موقع پر آپؐ نے جو مثال قائم کی ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اس کے لیے دس ہزار پہلوانوں کی قوت درکار ہے۔

مَیں اکثر حیران ہوتا ہوں کہ ہمارے سیرت نگاروں میں سے متاخرین نے آپ کے معجزات زیادہ سے زیادہ دکھانے بلکہ بعض ایسے معجزات بھی جن کا وجود ہی نہیں آپؐ کی طرف منسُوب کرنے کی کوشش کیوں اور کس لیے کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلُو اور آپؐ کی سیرت کا ہر منظر و موقف اپنی جگہ خود بہت بڑا معجزہ ہے۔

معجزہ آخر ہوتا کیا ہے؟ کیا ہر وہ کام یا اقدام جو دُوسرے نہ کر سکیں معجزہ نہیں ہوتا۔ آپؐ کی صداقت و دیانت خود بے مثال معجزہ تھی۔ میں جگہ کی قلت کے باعث اس وقت آپ کے سامنے زیادہ مثالیں پیش نہیں کر سکوں گا۔ یہاں میں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک ایسا واقعہ جس پر سے میں اپنے مطالعہ کے دوران سینکڑوں مرتبہ گزر گیا اور ہر دفعہ میں اسے اس انداز میں پڑھتا رہا جیسے کوئی عام سا واقعہ ہو۔ لیکن پھر ایک دن اچانک میں نے اس پر غور کیا تو مجھے محسوس ہُوا کہ یہ تو عجوبہ روزگار ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک میں اس قسم کے حیرت انگیز واقعات بے شمار ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب آپؐ نے جانبِ مدینہ ہجرت فرمائی تھی اور اہلِ مکّہ کی امانتیں لوٹانے کی غرض سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ

چھوڑ گئے تھے۔ آپ نے کبھی غور فرمایا یہ امانتوں کا قصّہ کیا ہے۔ سُنیے! امانتیں آپؐ مُشرکوں کو واپس لوٹا رہے تھے مسلمانوں کو نہیں۔ کیونکہ جس وقت آپؐ نے ہجرت فرمائی ہے وہاں ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ آپؐ مکّہ سے ہجرت فرمانے والے آخری شخص تھے اور آخری مسلمان کے ہجرت کرنے تک آپؐ وہاں اس طرح قیام فرما رہے جس طرح ڈوبتی ہُوئی کشتی کا ناخُدا آخری وقت تک کشتی میں رہتا ہے، اور اس وقت تک نہیں اُترتا جب تک آخری سواری بھی اُتر کر کسی محفوظ مقام تک نہ پہنچ جائے۔ میرا مقصد اس وقت آپؐ کے بے مثال محاسن میں سے اس وصف کو بیان کرنا نہ تھا یہ ذِکر تو ضمناً آگیا۔ امانتوں کا قصّہ یہ ہے کہ:

باوجود اس شدید عداوت اور مخاصمت کے جو مشرکین قریش کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی۔ اپنی امانتیں محفوظ رکھنے کے لیے یہ لوگ پُورے مکّہ میں آپؐ کے سوا کسی دُوسرے شخص پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ اب آپ ذرا تصور کیجیے کہ دو مختلف گروہ ہیں جو ایک دُوسرے کے جانی دشمن ہیں دونوں گروہوں میں ہر قسم کی جنگ یعنی زبان، ہاتھ، اصُول اور عقیدے کی جنگ مسلسل جاری ہے اس کے باوجود ایک دھڑے والے اپنا مال و نقد دشمن دھڑے کے ایک شخص کے پاس امانت رکھتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی اس قسم کا عجیب واقعہ سُنا ہے؟ اور کبھی اس انداز میں غور کیا ہے کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت و دیانت خود ایک معجزہ نہ ہوتی اور اور اس کے بارے میں شک کرنا محالات میں سے نہ ہوتا تو یہ لوگ دشمن ہوتے ہُوئے اپنی امانتیں آپؐ کے پاس کیسے محفوظ رکھ سکتے تھے؟

یہ تھے جنابِ رسالت مآب حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم

اور سُنیے!

غزوۂ بدر[1] کے دن جس وقت آپ لڑائی سے پہلے صفیں ترتیب دے رہے تھے آپؐ کے دست مبارک میں لکڑی کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپؐ نے حضرت سوّاد بن غزیہ کو صف سے کچھ آگے بڑھا ہُوا دیکھا، آپؐ نے لکڑی سے ان کے پیٹ پر ٹھونکا دیا اور فرمایا سوّاد سیدھے ہو جاؤ۔ حضرت سوّادؓ نے عرض کیا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوْجَعْتَنِیْ، وَقَدْ بَعَثَکَ اللّٰہُ بِالْحَقِّ وَالْعَدْلِ = "یارسول اللہ! آپ نے مجھے دُکھ پہنچایا ہے حالانکہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے حق وانصاف دے کر بھیجا ہے"۔

اب ذرا آپ اس موقع ومنظر کا تصور کیجیے! ایک عام سپاہی فوج کے قائدِ اعلیٰ کے مُنہ آرہا ہے اور ایسے بے باکانہ انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، سالارِ اعلیٰ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔؟

اسے سزا دے گا!؟ یا مُنہ پھیر لے گا!؟ یا اگر بہت ہی فراخ حوصلہ اور شریف الطبع ہُوا تو درگزر سے کام لے کر معاف کر دے گا؟ یا اگر حد سے ہی بڑھ جائے تو اس سے کہے گا بھئی معاف کر دو میں تم سے معذرت کرتا ہوں۔ کیا ان کے علاوہ کوئی اور

---

[1] غزوۂ بدر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی قائدِ اعلیٰ تھے اور جنگ کی پوری باگ ڈور آپؐ کے دستِ مبارک میں تھی۔ یہ غزوہ ۲ھ مطابق ۶۲۴ء میں ہُوا تھا۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں اسلام نے اپنے دشمنوں سے حساب چکایا۔ اس غزوہ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے حوصلے بڑھے اور ان کا بول بالا ہُوا ——— یہ لڑائی ماہِ رمضان میں ۱۷ تاریخ کو ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے لڑنے والے ۳۱۳ تھے اور مشرکین کی تعداد ۹۵۰ تھی۔ اس کے باوجود فتح مسلمانوں کو ہُوئی اور قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ ارشادِ ربانی ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۲۴۹ البقرہ۔ "بارہا ایسا ہُوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بہت بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے"۔ (مصنف)

صورت بھی ممکن ہے؟

لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ایک ایسا اقدام فرمایا جو کوئی دُوسرا نہیں کر سکتا بلکہ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ آپؐ نے ان کے آگے اپنا بطنِ مبارک کھول دیا اور وہی لکڑی اسے تھما دی اور فرمایا: اِسْتَقِدْ! یعنی بدلہ لے لو!

ملاحظہ کیجیے، سیّد البشرؐ خود کو قصاص کے لیے پیش فرما رہے ہیں۔ یہ تھے جناب خیر الانام حضرت محمّد روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کی سیرتِ بے مثال اس اعتبار سے بھی بہت بڑا معجزہ ہے کہ دنیا کے تمام عظیم انسان آپؐ کے سامنے اس لحاظ سے عاجز و درماندہ ہیں کہ دنیا والوں کے لیے اپنی کوئی ایسی سیرت پیش کر سکیں جو عزت و عظمت، جسمانی قوت، تعمیر و تخلیق کی باقاعدگی، عالی حوصلہ اور بُردبار ہونے، غرض کہ زندگی کے ہر زاویے اور پہلو کے اعتبار سے آپؐ کی سیرت سے مشابہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نہ تو فتح و کامرانی سے متاثر ہو کر فخر و مباہات کا انداز اختیار فرمایا کرتے تھے اور نہ شکست و ہزیمت آپ کو برافروختہ اور بے حوصلہ کر سکتی تھی۔

دُنیا کے بڑوں میں سے کوئی ایک بھی گھمسان کی خونریز جنگوں میں آپؐ کی پامردی اور ثابت قدمی کی نظیر پیش نہ کر سکا۔ صحابہ کرام میں سے بہادر ترین افراد بھی آپؐ کا سہارا ڈھونڈا کرتے تھے۔ اسی طرح شجاعت و بسالت میں اور بڑے بڑے چوٹی کے سُورماؤں کو زیر کر لینے میں یا فقراء و مساکین کے لیے انکسار اور بیواؤں اور بوڑھی عورتوں کی خدمت اور خبرگیری میں بھی کوئی عظیم سے عظیم انسان آپؐ کی ہمسری نہ کر سکا۔

حق و صداقت میں آپؐ کی ثابت قدمی اور پیغامِ الٰہی کو خلوص و صداقت سے پہنچانے میں بھی کوئی دُوسرا آپؐ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ آپؐ نے وہ آیات بھی بعینہٖ بیان

کردیں جو آپؐ کی کسی فروگزاشت کے بارے میں تھیں یا جس میں آپ کو تنبیہہ کی گئی تھی۔
اسی طرح ایفائے عہد اور زبان کی پاسداری میں بھی آپ کا کوئی سہیم و عدیل نہیں ہے ایفائے عہد کے سلسلہ میں خواہ کتنی ہی مشقت و مصیبت کیوں نہ اٹھانا پڑے اور خواہ وہ عہد ذاتی معاملات سے متعلق ہو یا کاروبارِ مملکت سے، آپؐ اسے بہرحال نباہتے تھے۔ آپؐ کے نفاستِ ذوق اور لطافتِ احساس کا یہ عالم ہے کہ آپؐ ہی وہ پہلی برگزیدہ ہستی ہیں جس نے کھانے پینے کے آداب اور لطافت و نظافت کے طور طریقے دنیا کو سکھلائے۔

اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو تعلیم دینے کے انداز یا ان کے ساتھ کام کرنے کی وضع میں بھی دُنیا کا کوئی بڑا آدمی آپ جیسی مثال پیش نہ کر سکا۔ آپؐ عام لوگوں کی سی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ صحابہ کرام سے مشورہ بھی لیتے تھے اور ان کی باتیں بھی سُنتے تھے۔ مجلس میں ان سے اس طرح غیر نمایاں رہتے تھے کہ سب سے آخر میں جہاں جگہ خالی نظر آتی تشریف فرما ہو جاتے۔ اکثر وہ لوگ جو آپؐ کی زیارت کے لیے باہر سے آیا کرتے تھے مجلس میں ایک ایک شخص کا چہرہ دیکھ کر آپؐ کی تلاش کیا کرتے اور نہ پہچان پانے پر پُوچھا کرتے تھے کہ آپ لوگوں میں سرورِ کائنات جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون صاحب ہیں۔
آنے والوں کے دریافت کرنے کا سبب یہ ہُوا کرتا تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نشست و برخاست، وضع قطع اور لباس ہر بات میں بالکل اپنے صحابہ کرام ہی کی طرح نظر آتے تھے۔

اسی طرح خواتین کے ساتھ آپؐ کے مہذّب اور حیا دارانہ سلوک، گھر کے اندر اپنے اہل و عیال کے ساتھ اخلاق و آداب اور طرزِ معاشرت، صاف اور سچے مزاج کے انداز اور کشادہ دلی میں بھی کوئی دُوسرا عظیم شخص آپ کی برابری نہ کر سکا درا صل

آپؐ کے انکسار اور آپ کی اس کوشش میں بھی کہ آپ کو بادشاہ نہ سمجھا جائے اِک شانِ دلرُبائی تھی۔

آپؐ نے اپنے صحابہ کرام کو اپنی تعظیم کے لیے کھڑا ہونے سے منع فرمار کھا تھا آپؐ اپنے گھر کے سب کام بنفسِ نفیس خود سرانجام دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے جُوتے بھی خود ہی سی لیا کرتے تھے۔

شاہِ کونین نے پُوری زندگی فقیرانہ بسر کی ہے حصولِ ثروت سے عجز کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف مال و دولت سے بے نیازی کی بنا پر۔ اگر آپؐ چاہتے تو آپؐ کا محل قیصر و کسریٰ کے ایوان سے بھی زیادہ شاندار ہوتا لیکن آپؐ نے تو آخرت کو پسند فرما لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ازواجِ مطہرات رضوان اللہ علیہن کے حجرے یعنی کُل نو اُمّہات المؤمنین کے رہنے کے لیے جگہ کی لمبائی پچیس[۱] میٹر سے زیادہ نہ تھی۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رہائش گاہ صرف ایک کمرے پر مشتمل تھی جو کچی اینٹوں اور گارے سے بنا ہُوا تھا جس میں جگہ اتنی تنگ تھی کہ بیک وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آرام فرمانے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز ادا کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی لیے جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں تشریف لے جاتے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاؤں ایک طرف کر دیتے تاکہ آپ سجدہ فرما سکیں۔ اور آپ کے خورد و نوش کی کیفیت کیا تھی۔ اُمُ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ اکثر مہینہ مہینہ دو دو مہینے اس طرح گزر جاتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آگ ہی نہ جلتی تھی کہ روٹی پکائی جا سکے۔ حاضرین نے دریافت کیا پھر آپ سب کیا تناول فرماتے تھے۔ فرمایا۔ کھجور اور پانی۔ یہ تھا خاندانِ نبوت علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کا معمول

---

[۱] نو ازواجِ مطہرات رضوان اللہ علیہن کے حجرے اس احاطہ پاک میں واقع تھے جہاں اب روضہ اطہر اور گنبدِ خضرا واقع ہے اور اس کی پیمائش کل ۲۵ میٹر ہے۔ (مصنف)

خورد و نوش ۔

بعینہٖ فصاحتِ نطق و بلاغت بیان میں آپؐ کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا۔ یقیناً آپؐ دُنیا کے تمام بولنے والوں اور صلاحیتِ اظہار و بیان رکھنے والوں میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم۔ یہ تمام باتیں وہ ہیں جو خود معجزہ ہیں اور یہ چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے ارفع و اعلیٰ رسالت اور منصبِ ختمِ نبوّت کے لیے آپؐ کا انتخاب صرف اسی بنا پر کیا تھا کہ اس نے آپؐ کی تکوین و تخلیق اس انداز میں فرمائی تھی کہ پوری بنی نوع انسان میں صرف آپؐ ہی فردِ وحید اور یکتا و یگانہ تھے۔ آپ کے محاسن و مکارم عالیہ کی نظیر و مثال کسی دُوسرے شخص میں ملنا ممکن ہی نہیں ہے صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ و اہلِ بیتہٖ و سلّم سلاماً طیّباً مبارکاً کما تحب وترضٰی = وَاللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ الانعام (۱۲۴) "یہ بات کہ کون شخص اللہ کے اعزاز و اکرام رسالت و نبوت کا حقدار ہے اور اس سے کس طرح کام لینا ہے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔"

ایمان بالکتب

○

- یقیناً کسی انسان میں یہ طاقت نہیں کہ قرآن بنا سکے۔ اور یہ بات بھی ناممکن ہے کہ قرآن جیسا کلام اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور عطا کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ آپ تمام انسانوں کو چیلنج دیں کہ وہ قرآن کے مانند ایک ہی سُورت بنا کر لائیں اور یہ چیلنج آج تک قائم ہے۔
- قرآن مجید۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔
- اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۱۸ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی ۱۹ الاعلیٰ۔

○

قرآن مجید آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے

جو لوگ یہ اِدّعا کرتے ہیں کہ قرآن مجید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف و تصنیف ہے وہ ایک طرف تو آپؐ پر نبی نہ ہونے کا الزام عائد کرنے کی گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور دوسری طرف گویا آپ کو خُدا بنا رہے ہیں۔ حالانکہ ایک مسلمان شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اللہ کے رسُول ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن بنا لینا انسان کی طاقت و وُسعت سے باہر ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے آسکے۔ اس لیے جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف کیا ہے وہ آنحضرت کے لیے صفتِ الوھیت ثابت کر رہا ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے۔

تو مجھے کوئی ایسا شخص بتائیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اُمّی ہو، پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو، زندگی بھر کبھی مدرسے نہ گیا ہو، اس کے شہر میں مدرسہ ہی نہ ہو بلکہ وہ رہنے والا ہی ایسی جگہ کا ہو جو مہذب شہروں کی مانند شہر ہی نہ ہو، ایک چھوٹا سا قصبہ ہو جو سیاہ پہاڑوں کے دامن اور ریگستانوں کے پردے میں اس طرح چھپا ہُوا ہو کہ نہ تو اسے روم، قسطنطنیہ اور ایران والے جانتے ہوں اور نہ اس قصبے کا کوئی باشندہ یونان و روم کے فلسفہ سے واقف ہو اور نہ ہند و ایران کے ادب سے۔

یہی نہیں وہاں کوئی عالم یا محقق تو کُجا اس زمانے کے کسی چھوٹے دانشو

کے برابر پڑھا ہوا کوئی فرد بھی موجود نہ ہو، اور وہ شخص خود بھی اس قصبہ سے نکل کر کہیں گیا ہو تو اسی جیسے کسی چھوٹے قصبے میں یا اس سے ذرا بڑے، مثلاً شام کے علاقہ حوران کے ایک قصبے "بُصریٰ" میں اور وہاں بھی اس کا قیام زیادہ سے زیادہ ایک دو یا چند گنتی کے دن رہا ہو۔

آپ بتائیے کیا ایسے شخص کے لیے قرآن جیسا معجز کلام تخلیق کر لینا ممکن ہے؟ آج اقوام عالم کے ہر دور کی تاریخ آپ کے سامنے ہے اس میں بڑے بڑے جینئیس اور نابغۂ روزگار افراد کے حالات موجود ہیں۔ کیا دُنیا میں زمانے کے کسی دَور میں کبھی کوئی ایسا عجیب اتفاق وقوع میں آیا؟

درست ہے "موزارت" نے دس سال سے بھی کم عمری کے دَور میں موسیقی کی ایک صنف ترتیب دے لی تھی اسی طرح "بشّار" نے بھی اسی عمر میں شعر کہہ لیے تھے۔ یا "جین ائر" کی مؤلفہ (شارلٹ برونٹے) اور اس کی بہن (ایملی برونٹے) جس نے (وودرنگ ہائٹس) تصنیف کیا ہے یہ دونوں بہنیں اچانک نابغۂ روزگار بن گئی تھیں۔ اسی طرح شکسپیئر جس نے کافی ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ بھی اپنے وقت کے بڑے ادیبوں میں سے نہ تھا اور نہ زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ یہ سب باتیں ممکن ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی گمنام نوجوان جینئیس ہو اور ایک بے نظیر اور حیرت انگیز ناول لکھ ڈالے یا کوئی نیا سائنسی نظریہ دریافت کرے۔ جینئیس ہونا پڑھے لکھے لوگوں اور یونیورسٹیوں کے سند یافتہ افراد پر ہی موقوف نہیں ہے اکثر جینئیسز ایسی جگہ پیدا ہو جاتے ہیں جہاں ان کے ہونے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سائنس، ادب یا فنون کے سلسلے میں تاریخ جن جینئیسز سے واقف ہے وہ سب کے سب اپنے زمانے پر زیادہ سے زیادہ ایک صدی کی سبقت لے گئے ہوں گے یا اپنے ہم عصروں سے پچاس فی صد یا سو فیصد بڑھ گئے ہوں گے۔ بہرحال ان کی سبقت لے جانے کی ایک

حد ہے اور یہ سبقت سمجھ میں آسکتی ہے۔

لیکن پوری تاریخ میں ایک بھی شخص ایسا نہ ملے گا جس کے حالات وظروف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سے ہوں اور اس نے کوئی ایسی کتاب مرتب کی ہو جو اپنے ادبی اسلوب کے لحاظ سے حسن وجمال کا سب سے شاندار مُرقّع ہے، قانون سازی کے میدان میں بھی معراجِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے اور الٰہیات اور اخبارِ غیبیہ کے سلسلے میں ایسی باتیں بیان کرتی ہے جو کوئی انسان نہ جانتا ہو اور نہ بطور خود اپنی انسانی عقل کے ذریعہ دریافت کرسکتا ہو، اس کتاب نے سائنسی علوم کے ضمن میں ایسے قوانین اور بنیادی امور بتا دیے تھے جو اس زمانے میں یا اس سے متّصل صدی میں بلکہ اس کے بعد آنے والی دس صدیوں میں بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ اس میں ایسے قوانینِ طبعیہ کی طرف بھی رہنمائی موجود ہے جو تیرہ سو سال کے بعد منکشف ہوئے ہیں بلکہ ایسے قوانین و نوامیس کی طرف بھی اشارے کر دیے گئے ہیں جو ابھی تک منکشف نہیں ہوئے۔

قرآن مجید وہ کتاب ہے جس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پورے عالَم کو چیلنج دے دیں اور آپ نے جن وانس سب کو دعوتِ مقابلہ دی کہ اس کتاب کی مانند دس سورتیں یا صرف ایک سورت ہی بنالائیں۔ لیکن سب عاجز آگئے۔ اور یہ چیلنج آج تک قائم ہے۔ اور جن وانس آج بھی اسی طرح عاجز ودرماندہ ہیں۔

قرآن مجید کا اعجاز ایک حقیقت واقعہ ہے لیکن آپ اس پر علمائے بلاغت کے انداز میں بحث کرتے ہوئے خاص خاص مواقعِ اعجاز کی نشاندہی نہ کیجیے۔ دراصل یہ اعجاز صرف اس کے الفاظ میں یا اُمورِ غیبیہ کی اطّلاع دینے یا اس کے کسی ایک حصے یا پہلو میں نہیں ہے وہ تو بتمام وکمال مجسمہ حسن وجمال ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہر دیکھنے والا اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے اپنے مخصوص انداز میں اس کا جمال

دیکھتا ہے۔

آپ نے انسانی شخصیت کی تحقیق کرنے والے شعبے کے اس سربراہ کا واقعہ سنا ہوگا جو قرآن مجید کی یہ آیت : بَلٰی قَادِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ۝۴ القیامہ۔ "ہم تو ان کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔" سن کر مسلمان ہوگیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ ہاتھ کے پوروں کا ہی خاص طور پر کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ آخر اس میں کون سی خصوصیت ہے۔ ظاہر ہے اس میں انگلیوں کے مخصوص نشانات ہیں اور یہ قدرتِ الٰہی کا ایک معجزہ ہے کہ روئے زمین پر دو شخص بھی ایسے نہ ملیں گے جن کی انگلیوں کے نشانات ایک جیسے ہوں۔ واقعی یہ ایک عجیب کرشمہ ہے لیکن ہم پر اس کا انکشاف حال ہی میں ہوا ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد کی دس صدیوں میں بھی اس عجیب و غریب حقیقت سے کوئی شخص واقف نہ تھا۔

یہی وہ امور ہیں جن کی وجہ سے یہ بات ماننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور خود اسی نے آپ پر نازل فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں اور ہمیشہ لوگ ایسے حیرت انگیز نکتے قرآن مجید میں دریافت کرتے رہیں گے۔ جب بھی کوئی پڑھنے والا اسے بغور پڑھے گا تو اس کے اعجاز کا کوئی ایسا اچھوتا پہلو اس کے سامنے آئے گا جو دوسروں کو نظر نہ آسکا ہوگا۔ اس لیے کہ اس کے عجائبات نہ ختم ہونے والے اور ابدی ہیں۔

اسی بنا پر ضروری ہے کہ ہر دور میں قرآن کی جدید تفسیر اس انداز سے کی جائے کہ مختلف شعبہ ہائے علوم سے تعلق رکھنے والے متخصصین مثلاً ماہرین علم الحقوق، علم الفلکیات، علم النفس، علم الاجتماع اور ادباء و مؤرخین اپنے اپنے علم کے زاویۂ خیال اور اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے قرآن مجید کی تفسیر کریں۔ ان

سب لوگوں کو قرآن حکیم میں اپنے اپنے مخصوص علوم سے متعلق بہت وسیع میدان ملے گا اور اپنے اپنے علم اور تخصص کے اعتبار سے اس بات کی دلیل ملے گی کہ قرآن درحقیقت کلام اللہ ہے۔

سب رسولوں کے معجزے ایک بار ظہور میں آئے اور ختم ہو گئے۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ایسا ابدی اور دوامی ہے جو روزانہ دہرایا جاتا ہے۔ دوسرے تمام رسولوں کے معجزے جو اُن کی رسالت کا ثبوت پیش کرنے کے لیے انھیں دیے گئے ان کی رسالت کا جُزو نہ تھے، خارجی امور تھے۔ لیکن جنابِ خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ایسا معجزہ ہے جو بذاتِ خود آپؐ کی رسالت کا پیغام ہے۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ اخوانہ من الانبیاء والمرسلین۔

آسمانی کتابوں پر ایمان

ہم مسلمان قرآنِ حکیم پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور ان تمام باقی کتابوں پر بھی جن کی اطّلاع ہمیں قرآن کریم نے دی ہے۔ یہ کتابیں صحفِ ابراہیم وموسیٰ علیہما السلام یعنی توراۃ[۱] اور زبورِ[۲] داؤد علیہ السّلام اور انجیلِ[۳] عیسیٰ علیہ السّلام ہیں۔

اور قرآن مجید ان سب پر حادی اور وہ میزان ہے جس کے ذریعہ ان پہلی آسمانی کُتب کے تحریف شدہ اور صحیح حصّہ کا علم ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ ۔ المائدہ (۴۸) "پھر اے محمدؐ! ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔"

اس کے معنٰی یہ ہوئے کہ ان کتابوں کے سلسلے میں جو کچھ ہمیں قرآن کریم نے بتایا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اور جو شخص ان کتابوں کے اس حصہ کا انکار کرے گا

جو قرآن میں مذکور ہے ہم اسے کافر قرار دیں گے۔ اسی طرح ان کتابوں کا جو حصہ قرآن کریم میں دی گئی اطلاعات کے مطابق ہوگا اس کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ اس میں تحریف نہیں ہوئی وہ صحیح حالت میں باقی ہے اور ان کتابوں میں جو باتیں قرآن مجید کے خلاف نظر آئیں گی اس کے متعلق ہم یقین کریں گے کہ وُہ اصلی حالت میں نہیں ہیں تحریف شُدہ ہیں۔

صحفِ ابراہیم

اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ جو کچھ صحفِ ابراہیم میں تھا وہی صحفِ موسےٰ میں دہرایا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی ۳۶ وَاِبْرَاهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی ۳۷ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۳۸ الی آخر الآیات۔ النجم "کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسٰی کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" ان آیات کے آخر تک جو مضمون ہے وہ صحف ابراہیم اور صحف موسٰی میں بیان ہو چکا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کی اس آیت میں بھی صحفِ ابراہیم و صحفِ موسٰی میں مذکور تعلیمات کا حوالہ ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی ۱۴ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی ۱۵ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۱۶ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ۱۷ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۱۸ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی ۱۹ الاعلیٰ "فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے ربّ کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی۔ مگر تم لوگ دُنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ یہی بات پہلے آئے ہُوئے صحیفوں میں کہی گئی تھی۔ ابراہیم اور موسٰی کے صحیفوں میں۔

توراۃ

توراۃ بھی اللہ تعالےٰ کی کتاب ہے اس میں انسانوں کے لیے ہدایت اور اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ ارشاد ہے: وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ج۔ المائدہ (۴۴) "اور یہ تمھیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا حکم لکھا ہوا ہے"۔ ۔ ۔ ۔ "ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی"۔

توراۃ کے احکام کے بارے میں ہمیں جو اطلاع دی گئی ہے اس سلسلے میں یہ آیت بھی ہے: وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط المائدہ (۴۵) تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ"۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ توراۃ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت بھی تھی۔ ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۔ الاعراف (۱۵۷) جو اس پیغمبر نبی اُمّی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات میں لکھا ہوا ملتا ہے"۔ نیز اس میں مومنین کی تعریف کی گئی ہے ملاحظہ ہو: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ج۔ الفتح (۲۹) "محمد اللہ کے

رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفّار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انھیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں "۔

زبور

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ ۱۶۳ النساء۔ "ہم نے داؤد کو زبور دی"۔ اور یہ بھی اطلاع دی ہے کہ زبور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں صالحین کو زمین کا وارث بنانے کا ذکر بھی ہے۔ ارشاد ہے: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ ۱۰۵ الانبیاء: "اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے"۔ اس آیت میں زمین سے مراد جنّت ہے کیونکہ اس دوسری آیت میں جنتیوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ ج الزمر (۷۴) "اور وہ کہیں گے شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا اب ہم جنّت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں"۔

انجیل

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ - المائدہ (۴۶) "اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی"۔ قرآن مجید میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ اصل انجیل

جو نازل کی گئی تھی اس میں شریعت کے قانونی احکام بھی موجود تھے۔ ارشاد ہے:۔ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ط المائدہ (۴۷) "ہمارا حکم تھا کہ اہلِ انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے۔" اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ انجیل میں توراۃ کے سخت احکام کو معتدل بنایا گیا تھا۔ ارشاد ہے:۔ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۔ آلِ عمران (۵۰) "اور میں (حضرت عیسٰی علیہ السلام) اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو توراۃ میں سے اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔"

اور انجیل میں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

اور ہم مسلمان ان تمام صحیفوں پر اور توراۃ، زبور اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ اسی طرح تمام انبیاء کی جن میں حضرت ابراہیم، حضرت موسٰی، حضرت داؤد اور حضرت عیسٰے علیہم السلام شامل ہیں، تعظیم و تکریم کرتے ہیں

○

خاتمۂ کتاب

○

- مُسلمان کسی معاملہ پر مناظرہ سے نہ تو ڈرتا ہے اور نہ گریزاں ہے۔ اسلام میں ہر بات کے لیے حُجّت، دلیل اور بُرہان موجود ہے۔
- بعینہٖ اسلام اُن لوگوں سے بھی جو اسلام کے خلاف کسی بات کا ادّعا کرتے ہیں دلیل و ثبوت کا مُطالبہ کرتا ہے:

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۝۱۱۱- البقرہ-

○

یہ تھے اسلام کے بنیادی عقائد

جو شخص ان باتوں پر ایمان لے آئے اور ان کے علاوہ بھی آسمان و زمین اور تخلیقِ انسان کے سلسلے میں جو کچھ قرآن مجید نے بتایا ہے اس پر اعتقاد رکھے۔ اور اس اعتقاد کے اثرات اس کے عمل میں بھی ظاہر ہونے لگیں۔ وہ شخص ایسا کامل مسلمان ہے جو قرآن کو صحیح اور حق بھی سمجھتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے، صرف بے سوچے سمجھے قرآن کی تلاوت کر لینے اور عمل کے بغیر محض اس کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے اور گا کر پڑھنے کو کافی خیال نہیں کرتا۔ بلکہ اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا کر اس کے احکام کے مطابق حلال و حرام کا فیصلہ کرتا ہے، فرائض و واجبات پر عمل کرتا ہے اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان باتوں سے باز رہتا ہے۔

دُنیا کے دوسرے مذاہب اگر صرف عبادت گاہوں تک محدود ہیں تو کم از کم اسلام ایک ایسا دین ہے جو صرف مسجد کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ دین مسجد، گھر، بازار، ایوانِ حکومت اور حالاتِ جنگ و صلح سب کے لیے ہے۔ اسلام ہر وقت مسلمان کے ساتھ رہتا ہے اور اسے بتاتا رہتا ہے کہ کیا چیز اس کے لیے مباح ہے اور کون سی حرام ہے۔ مسلمان خواہ تنہا ہو یا اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ، تجارت کر رہا ہو یا کوئی اور کام اسلام اس کا رہبر و رہنما ہے۔ مسلمان کا کوئی اقدام اسلام کے احکامِ خمسہ (جن میں سے چار واجب[1] و مندوب[2]۔ اور حرام[3] و مکروہ[4] ہیں اور پانچواں اباحتِ اصلیہ ہے) سے باہر نہیں ہوگا (پہلے چار اقسام کے احکام بہ تعیین و تفصیل بیان کر دیے گئے ہیں اور ان کے علاوہ سب اشیاء مباح قرار دے دی

گئی ہیں)۔

دُوسرے مذاہب کے نقطۂ نگاہ سے دین صرف عبادات کا نام ہے۔ ان میں دین کا سیاست اور علم وسائنس سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام عبادت بھی ہے اور شہری، تعزیری اور بین الاقوامی قانون بھی۔ دفتری نظام بھی ہے اور فطری مذہب بھی۔ علم وسائنس بھی ہے اور سیاست بھی۔ عمل بھی ہے اور جہاد بھی۔ فقہ کی کسی کتاب کو کھول کر دیکھ لیجیے اس کی فہرست میں آپ کو یہ تمام پہلو واضح طور پر ملیں گے۔

دُوسرے مذاہب میں اگر عبادت صرف نماز ہے تو اسلام میں صرف نماز روزہ ہی عبادت نہیں ہے بلکہ انسانوں کو فائدہ پہنچانے والا ہر کام اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت سے کیا جائے عبادت ہے۔

اگر آپ مذاہبِ عالم میں دین عبادات اور دین علم وسائنس کے نقطۂ نگاہ سے تفریق کریں گے تو اسلام علم وسائنس کا دین ہے۔ قرآن مجید میں سب سے پہلے جو لفظ نازل ہُوا وہ "اِقْرَأْ" (پڑھ) تھا۔ "قاتل" (جنگ کرو) یا "اِجْمَعِ الْمَالَ" (مال جمع کرو) یا "اِزْهَدْ فِی الدُّنْیَا" (دنیا چھوڑ دو) نہیں تھا۔ پھر قرآن مجید میں پہلے "اقرأ" نازل ہُوا۔ اس کے بعد "علم" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر مال و قوت یا جاہ و مرتبہ عطا فرمانے کا احسان کہیں نہیں جتایا البتہ علم سکھانے کا احسان جتایا ہے۔

پھر ہر وہ علم جس کی اسلامی معاشرے کو ضرورت ہو اس کا سیکھنا ازرُوئے اسلام ہر مسلمان پر جو سیکھنے کی قدرت رکھتا ہو فرض کفایہ ہے۔ غور کیجیے کیا دُنیا میں اسلام کے علاوہ کوئی دین ایسا ہے جو کیمسٹری، طب، ہوابازی وغیرہ کا سیکھنا دینی فریضہ قرار دیتا ہو۔

اسلام غنا اور ثروت کا دین ہے۔ قرآن مجید میں مال کو خیر کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ العادیات ۸ "اور وہ (انسان) مال و دولت کی محبت میں بُری طرح مبتلا ہے"۔ اسی طرح وصیت کے بیان میں کہا گیا ہے: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ البقرہ (۱۸۰) "اور اگر وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو"۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان غنی اور مال دار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ مال جائز اور حلال ذرائع سے حاصل کیا جائے۔ اور مال و دولت مسلمان کے ہاتھ میں ہو دل میں نہ گھس بیٹھے۔ مال اور کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ انسان مسلمان ہونے کی حیثیت سے محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ کا عبد ہے اور اسی ناطے مسلمان اس پوری کائنات کا مالک ہے اور اس پر اسی طرح اختیار رکھتا ہے جس طرح کوئی مالک و آقا اپنی مملوک و مقبوض چیز پر اختیار رکھتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اشیائے موجودات میں جو فائدہ چھپا رکھا ہے مسلمان اسے تحقیق و اکتشاف کے ذریعے حاصل کرتا ہے لیکن ان اشیاء کی اصل حیثیت برقرار رکھتا ہے ذاتی طور پر ان اشیاء کو عظیم نہیں مانتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے یہ خود ان کا عبد بن جائے گا اور ان کو اللہ تعالےٰ کا شریک مان کر ان کی بھی عبادت کرنے لگے گا۔ گویا شرک کا مرتکب ہوگا۔

مال کو اللہ تعالیٰ نے فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اب اگر آپ اسے جمع کر کے چھپا دیتے ہیں اور پھر اس کی حفاظت کرتے ہیں تو آپ نے اس سے نفع نہیں اٹھایا بلکہ آپ اس کے غلام اور عبد ہو گئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ۔ "مال و دولت کا غلام ہلاک ہو گیا"۔

اسی طرح لباس جسم ڈھانپنے اور سردی سے حفاظت کے لیے ہوتا ہے اگر آپ اسے اتنا اہم اور عظیم خیال کرنے لگیں کہ اسے سینت سینت کر رکھیں اور اس سے محبت کرنے لگیں اور فائدہ نہ اٹھائیں تو آپ لباس کے بھی غلام بن

گئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِیْصَۃِ: "لباس کا غلام ہلاک ہو گیا۔" اسلام قوت و شوکت کا دین ہے لیکن کسی پر ظلم روا نہیں رکھتا ہے۔ اسلام دنیا اور آخرت دونوں کے لیے ہے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔ البقرہ (۲۰۱) "اے ہمارے رب ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی۔" اسلام کا تقاضا مسلمانوں سے یہ ہے کہ وہ سچے اور پکے مسلمان بن کر شریعت کی پیروی کریں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دُنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ، سب سے زیادہ طاقت ور سب سے زیادہ صاحبِ علم اور سب سے زیادہ مال دار قوم بن کر رہیں تاکہ دنیا اور آخرت کی ہر بھلائی ان کے پاس جمع ہو جائے۔

نیز ہر مسلمان کو یہ بات بھی یاد رہنا چاہیے کہ ان باتوں کے علاوہ مسلمان پر ایک اور فرض بھی عائد ہوتا ہے اور وُہ ہے اغیار میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت حکیمانہ انداز میں تلقین اور احسن طریقے پر دعوت الی اللہ۔ ہم کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کریں گے۔ قرآن میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے: لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ: دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔" بلکہ ہم اغیار کے سامنے اسلام کی خوبیاں پیش کریں گے تاکہ وہ اس کی طرف راغب ہوں۔ لیکن اس دعوت و تبلیغ کے لیے صرف زبانی گفتار کافی نہیں ہے بلکہ ہم پر زبانِ حال سے بھی تبلیغ کرنا ضروری ہے اور وہ صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اسلامی معاشرہ اسلامی قوانین و ضوابط کا عملی نمونہ ہو۔ دراصل ہماری موجودہ حالت و کیفیت تو ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے اسلام کی تصویر ہی مسخ ہو گئی ہے اور اتنی بھیانک نظر آتی ہے کہ لوگ دیکھ کر نفرت کرنے لگتے ہیں اور اس سے دُور بھاگتے ہیں۔ اسلام کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ سلیم العقل ہو تاکہ دلائل دے کر دُوسرں

کو قائل کر سکے، اسلام کا پورا علم ہو تاکہ اسے بہترین انداز میں پیش کر سکے۔ اس کا نئی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہونا ضروری ہے تاکہ لوگوں سے اس زبان میں بات کر سکے جو وہ سمجھتے ہوں۔ نفیس آداب و اخلاق سے آراستہ اور پسندیدہ شخصیت کا مالک ہو۔ تندخو، اکھڑ، خشک مزاج اور اُجڈ نہ ہونا چاہیے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ اسلام کسی مسئلہ پر مناظرہ سے گریزاں نہیں اور نہ بحث و استدلال سے ڈرتا ہے۔ اسلام میں ہر بات کے لیے حجت دلیل اور برہان موجود ہے۔ اسی طرح اسلام ان لوگوں سے بھی جو اسلام کے خلاف کسی بات کا ادعا کرتے ہیں، دلیل و ثبوت کا مطالبہ کرتا ہے: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ''البقرہ" ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔" دوسری جگہ ہے: وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ" = المومنون (۱۱۷)" اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں"۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل ہے تب بھی ان کے لیے توحید کے خلاف اپنا دعویٰ ثابت کرنا محال ہے۔ اے کاش اگر ایسے مبلغین اور دعوت الی اللہ دینے والے لوگ میسر آجائیں تو اس وقت پوری دنیا اسلام قبول کر سکتی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اس دین کو خود اللہ تعالےٰ نے نازل فرمایا ہے اور ساتھ ہی اس نے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمایا ہے: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ الحجر" رہا یہ ذکر تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں"۔ گویا اسلام تو ہر حالت میں باقی رہے گا اور انجام کار فتح اس کیلیے مقدر ہے۔ لیکن اب یا تو ہم مسلمان خود اپنے دینِ اصلی کی طرف رجوع کریں، اس صورت میں اس کامیابی کا سہرا دنیا میں ہمارے سر رہے گا اور آخرت میں بھی وہ ثواب ہمیں ملے گا جس کا وعدہ دینِ اسلام نے ہم سے کیا ہے۔ اور یا پھر اللہ تعالیٰ ہمارے بجائے

کسی دوسری قوم کو یہ توفیق عطا فرمائے گا کہ وہ مُسلمان ہو کر دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے عُہدہ برآ ہوں اور اسلام کا دفاع کریں۔

ہم اس بات سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہمیں راندۂ درگاہ قرار دے کر یہ ذمّہ داری ہماری بجائے کسی دُوسری قوم کے سپُرد فرمائی جائے ہم اس سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے دین کی طرف رجوع ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اسلام کی فتح و کامرانی ہمارے مُقدّر میں ہو۔ ہمارے گناہ معاف فرمائے اور ہم پر رحم فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

○